چاندنی بیگم
قرۃ العین حیدر

چاندنی بیگم

چاندنی بیگم

قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

CHANDNI BEGUM

by

Qurratulain Hyder

1990
Price Rs. 125/-

ISBN 81 - 85360 - 52 - 9

سال اشاعت	۱۹۹۰ء
طبع اول	۱۰۰۰
قیمت	۱۲۵ روپے
مطبع	فوٹو آفسیٹ پرنٹرس، بلیماران دہلی ۶
گرد پوش (آئیل)	قرۃ العین حیدر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
3108۔ گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6

Phone : 526162 , 774965

منازلِ قمر

۱ گلِ سُرخ

ندی کنارے نشیبی زمین کا وہ وسیع قطعہ اب رنگا رنگ پھولوں سے پٹ گیا ہے۔ گلِ عباس۔ گلِ جعفری۔ گلِ ہزارہ۔ گلِ صد برگ۔ گلہائے آفتاب و مہتاب۔ بنجارے یہاں پڑاؤ کرتے ہیں اور جُمّا دھوبی کپڑے سُکھاتا ہے۔ اپنے گدھوں کو پھولوں میں چرنے کیلئے چھوڑ دیتا ہے اور ارہر کی کاشت بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی شکستہ زنگ آلود شے ہل کی نوک سے ٹکرا جاتی ہے وہ اسے اٹھا کر غور سے دیکھتا ہے اور مایوسی کے ساتھ دور پھینک دیتا ہے بھُر بھُری مٹی کے اندر کیچوے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ ساری عمر اپنے کام میں مصروف، خیر کیچوؤں کی کیا عمر اور کیا زندگی مگر وہ اپنے گھر بنانے میں جُتے ہوتے ہیں اور گیلی مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریاں بناتے رہتے ہیں۔ ایک طرف گوالوں اور گھوسیوں نے سبزیاں اُگالی ہیں۔ بہت ہی زرخیز مٹی ہے جس فصل میں جو چاہیئے بو دیجئے۔ اُگا دیجئے۔

بھاری بھر کم، سِلور گرے بال، سیاہ فریم کی عینک، منہ میں ہوانا سگار، کامیاب اور متموّل بیرسٹر کی کلاسِک تصویر۔ شیخ اظہر علی زمین جائیداد کے پیچیدہ مقدمے جیتنے کے لیے مشہور رہے۔ بیٹا ان کا قنبر علی نئی چال کا نوجوان اسٹوڈنٹس یونین میں پرائیویٹ پروپرٹی کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتا۔ باپ کے برعکس نحیف الجثہ، زرد رُو، نازوں کا پلا اکلوتا فرزند زبان میں خفیف سی لکنت جو لوگوں کا کہنا تھا کہ باپ کے رعب داب کی وجہ سے بچپن میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس پر قابو پانے کے لیے ہی اس

نے فنِ تقریر کی مشق کی اور رفتہ رفتہ اسٹوڈنٹ لیڈر بن گیا۔ ماں اسکی بیگم بدر النسا اظہر علی، کر بٹو باجی کہلاتی تھیں، سوشل ریفارمر تھیں۔ زنانہ جلسوں میں حقوقِ نسواں پر اسپیچیں دیتیں۔ ممتاز خواتین کے جو وفد سُرخ چین، یورپ یا مصر وغیرہ بھیجے جاتے ان میں شامل ہوتی تھیں۔

ماں باپ اور بیٹا اپنی اپنی جگہ تینوں مقرر اور زبانداں۔ قاضی کے گھر کے چوہے سیانے بیرسٹر کے پرانے منشی سوختہ نامی شاعر تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بٹو باجی کی پیش خدمت الحمدو کسی ڈومسٹک سائنس کالج میں لیکچرر ہو سکتی ہے کہ وہ کوٹھی کے ملازمین کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے صبح سے شام تک فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتی تھی۔

نوکروں کا عملہ وضع قطع سے اس نوع کا تھا جیسے لکھنؤ کے کمہاروں کے بناتے شاگرد پیشہ کے نفیس و نازک مختصر ترین موڈل آتشدان پر ایک قطار میں رکھے تھے۔ جنکا سیٹ انگریز ایک زمانے میں اپنے ساتھ ولایت لے جاتے تھے۔

شاہی میں یہ علاقہ شہر سے باہر اور بیرسٹر علی کے بزرگوں کی ملکیت تھا۔ انگریزی ہوتے ہی اس ساحل پر کوٹھیاں بننے لگیں۔ بیرسٹر صاحب کے دادا نے اپنی اراضی کا بڑا حصہ فروخت کر کے باقیماندہ زمین پر کوٹھی تعمیر کی۔ آم اور امرود کا باغ لگوایا۔ مع کچی بنگلیہ۔ اصطبل۔ زمیں دوز مُرغی خانہ۔ دھوپ گھڑی۔ طویل شاگرد پیشہ جس میں اب علاء الدین موٹر ڈرائیور، رمضانی خانساماں، عیدو خدمتگار مع اہل و عیال رہتے تھے۔ بٹو بیگم کی پیش خدمت الحمدو بیوہ تھیں، کوارٹر کے سرے پر نتھا دھوبی اور انکے گھر والوں کی عملداری تھی۔ قریب ہی ان کی بھٹی تھی۔ سامنے بھنگ اُگ آتی تھی بھگوان دین مالی اور چھٹکو چوکیدار باغ کے کاٹج میں رہتے تھے۔ ہولی کے روز بوٹی گھونٹتے اور لہک لہک کر گاتے۔ بٹو بیگم بھنگ کی سرسبز کھیتی کا صفایا کرواتیں وہ پھر اُگ آتی۔ بھینسوں

کا باڑہ کچن گارڈن کے نزدیک تھا۔ ہرن اور ایک نیل گائے بھی وہیں پلے ہوتے تھے جو قنبر میاں کے شکاری دوست رگھبیر پرشاد سنگھ نے ان کو لا کر دیتے تھے۔ بیرسٹر صاحب بھی شکاری تھے۔ جنگلوں سے واپسی پر ہرن کے کباب کی دعوت کی جاتی۔ رمضانی جب کباب بناتے الحمد و فلسفیانہ انداز میں کہتیں اس بے زبان جناور کے نصیب اسادھو اس کی کھال پر بیٹھیں۔ شاعر اس کی آنکھوں پر کبت بناویں —— دُکھیا جل کر کباب۔

بعضوں کے نصیب ایسے تھے کہ ان کو ہر چیز میسر تھی کپڑے دُھلوانے کیلئے ندی۔ اپنے باغ کے پھل اور سبزیاں خدمت کے لیے خانہ زاد ملازم۔ گو اب کچھ چیزیں سرکتی جا رہی تھیں، مثلاً اردو رسم الخط۔ ترقی پسند تحریک اور خاندانوں کی سالمیت۔ خاندان اب ایسے ہو گئے تھے گویا ناک میں مُرغی کا پَر۔ آدھا اِدھر آدھا اُدھر۔

لبِ دریا کوٹھی کی چہل پہل میں اربابِ چمن شامل تھے۔ طوطے مینائیں۔ کوئلیں۔ لال سرے۔ بیرسٹر اظہر علی نامور قانون داں۔ بٹّو باجی مقبول سماجی کارکن۔ قنبر علی طلباء کے نیتا۔ صبح سے شام تک بھانت بھانت کی خلقت کا تانتا بندھا رہتا۔ پہلے تعلقہ داران گرامی اپنے لامتناہی مقدموں کے سلسلے میں طویل موٹروں سے برساتی میں اترتے تھے ہندراجاؤں کے فربہ متبنّیٰ بیٹے جو عموماً "بے بی" کہلاتے تھے۔ بگھیوں پر سوار ریشمی کُرتے اور جھاگ ایسی جھک سفید دھوتیوں میں ملبوس ہیرے چمچماتے وارد ہوتے۔

اچانک سین بدلا۔ تعلقہ داران و بیگمات مع کاروں، پالکیوں اور بگھیوں کے غائب۔ بہت جلد تانگے اور یکے بھی معدوم ہو گئے۔ سائیکلوں اور رکشاؤں کا سیلاب اُمنڈ آیا۔ ان پر سوار ایسے موکّل بستے تھامے برساتی میں داخل ہوتے جن کی املاک کسی ایک عزیز کی پاکستان روانگی کے سبب متروکہ قرار دیدی گئی تھیں۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو قبل ازیں موٹروں پر آیا کرتے تھے۔

جو بیدخل کسان متروکہ قرار دیے جانے والے کھیتوں کے سلسلے میں فریاد لیکر آتے اظہر علی بلامعاوضہ ان کی قانونی امداد کرتے وہ بیچارے اکثر بطور نذرانہ انکے لیے ڈلیا میں تازہ سبزی یا گُڑ کی بھیلیاں لے آتے اور انتظار میں صبر سے آم کے درختوں کے نیچے بیٹھے رہتے۔ نماز کا وقت آتا باغ کے گوشے میں استادہ مختصر سی نیم شکستہ مسجد میں جا کر نماز پڑھ آتے اور پھر انتظار میں مصروف ہو جاتے۔

باغ کے دوسرے گوشے میں ندی کے رُخ پیپل کا بوڑھا درخت تھا۔ اس کی جڑ میں کسی زمانے میں کسی نے ندی سے نکال کر ایک سیاہ گول پتھر نصب کر دیا تھا۔ گرداگرد لکھوری اینٹوں کا چبوترہ —— منشی بھوانی شنکر، بھگوان دین اور پھٹکو وہاں پُوجا پاٹ کرتے۔

بیدخل کسانوں کے علاوہ کوٹھی پر نان و نفقہ کی محتاج مطلقہ برقعہ والیوں کا ہجوم بڑھا۔ دو رویہ لالہ کے پودوں کے درمیان سے گذرتی خاموش سیاہ پوش عورتیں۔ ادب نواز قنبر علی کو وہ لورکا کی کسی ہیبتناک اسپینش ٹریجڈی کے کردار معلوم ہوتیں۔ اکثر منشی سوختہ ان کو بیگم صاحبہ کے پاس اندر پہنچا دیتے وہ ان کے مسائل حل کرنے کی سعی کرتیں۔ ان بے سہارا عورتوں میں سے چند کی لڑکیوں نے اہل ہنود سے شادیاں کر لی تھیں۔ بٹّو بیگم کے کمرے میں الحمد و استنبولی قالین پر بیٹھ کر حُسن دان سامنے رکھے سب کے لیے پان لگاتیں اور اظہار خیال کرتی جاتیں۔ "بیگم صاحب برے کیا کرو —— لڑکے گُولر کا پھول ہوئے جا رہے ہیں سب چلے گئے۔"

نقرئی تھالی میں پان رکھ کر بیگم صاحب کو پیش کرتیں وہ برقعہ والیوں کو دیتیں جو انگلیوں میں گلوریاں تھام جُھک کر تسلیم عرض کرتیں۔ اور ان میں سے کوئی ایک کہتی:
"اللہ بٹّو باجی ہماری چار لڑکیاں گھر میں بیٹھی ہیں کوئی رشتے بتلایئے۔"
وہ سوچتیں اللہ رکھے ہمارا ایک ہی لڑکا ہے یہ دُکھیاری لڑکیاں بے شمار۔ ان میں سے کسی ایک کو بیاہ لادیں تو کتنا ثواب کمائیں۔

قنبر علی اپنے والد کے ان موکلوں کی پریشان صورتوں کا مشاہدہ کرتے کرتے ہی اپنے سیاسی خیالات میں زیادہ کٹر ہوتے گئے۔ انگریز سے آزادی۔ بورژوا جمہوریت سب بلواس۔ اب ان کے میاں جان یہ توقع کس طرح کر سکتے تھے کہ وہ راجہ انوار حسین آف تین کٹوری کی سب سے چھوٹی بیٹی صفیہ سلطانہ سے شادی کرینگے جنکی ان سے بچپن سے مانگ تھی۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔

راجہ صاحب کے ایک پرکھے نے کیتھ کے جنگل میں کسی پا پیادہ تشنہ کام گدڑی پوش کو تین کٹوری ستو پلایا تھا۔ کہتے ہیں وہ درویش ایک پوشیدہ ولی تھے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند روز بعد ہی ان کے پرکھے کو بادشاہ وقت نے جاگیر عطا کی جو ریاست تین کٹوری کہلائی۔ راجہ انوار حسین کے بدخواہ ان کی تین صاحبزادیوں کو تین کٹوریوں کے نام سے یاد کرتے۔ بڑی زرینہ سلطانہ عرف جبینی کی شوہر سے ٹھنی رہی۔ وہ کراچی چلے گئے۔ جبینی مع اپنے بچوں شہلا، آمنہ اور پرویز میکے میں رہتی تھیں۔ منجھلی پروین عرف بینی کا بی اے کرتے ہی ٹیلی فون پر عقد ہوا۔ وہ بھی کراچی سدھاریں۔ چھوٹی صفیہ نہایت خوش شکل تھیں۔ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ لیکن نوعمری میں پولیو نے ان کا بایاں ہاتھ بیکار کر دیا تھا۔

سفید رنگ کا تین کٹوری ہاؤس اور بیرسٹر اظہر علی کی پیلی کوٹھی تقریباً آمنے سامنے واقع تھیں۔ بیچ میں روپہلی ندی۔ صفیہ کی سہیلیاں کبھی گنگناتیں دھیرے بہو ندیا دھیرے بہو ہم اُتر با پار۔ تو پہلے وہ مسکرا دیتی تھیں اب چڑنے لگیں۔ پروین باجی کراچی سے آتیں تو شاکی رہتیں۔ وہاں ہم سے لوگ طنزاً کہتے ہیں تمہارے ہاں کی تو سب مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادی کر رہی ہیں۔ اپنی چھوٹی بہن کی خیر مناؤ۔ ہم بہت سمجھاتے ہیں کہ آٹھ کروڑ کی آبادی میں گنتی کی چند لڑکیوں نے ایسا کیا تو اس کا کلیہ نہ بنائیے۔ آٹھ کروڑ میں آدھی اگر عورتیں ہیں اور ان میں سے نصف بن بیاہی تو ان کے خیال میں دو کروڑ لڑکیوں نے ——— مگر اصل اعداد و شمار کون دیکھتا ہے۔

رانی صولت زمانی یہ سب سن کر دہلا کرتیں۔ صفیہ چیں بجبیں بیٹھی رہتیں۔ بڑی بجیا زرینہ سلسلہ گفتگو آگے بڑھاتیں "اور ہمارے کے ہاں تو بیسٹ فیملیز کے عمدہ ترین لڑکے جو یہیں موجود ہیں۔ انڈیا میں ایک سے ایک اچھے عہدوں پر۔ وہ اُدبدا کر ہندو لڑکیوں سے شادیاں کر رہے ہیں۔ کالج دفتر کلب ہر جگہ تو وہی ان کو ملتی ہیں۔"

"اپنی لڑکیوں کو دم پخت رکھیے گا تو یہی ہوگا۔ انہی کو بچاری فینی کو آپ لوگوں نے قلعہ بند کر رکھا ہے۔" پروین عرف بینی جواب دیتیں وہ کراچی میں رہ کر بہت موڈرن ہوگئی تھیں وہاں جم خانہ کلب میں جاکر بال روم ڈانس بھی کرتی تھیں۔

تنگ آکر صفیہ سلطانہ عرف فینی نے تین کٹوری ہاؤس کی دوسری منزل پر "سینٹ جانز کانونٹ" کا بورڈ لگایا اور اسکول کھول لیا۔

بیگم بدرالنساء اظہر علی کو نئے ہندوستان میں جہالت اور بیوقوفی اور احمقانہ مغرب پرستی کے اس سیلاب نے ازحد دلگیر کر رکھا تھا۔ ایک شام رانی صاحبہ سے ملنے آئیں تو برساتی پر اسکول کا بورڈ لگا دیکھا اندر گئیں۔ صفیہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ "غضب خدا کا بٹیا تم تو خود سینٹ ایگنیز کی تعلیم یافتہ ہو۔ اتنی جاہل ہوگئیں۔ کیا تم کیتھولک نن بن گئی ہو اور یہ خانقاہ قائم کی ہے۔ پوپ آف روم سے اجازت لیکر؟ آخر یہ تم سب کو ہوا کیا ہے۔ دھڑا دھڑ یہ بوگس کانونٹ کھل رہے ہیں۔"

صفیہ نے چڑ کر جواب دیا۔ "پھوپھی انگلش میڈیم اسکول اگر کانونٹ نہ کہلا دیں تو لوگ اپنے بچے نہیں بھیجتے۔ اب تو یہاں درگا داس کانونٹ اور ابراہیم لنکن کانونٹ بھی کھل گئے ہیں۔ اور پھوپھی میں ابھی پروین باجی کے پاس کراچی گئی تھی وہاں بھی گلی گلی کانونٹ نظر آئے۔ وہ تو اسلامی ملک ہے۔ خود پروین باجی کی چچیری نند نے اسکول کھولا ہے اس کا نام رکھا ہے پاک کانونٹ۔"

بٹو باجی سر تھامے بیٹھی رہیں۔ ”محکمہ تعلیم بھی اس کوڑ مغزی اور دھاندلی پر معترض نہیں۔“

صفیہ نے جواب نہیں دیا۔ بے وقت کی راگنی چھیڑنا بٹو بجیا کی پرانی عادت تھی۔ ہمیشہ کسی نہ کسی اصلاح کے درپے۔ یہ نہیں کہ اپنے ہیرو بیٹے کو کچھ نصیحت کریں۔

یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد ندیا کے پار بسنے والے سیّاں جی بیری ہوگئے۔ نظام کہنہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس غرض سے ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا۔ باپ نے لاڈلے بیٹے کو ایک بے ضرر سے مشغلے میں لگائے رکھنے کے لیے رسالے کے لیے وافر اکاؤنٹ کھول دیا۔ وہ پنڈت جواہرلال نہرو کا گولڈن ایرا تھا۔ پرچے کا نام بھی اسی مناسبت سے ”ریڈ روز“ رکھا۔ میگزین نکلتے ہی ہٹ ہوگیا۔

تین کٹوری ضبط ہو چکی تھی مگر راجہ صاحب ایک چھوٹے سے پہاڑی ہوٹل اور کیتھ کے ایک جنگل کے ہنوز مالک تھے۔ فرزند ارجمند ابرار میاں عرف بوبی کی نسبت ایک کلکٹر صاحب کی دختر سے طے ہوگئی تھی۔ جو چاہتے تھے کہ ریٹائر ہو کر علیگڑھ میں سیٹل ہونے سے قبل اپنے فرض سے سبکدوش ہوں۔ دونوں جانب تیاریاں شروع ہوئیں بٹو باجی سماج سدھار کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ ربع صدی قبل یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا تھا اس وقت ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔ لیکن نہایت مخلص قوم پرست خواتین کا ایک گروہ ان کے ساتھ تھا۔ وہ سب انواع و اقسام کی اصلاحات میں جُتی رہی تھیں۔ وہ عہد بھی یکلخت معدوم ہوگیا۔ وہ نیک بیبیاں زیادہ تر عمر طبعی کو پہنچ کر جنت نشین اور سورگباشی ہوئیں۔ انکی اولاد آدرش کے بجائے مصلحت اور مصالحت پر عمل پیرا ہوئی۔

سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے

بٹو باجی کے شوہر اور فرزند دونوں ان کی طرح اب تک آدرش وادی تھے۔

ایک روز وہ تین کٹوری ہاؤس سے واپس آئیں تو بہت زیادہ ملول تھیں شام کو ڈنر ٹیبل پر شوہر اور بیٹے سے کہا — وہ بات کرتی تھیں تب بھی لگتا تھا کہ تقریر کر رہی ہیں — ”ہماری کمیونٹی کے موجودہ حالات یونہی دگرگوں ہیں اوپر سے کاہلی بزاری پست ہمتی نے لٹیا ڈبو دی۔ اور جو پیسے والے ہیں ان کے ہاں وہی اللّے تللّے — ایک تو صفیہ سلطانہ کا کانونٹ اسکول دیکھ کر جان جلی۔ بوبی میاں کے بیاہ کی تیاریوں میں جو روپیہ وہ لوگ بہا رہے ہیں اس سے تو نادار عورتوں کے لیے ایک انڈسٹریل ہوم کھول سکتے تھے۔“

قنبر علی نے جواب دیا: ”امی جان ان زوال پرستوں سے بحث فضول ہے۔“

قنبر میاں اپنی گفتگو میں جو نئی اصطلاحات استعمال کرتے تھے وہ بٹو باجی نے بھی سیکھ لی تھیں۔ پیداواری رشتے۔ زوال پرستی، رجعت پسندی۔ محنت کش عوام کا استحصال۔ ”اقدار کی شکست و ریخت“ ابھی رائج نہیں ہوا تھا نہ ”صنعتی تمدن میں انسان کی تنہائی اور بے چہرگی۔“

منشی بھوانی شنکر سوختہ پرانی چال کے آدمی تھے دوسری صبح سویرے احاطہ میں استادہ اپنے پیپل والے مندر سے لوٹ کر اندر گئے اور شبھ گھڑی جان کے بیگم صاحب سے بات شروع کی۔ ”سرکار راجہ صاحب کے منیجر کالی چرن ہمیں کل امین آباد میں ملے تھے۔“

”اچھا کالی چرن نینی تال نہیں گئے۔ ہمارا خیال تھا راجہ صاحب نے انہیں اپنے ہوٹل پر بھیج دیا ہے۔“

”وہی تو کہہ رہے تھے۔ بوبی میاں کے بیاہ کے ساتھ ساتھ اگر صفیہ بٹیا کے لیے بھی طے ہو جاتے تو وہ ہی نینی تال لوٹ کر ہوٹل کے کمرے ومرے انکے لیے ٹھیک کروادیں۔“

”بھوانی شنکر بھیا رئیس زادوں سے بدکنے لگے ہیں۔ اچھا ذرا انہیں بلانا تو سہی۔“

”سرکار۔ بھیا شربتی دیبی کے ساتھ پریس گئے ہیں۔“

بڑو بیگم کے کان میں گھنٹی بجی شربری۔ کرونا۔ سریتا۔ شوبھا —

"یہ بھی تو نئی ہوا چلی ہے بھوانی شنکر۔"

"ہوا سی ہوا۔ جھکڑ چل رہا ہے بیگم صاحب۔"

ہم پلہ والدین کی بیٹیاں۔ جرنلسٹ۔ آرٹسٹ۔ کلاسیکل ڈانسر۔ انٹرکمیونل شادیاں اگر بہت اونچے طبقے میں ہو رہی تھیں فریقین کے ہم رتبہ ماں باپ عموماً خاموش رہتے تھے بچوں کے نام مبہم قسم کے کبیر، راہل، سمیر، مونا، سیما یا روسی نینا، میرا، زویا، نتاشا رکھے جاتے۔ عید دیوالی بطور تہذیبی تقریبات ان کے گھروں پر منائی جاتیں۔

قنبر علی لنچ کے لیے گھر آتے خود ہی شربری کا ذکر چھیڑا

"آج شربری بہت ہی جھنجھلائی ہوئی تھیں۔"

"کیا ہوا؟" بیرسٹر علی نے پوچھا۔

"میاں جان۔ وہ انگلش ڈپارٹمنٹ میں موڈرن لٹریچر ایم اے کلاس کو پڑھاتی ہیں۔ ان کی دو شاگردوں کی ہوگئی شادی۔ وہ مانگ میں خوب سیندور رچا کے آنے لگیں۔ شربری ان دنوں سارتر پڑھا رہی ہیں۔ ان سے کہا جب تم لوگ مانگ میں اتنا سیندور بھرو گی سارتر تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔"

بیرسٹر صاحب مسکرائے۔ "سیندور کا سارتر سے کیا تعلق ہے؟"

"میاں جان۔ سیندور ہندو عورتوں کی غلامی کی نشانی ہے۔ دقیانوسیت کا سمبل۔ ہمارے کے ہاں کانچ کی چوڑیاں۔ حیدرآباد میں کالی پوتھ۔ ساؤتھ میں منگل سوتر۔"

"بیٹیا سہاگنوں کے لیے تو ان چیزوں کی بڑی اہمیت ہے۔" بڑو بیگم نے کہا۔

"مرد کیوں نہیں کچھ پہنتے۔ شادی کے بعد ناک میں سیفٹی پن ہی لٹکا لیا کریں۔ شربری نے ان لڑکیوں سے کہا سیندور پونچھ ڈالو ورنہ میں سارتر نہیں پڑھاؤں گی۔"

"ہے ہے۔ ہندو سہاگن سیندور پونچھ ڈالے! یہ تمہاری شربری تو دیوانی معلوم ہوتی ہے اور خود برہمن بنگالن۔"

"امی جان عورتیں بیوہ ہو جائیں تو چوڑیاں توڑ ڈالیں، سفید کپڑے پہنیں۔ سارے سمبل ان ہی کے لیے ہیں۔"

بیرسٹر صاحب شفقت سے متبسم رہے۔

"اپنی اپنی تہذیبی روایات کا احترام کرنا چاہیے اگر وہ نقصان دہ نہ ہوں" انہوں نے کہا۔

"سیندور نقصان دہ نہیں ہے؟ اسے لگا کر ایک عورت موڈرن مائینڈ کی مالک کیسے ہو سکتی ہے؟"

شیخ صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ کھانا ختم کرکے کورٹ چلے گئے۔ بڑو بیگم نے بیٹے سے دریافت کیا۔ "یہ شربری کا چکر ہے کیا؟"

وہ جب نروس ہوتے تھے ذرا سا ہکلانے لگتے تھے "یہ — ہماری — کا — کامریڈ ہے۔"

"شادی وادی کا کچھ ارادہ ہے؟"

"قطعی نہیں۔ جھکی ہے۔"

"کوئی صحیح الدماغ لڑکی تلاش کریں؟ جو سرخ کانچ کی چوڑیاں پہننے پر اعتراض نہ کرے؟"

"ضرور — مگر دو شرطیں ہیں۔ نمبر ایک۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ — نمبر دو۔ غریب گھرانا — نمبر تین۔ خوبصورت۔"

"شادی کے روز مانگ میں افشاں چُننے کی اجازت ہے؟"

"او۔ کے۔ مگر نکاح کے وقت ناک میں نتھ ہرگز نہ پہنے گا تے بھینسوں کی طرح۔ عورتوں کی غلامی کا سمبل۔"

"ماں بیٹے مل کر گھر کو سابرمتی آشرم بنائے دے رہے ہیں۔ اب ہم انوار حسین کو کیا جواب دیں۔ بھوانی شنکر کو ہی ترکیب بتلاؤ۔" بیرسٹر علی نے منشی سوختہ سے کہا ——
"اب سُنیئے کہ بیگم صاحبہ آج ظفر پور تشریف لیے جا رہی ہیں کسی غریب لڑکی کی تلاش میں۔"
"یہاں کچھ کمی ہے۔"
"فرماتی ہیں چیریٹی گھر سے شروع کرنی چاہیے۔"

علیمہ بانو بٹو باجی کی بچپن کی سہیلی تھیں۔ بڑی ہی آفت زدہ۔ ان کی بھی وہی کہانی —— شوہر پاکستان فرار ہوتے وہاں سے طلاق لکھ بھیجی۔ علیمہ بانو نے میٹرک شادی سے پہلے کیا تھا اب بی اے بی ٹی۔ اسکول میں نوکری کر کے بیٹی کو ایم اے بی ایڈ کروایا۔ دونوں ماں بیٹیاں قصبہ ظفر پور میں اپنے آبائی کھنڈر کے سالم دو کمروں میں رہتی تھیں اور ایک پرائیوٹ کالج میں پڑھا رہی تھیں۔ کالج کی مالک اور پرنسپل ڈیڑھ ڈیڑھ سو ماہانہ کی رسیدیں ان سے لیتیں اور اسّی اسّی روپے دونوں کو تھما دیتیں۔

ظفر پور بٹو بیگم کا میکہ تھا۔ حسب معمول اپنے چھوٹے بھائیوں کے گھر اتریں۔ علیمہ بانو سے ملنے گئیں ان سے کچھ گول مول بات کی۔ علیمہ بانو کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ بٹو باجی نے ان کی لڑکی کو اس کے بچپن کے بعد اب دیکھا۔ بہت پیاری شکل کی بچی تھی۔ بس ایک نقص ضرور تھا۔ موٹے شیشوں کی عینک نے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ خیر دھبے تو چاند پر بھی ہیں۔ قنبر علی بھی تو کوئی آئیل پینٹنگ نہیں تھے۔

"بہن کیا کروں مسلسل تنگدستی۔ بجلی کٹ گئی لالٹین کی روشنی میں پڑھائی کر کے اس نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔"

بٹو خاموش رہیں۔ بچی ہر لحاظ سے اچھی تھی۔ قنبر کی تینوں شرائط پر پوری اترتی تھی۔ علاوہ ازیں غریب گھر کی لڑکی۔ دب کے رہے گی۔ تصویر جس میں وہ ایم۔ اے کا گاؤن پہنے ڈگری کا رول ہاتھ میں لیے کھڑی تھی، لکھنؤ واپس آ کر قنبر میاں کو دکھائی۔ تصویر میں اس نے عینک اتار دی تھی۔ قنبر میاں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ "بس ایسی لڑکی تو ہم چاہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی۔"

"ایسا ویسا محنت کش۔ ایک تعلیمی شارک کالج پرنسپل کے روپ میں ان ماں بیٹیوں کا اور ان کی ایسی بہت سی ٹیچروں کا اقتصادی استحصال کر رہی ہے۔" بٹو بیگم نے پھر ایک دم تقریر شروع کر دی۔ "تم اگلے شمارے میں پرائیوٹ اداروں کے اس بلیک پر ایک پرزور نوٹ بھی لکھو۔"

"یقیناً امی جنیاں اور ہم پہلی فرصت میں آپ کے ساتھ ظفر پور بھی چلیں گے۔ اس بہادر باہمت سپاہی لڑکی سے ملیں گے اور اگر پسند آئی اور کیا وجہ کہ پسند نہ آئے تو اس سے شہ —— شادی بھی کریں گے۔"

بیرسٹر اظہر علی کمرے میں آ چکے تھے —— قنبر علی کے باہر جانے کے بعد انہوں نے بیوی سے پوچھا "یہ تم لوگ کیا اڑنگ بڑنگ گفتگو کر رہے تھے۔"

"آپ دیکھتے جائیے۔ فی الحال شر برمی دیبی کی طرف سے دھیان ہٹانے کو خیال اچھا ہے۔"

قنبر میاں سالنامہ ریڈرز کی تیاریوں میں بے طرح مصروف تھے۔ ظفر پور والی لڑکی کے اس تذکرے کو فراموش کیا۔ ان کی والدہ اپنے بیرونی سفر کے بندوبست میں منہمک ہوئیں۔ خواتین کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے جنیوا گئیں۔ ماسکو اور تاشقند ہوتی ہوئی لوٹیں تو شوہر کو مفلوج پایا۔

بیرسٹر اطہر علی چھ مہینے کی علالت کے بعد خدا کو پیارے ہوئے۔

بٹو باجی چنے ہوئے ابرق کے رنگین دوپٹے، نفیس ریشمیں غرارے، کانوں میں چنبیلی کے پھول کلائیوں میں سرخ یا سبز کانچ کی چوڑیاں خوش رنگ۔ قیمتی ساڑیاں پہنے اپنی خوش لباسی کے لیے مشہور تھیں۔ اب سفید کھادی سلک کی ساری یا سفید غرارے کے جوڑے میں ملبوس بجھ کر رہ گئیں۔ رانی صولت زمانی، دوسری سہیلیوں اور سب سے زیادہ الحمرہ کے اصرار پر کہ اللہ رکھے جوان بیٹے کی ماں ہیں۔ خدا اس کی ہزاری عمر کرے، انھوں نے کانچ کی چوڑیاں البتہ نہیں توڑیں۔
عدت گزار کر اپنا غم غلط کرنے کے لیے زیادہ تندہی سے فلاحی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئیں۔ حقوق نسواں پر منعقد ہونے والے ایک سیمینار کی صدارت کرنے دلی گئیں۔ واپسی پر ظفر پور اتریں۔ قصبے کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آکر تانگہ کیا۔ بھائیوں کے مکان پر پہونچیں۔ صدر دروازے پر موٹا تالا پڑا تھا دھک سے رہ گئیں۔ ایک جولاہا پیٹھ پر گٹھر لادے آواز لگاتا گلی میں سے گزرا۔ ان کو دیکھ کر چپ رہا سلام کر کے آگے نکل گیا۔ بٹو بیگم کا سر چکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تانگے کا ڈنڈا پکڑا۔ کوچوان کو دوسرے محلے کا پتہ بتایا جہاں ایک دور کے رشتے دار رہتے تھے۔

بنے چچا برساتی میں مونڈھا بچھائے روزنامہ قومی آواز پڑھ رہے تھے۔ بٹو کے سلام کا جواب دے کر اس جولاہے کی طرح وہ بھی خاموش رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "کیا بتلائیں بٹو بی ہم نے بہت منع کیا مگر مانے ہی نہیں کہنے لگے فوجیں آمنے سامنے ٹھنی کھڑی ہیں۔ اس سے پہلے کہ راستے بند ہو جائیں — ہم نے بہت سمجھایا میاں یہاں جمے جمائے بیٹھے ہو مگر ان پر دھن سوار تھی۔ بڑے تو بیٹی کی چاہت میں گئے۔ بیاہ کر اتنی دور کو سندھ بھیجدی۔ جب سے اٹھتے

بیٹھتے ماں باپ اسے یاد کر بین تھے۔ اوپر سے اس کی بیماری کا تار آیا۔ بس ایک دم چل پڑے۔ چھوٹوں نے کہا چلیے ہم بھی آپ کے ساتھ ہی چلے چلیں۔"
"مجھے اطلاع تو کر دیتے۔ ایسے تو ان سفید ہوتے۔"
"نہیں بٹو —"
"ان کے تیجے چالیسویں میں سب آتے تھے تب بھی ذکر نہ کیا۔"
"نہیں بٹو — ذکر اس لیے نہیں کیا کہ تم روکتیں اصرار کرتیں کہ نہ جاؤ۔ وہ تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتے تھے۔"
"اب تو بڑا دل توڑ کر گئے ہیں۔" بٹو بیگم نے سسکی بھری۔
بنے چچا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا "چلو اپنی چچی کے پاس چل کر آرام کرو۔"

بنی چچی برو ٹھے میں بیٹھی کھیتوں سے آیا ہوا غلہ تلوا رہی تھیں۔ سلام کا جواب دے کر وہ بھی خاموش رہیں۔ بٹو ان کے نزدیک پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔
"پچھلی بار یورپ جاتے ہوئے رکی تھی۔ منجھلے کا کچھ سامان بندھا دیکھا ان کی دلہن فوراً بولیں نینی تال کی تیاری ہے۔ میں نے یہ نہ سوچا کہ یہ پہاڑ کا کون سیزن ہے۔ اس کا مطلب ہے انتظامات جبھی سے شروع کر دیے تھے۔"
گولو نے چائے کی ٹرے لا کر فرش پر رکھ دی۔ وہاں مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔
"توبہ ہے یہ گنے کا سیزن کم بخت آیا اور سارے ظفر پور پر مٹ گئی مکھیوں نے بلا بولا۔ چلو اندر چلو۔" بنی چچی نے کہا۔ یہ روہیلہ کنبہ پچھوا اردو بولتا تھا۔

بڑے کمرے میں چھوٹی بہو کے جہیز میں لایا ہوا سن مائیکا کا فرنیچر چمچما رہا تھا۔ گوڈریج کی الماری کے اوپر نئے کمخواب کے جزدانوں میں لپٹے قرآن شریف رکھے تھے دیواروں پر نئے پرانے کیلنڈر۔ اون کے گولے سے کھیلتی ولایتی بلی کی تصویر اللہ رسول کے طغرے۔ کارچوبی جھالر والے آتشدان کے اوپر شیشے کے کیس میں جاپانی

گڑیاں۔ جما جمایا گھر۔ بتّو بیگم نے مسہری پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ کروشیا کے میز پوش سے ڈھکے ریڈیو سیٹ کا بٹن دبا کر بنّے چچی کی لڑکی نے دہلی لگایا —— خبریں آرہی تھیں۔ اچانک بتّو باجی کا نام سنائی دیا "گوشٹی کا اودگھاٹن کرتے ہوئے —— بیگم اظہر علی نے کہا ——"

"ارے بتّو کا نام آرہا ہے۔ ارے عائشہ جلدی سے ان کو بلا کر لا —— خبروں میں بتّو کا نام آرہا ہے ——" بنّے چچی چلائیں۔

بنّے چچا دوڑے دوڑے آئے اس وقت سیمینار کے متعلق خبر ختم ہوچکی تھی۔

"اوہو ہم نہ سن سکے" انہوں نے سر ہلا کر کہا "ویسے ہم تمہاری ساری تقریریں ریڈیو پر سنا کرتے ہیں۔"

"بیٹھیے بنّے چچا" بتّو نے اکتاہٹ سے کہا۔ یہ دونوں بے چارے انکی دلجوئی کی پوری کوشش کررہے تھے۔

باہر دیوار کے نیچے میدان میں کچھ بچے ٹیسو لیے جارہے تھے —— ٹیسو اکر کرے ٹیسو مکر کرے۔ دلّی پر ہے کالا کوٹ۔ مار سکندر کاری چوٹ ——

بنّے چچا نے سر ہلایا۔

"بے سوچے سمجھے اب تک ایسے گیت گارہے ہیں۔ انہی عوام نے تو اسکندر کی قوم کو ویلکم کیا تھا —— حالات کا بہاؤ اتنا تیز ہے۔ کتنے کام دنیا میں بے سوچے سمجھے ہوتے ہیں" انہوں نے ایک آہ بھری —— "اور اگر سوچ سمجھ کے بھی کرو تو کیا فرق پڑے ہے۔"

بتّو بیگم تکیے کے سہارے نیم دراز ہوگئیں ہاتھ سے مکھیاں ہٹائیں "سارے قصبے میں شیرے کی مہک پھیل گئی ہے۔ تم کو اس مہک کی عادت نہیں رہی" بنّے چچا نے معذرت خواہ انداز میں کہا "اس سال میرے ہاں بھی گنّے کی فصل خوب ہوئی۔ اللہ کے فضل و کرم سے دوسری کھنڈسار نے بھی کام شروع کردیا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

اسی طرح ان کے تینوں بھائی ان کو اپنی فارمنگ کے متعلق بتلایا کرتے تھے۔ پھر دل میں ہُوک سی اٹھی۔ جتنے وہاں پہنچ کر کیا کریں گے پردیس میں۔

بتّو بیگم کو ان کے پیاروں کی اس بے مروتی اور بے وفائی سے شدید ذہنی دھکا لگا تھا۔ شوہر کی موت کا غم ہرا تھا ان سب کی روانگی بھی دائمی جدائی کے برابر ہی تھی ایک بار گئے تو گئے جب کبھی آئیں گے تو اجنبیوں کی طرح۔ اُکھڑی اُکھڑی طنزیہ باتیں کرتے۔ ایسے مناظر وہ دوسروں کے گھروں میں بہت دیکھ چکی تھیں۔

شام کو انہوں نے پرچہ بھیج کر اپنی سہیلی علیمہ بانو کو بلوا بھیجا۔ اندھیرا پڑے وہ آئیں۔

"بٹیا کو ساتھ نہیں لائیں" بتّو بیگم نے پوچھا۔ علیمہ خاموش رہیں۔ جب لڑکی کے لیے بیٹے کا پیغام دے چکی ہیں تو اب ساتھ لانا کیا معنی۔ اب ہم نادار ہیں تو کیا بے غیرت بھی ہوگئے کہ لڑکی ہونے والی ساس کو سلام کرنے حاضر ہوجاتے۔ یا یہ ولایت کے چکر لگا کر خود بھی انگریز ہوگئی ہیں۔

بتّو نے کہا "علیمہ۔ وہ سب بھاگ گئے تم کو بھی اطلاع نہ دی۔"

علیمہ بولیں "وہ مجھ سے کون سے تعلقات استوار رکھتے تھے معاف کرنا بتّو تمہاری بھاوجیں بھتیجیاں تم سے بہت مختلف تھیں۔ ہم مفلسوں سے انکا کیا میل۔"

بتّو نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر چہرے سے مکھیاں اڑاتی رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں "علیمہ میرے میاں اللہ کے گھر گئے۔ میکے والے پردیس سدھارے۔ اب تم میری منہ بولی بہن ہی یہاں رہ گئی ہو۔ چلو خیر۔ اب ہم تم ہی مل بانٹ کر زندگی گذار لیں گے۔"

علیمہ نے سر ہلایا۔ دل میں امید کی شمع روشن ہوئی۔ اب تو یقیناً یہ بہت جلد میری بچی کو بہو بنا کر لکھنؤ لے جاویں گی۔

بتّو کچھ نہ کہہ پائیں یکبارگی پھر رونے کا دورہ پڑا ہچکی بندھ گئی۔

بنّے چچی باورچی خانے سے بھاگی آئیں۔ بنّے چچا باہر سے آکر دروازے میں

ٹھٹھک گئے۔ ایک ہاتھ اوپر کی چوکھٹ پر رکھا۔ نرمی سے بولے "رونے دو جی ہلکا ہو گا۔"

علیمہ نے دوپٹے کی اوٹ سے پردہ کیا وہ فوراً واپس گئے۔ بتّو پر نیند کا غلبہ طاری ہوا۔ بجلی غائب ہو گئی۔

"توبہ ہے ساری بجلی تو ڈوبی فیکٹریوں میں جا رہی ہے۔" بنّی چچی بڑبڑائیں۔ عائشہ نے لیمپ اور لالٹینیں جلائیں۔ علیمہ نے نیم تاریکی میں اپنے چپل تلاش کئے جو تخت کے نیچے اندر کو سرک گئے تھے۔ برقعہ سر پر ڈالا۔ بنّی چچی سے کہا۔ "میری لڑکی اکیلی بیٹھی ہو گی میں چلوں کل آؤں گی۔"

دوسری صبح بتّو سو کر اٹھیں تو شدید بخار میں مبتلا تھیں۔ ڈاکٹر آیا۔ انہوں نے دوا پینے سے انکار کیا۔ روتے روتے یکبارگی چلّانے لگیں۔ "ہائے مجھے سب چھوڑ گئے۔ میاں بھی چھوڑ گئے۔ بچے بھی۔ میں اکیلی رہ گئی۔ ہائے میں اکیلی ــــ"

"توبہ کرو بتّو ــــ" بنّے چچا نے ڈانٹا۔ "تمہارا بیٹا زندہ سلامت رہے۔ ایسے کیوں چلّا رہی ہو۔ اب بس کرو۔"

"اچھا اب نہیں چلّاؤنگی۔ اُن سب کو میں نے بی بی سیدہؑ کی چادر میں دیا۔" آنسو پونچھے اور چپکی پڑ رہیں کچھ دیر بعد سوتے میں بڑبڑائیں۔ "باپ دادا کی قبریں بھی چھوڑ گئے۔"

چچی ایک پاؤں فرش پر ٹکاتے دوسرا اپنے پلنگ پر رکھے سر جھکائے بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ جواباً بڑبڑائیں۔ "قبریں کون ساتھ لے جا سکے ہے۔"

بتّو بیگم پر سرسامی کیفیت طاری ہو گئی۔ بنّے چچا نے ابنِ شیرے کی فیکٹری جا کر قنبر علی کو ٹرنک کال کیا۔ تار دیے وہ کلکتہ گئے ہوتے تھے۔ منشی سوختہ اپنے گاؤں۔ ادھر دھوپ تیز ہوتے ہوتے بتّو بیگم چل بسیں۔ ڈاکٹر نے کہا دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔

باپ دادا کی ہڑواڑ میں تدفین کا انتظام کیا گیا۔ اندھیرا پڑے جنازہ اٹھائے کلمہ پڑھتے تھوڑے سے سوگواروں کا جلوس ان کے میکے کی سنسان گلی میں سے گزرا۔ گنّے کے چھلکے اور بے رس خشک گنڈیریاں دھول بھرے راستے پر بکھری ہوئی تھیں۔ بنّے چچا گیس کی لالٹین تھامے آگے آگے چل رہے تھے۔

اہل شہر ابھی بیرسٹر اطہر علی کی وفات کا غم نہ بھولے تھے۔ بتّو باجی جیسی دردمند اور ہر دلعزیز خاتون کی اچانک موت سے کہرام مچ گیا۔ وہ سیاہ برقعوں والیاں انکے چالیسویں کے روز آخری بار لالہ کے پھولوں کے درمیان نمودار ہوئیں۔ الحمدو اور زیتون اُجڑی اُجڑی سی سارے انتظامات کرتی پھریں۔ قرآن خوانی اور فاتحہ کے کھانے کے بعد سوگواروں کا ہجوم رخصت ہوا۔ قنبر میاں برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز سگریٹ پھونکا کیے۔ بھوانی شنکر سر جھکائے کنویں کی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ بیگم صاحب دُلہن بن کر اس گھر میں آئی تھیں وہ خود لڑکے سے تھے ان کی بھی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اپنی چھم چھم کرتی دلہن کو گاؤں سے یکّے پر بٹھا کر سلام کروانے لاتے تھے۔ چالیس سال انہوں نے بیرسٹر صاحب کے دفتر میں منشی گیری کی۔ چالیس برس انہی مسلوں اور ڈونگلوں کے معیت میں گذارے۔ قنبر میاں کو گود میں کھلایا۔ کندھے پر بٹھا کر سکندر باغ کی سیر کرائی۔ اسکول پہنچانے گئے۔ ان کے ماں باپ کی طرح ان کی ہر ضد پوری کی۔ ماں نے تو لاڈ پیار میں ان کا کباڑا کر دیا تھا۔ منشی جی نے بھی کسر نہیں چھوڑی تھی اب ماں کے مرنے کے بعد یہ دنیا کا مقابلہ کر پاویں گے؟ میگزین کی اڈیٹری کرنا اور بات ہے۔

نوکر الحمدو کے کنٹرول سے آزاد ہو گئے۔ وہ پچھلے برامدے میں جا کر چلّاتیں۔ "رمضانی یہ تم نے آج کیا ڈھب ڈھب قلیہ پکایا ہے۔ بھیّا نے چکھ کے

چھوڑ دیا: "کبھی عید و بیرے کو ڈانٹتیں۔ ارے او چنبل گھائی ڈوالے۔ گول کمرہ صاف کیا۔ یا بیگار ٹالی ہے۔ کبھی دوڑی دوڑی جا کر بھوانی شنکر سے شکایت کرتیں: "منشی جی بھیا پہلے دوست احباب میں پیتے تھے۔ اب گھرے پہ بیٹھ کر پینے لگے ہیں آپ سے ڈرتے ہیں آپ جب اپنی بُرجی میں جا کر سو جاتے ہیں تب ۔۔۔"

قنبر میاں زیادہ تن من دھن سے "ریڈ روز" میں منہمک ہو گئے۔ رسالے کا دفتر کوٹھی میں منتقل کر لیا ایک برآمدے کے دروں کو پلائی وُوڈ سے بند کر کے اس میں نیوز روم بنایا گیا۔ مؤکلوں کے ویٹنگ روم میں اسسٹنٹ اڈیٹر بیٹھا۔ پندرہ روزہ سے رسالہ ہفتہ وار ہوا۔ اردو ایڈیشن "گل سرخ" اور ہندی "لال گلاب" شائع ہونے لگے۔ اسٹاف کی تعداد میں اضافہ کیا والدین کی وفات کے بعد گھر پہ یکلخت جو سناٹا چھایا تھا وہ ایک بار پھر رونق اور گہما گہمی میں تبدیل ہوا۔ پہلے درختانِ گل پوشاک کے نیچے مؤکل بیٹھے نظر آتے تھے۔ اب صحافی، سیاسی کارکن، اردو ہندی کے ترقی پسند ادیب اور شاعر ۔۔ آئے دن ریڈ روز فورم کے تحت ادبی اور سیاسی مذاکرے اور جلسے منعقد ہونے لگے۔

بیرسٹر اظہر علی کی کوٹھی کا نام ہی ریڈ روز پڑ گیا۔ عوام میں لال کوٹھی۔

---

(۲) صنوبر فلم کمپنی

گلاب رنگ جاڑوں کی ایک صبح قنبر علی اپنے دفتر میں (جو پہلے ان کے میاں جان کا شاندار آفس روم تھا) بیٹھے ریڈ روز کے لیے روس کی نئی خارجہ پالیسی پر اداریہ لکھنے میں مشغول تھے کہ منشی بھوانی شنکر سوختہ نے چق اٹھا کر جھانکا۔

"بھیا۔ یک طائفہ کنجراں آمدہ است۔" اندر آ کر کارڈ پیش کیا۔

ماسٹر آئی۔ بی۔ موگرے
میوزک ڈائریکٹر
امانی بلڈنگ۔ اندھیری۔ بمبئی

آنکھوں میں سُرمہ۔ مانگ پٹی۔ دوپلی ٹوپی۔ نیش عقرب مونچھیں۔ بوٹی دار اچکن۔ چوڑی دار پاجامہ۔ سلیم شاہی جوتے۔ ہاتھ میں پان کی ڈبیہ اور ریلی ڈوری کا بٹوہ۔ ساتھ ایک خاتون۔ دوہرا بدن۔ گوری چٹی۔ آم کی پھانک ایسی آنکھیں۔ مہندی سے رنگے سرخ بال۔ کاسنی نائیلون کی ساری۔ سنہرے سینڈل۔

ایک ٹیڈی گرل گل اندام۔ گل رو، چست قمیص۔ چوڑی دار پاجامہ۔ تراشیدہ بال۔ اداس صورت۔ سانولی رنگت پر سفید پاؤڈر۔

ایک ٹیڈی بوائے۔ ڈلیپ کٹ بال چمکیلی قمیص سیاہ تنگ پتلون، مرصع بیلٹ۔ گلے میں موٹی زنجیر مع لاکٹ جس پر بڑا سا "اللہ" منقش تھا۔ ایک ہاتھ میں کڑا نوکیلے

ایڑی دار بوٹ۔ قنبر ہکّے بکّے رہ گئے۔ لگتا تھا ایک مزاحیہ ڈرامہ شروع ہونے والا ہے۔ پہلے سین میں سارے کردار اسٹیج پر نمودار ہوئے ہیں۔ جب میاں جان زندہ تھے اس نوع کے تھیٹریکل لوگ بھی اپنے مقدمات لے کر ان کے پاس آیا کرتے تھے ـــــ یہ منڈلی دُور دراز کے شہر سے وارد ہوئی تھی۔ اس وجہ سے یہ بیرسٹر صاحب کی رحلت سے اب تک لاعلم رہے۔ ماسٹر موگرے کورنش بجا لائے۔

"آداب عرض ہے۔ معاف کیجیے گا استاد۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔" قنبر علی نے جواب دیا۔

"اللہ غریق رحمت کرے۔ غلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہے حسب ارشاد مسٹر ابرار حسین آف تین کٹوری راج۔"

"گوڈ ڈیم ہم ـــــ" قنبر نے زیرِ لب کہا۔

"برادری میں ایک تقریب تھی۔ اس میں شرکت کی غرض سے بعد مدت مدید اور عرصہ بعید اس بلدۂ شعر و موسیقی میں ناچیز کا گزر ہوا ایک محفل شبانہ میں مسٹر لوبی میاں سے شرف ملاقات حاصل کیا اپنے مشاغل کے اذکار رہے۔ انھوں نے فرمایا ہمارے یار قدیمی شیخ قنبر علی ریڈ روز سے ضرور مل لیجیے وہ تعاون فرما دیں گے۔" اپنی پارٹی کا تعارف کرایا۔

"وائف ـــــ چنبیلی بیگم نازؔ (فلم اسٹار اینڈ پوئیٹس)

"ڈاٹر ـــــ بیلا رانی شوخؔ (ریڈیو سنگر اینڈ پوئیٹس)

"سَن ـــــ پریزادہ گلاب (کامیڈین)۔"

وائف اور سَن نے جُھک جُھک کر تسلیم عرض کی۔ ڈاٹر جلی بُھنی بیٹھی رہی۔ پہلی بار قنبر علی نے نوٹس کیا کہ وہ بے انتہا بیزار اور شرمندہ نظر آ رہی تھی۔

چنبیلی بیگم نازؔ گویا ہوئیں۔ "پہلے ہم بھی ریڈیو پر گاتے تھے لکھنؤ سے پروگرام کر چکے ہیں۔ مُون شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام۔"

قنبر میاں بے اختیار ہنس پڑے۔ یاد آیا ایک زمانے میں اس فرضی کمپنی کی

طرف سے ریڈیو پر اوپیرا نشر کیے جاتے تھے۔ مُون شائن ـــــ پل کی پل میں وہ اپنے بچپن میں واپس پہنچ گئے۔ امّی جیجیاں بڑے شوق سے یہ پروگرام سنا کرتی تھیں اور وہ اکثر ان کے ساتھ پکچرز بھی جاتے تھے۔ قیصر باغ میں الفنسٹن سنیما پر ایک بورڈ لگا رہتا تھا "سنت تلسی داس۔" گُگری سنبھالے لیلا چٹنس۔ بی اے اور اس پر بڑا سا نیلے رنگ کا نمبر ۳۔ یعنی تیسرا ہفتہ۔ اُفوہ کتنی پرانی بات تھی اور بالوں میں پتے اُڑسے کانن بالا اور جمنا اور رام پیاری ـــــ قنبر میاں نے پل کی پل کے لیے آنکھیں بند کیں۔ انگلیوں پر پیشانی ٹکا کر قلم سے کھیلنے لگے۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ ماسٹر موگرے نے ان کو نرم پڑتے دیکھا۔ فوراً بولے ـــــ

"جی ہاں حضور ـــــ مُون شائن تھیٹریکل ـــــ اس کے لیے بُلبُلِ بنگال جہاں آرا کجّن کلکتہ سے بلائی گئی تھیں عشرت سلطانہ بیّو بمبئی سے۔ ملکہ پکھراج جموں سے۔"

"ناچیز نے شیریں فرہاد میں گایا تھا۔ سہیلی کا رول تھا۔" چنبیلی بیگم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

یہ دُکھی لوگ تھے۔ قنبر میاں کا دل پسیجا۔ اسی موضوع پر ان سب سے مزید گفتگو کا ارادہ کیا۔ "اچھا ہاؤ انٹرسٹنگ ہم نے ملکہ پکھراج تو دیکھی تھیں۔ ہم بوا تے اسکاؤٹس کا پروگرام کرنے جاتے تھے۔ وہ اسٹوڈیو سے نکل رہی تھیں ان کے ملازم نے کوئلے کا تھیلہ اٹھا رکھا تھا۔"

"جی ہاں۔ حُقّہ پیتی تھیں۔"

"استاد یہ ہمارے بھوانی چچا ہیں۔ مشہور شاعر تھیٹر نوٹنکی کے رسیا۔"

اچانک قنبر میاں کی نظر چنبیلی بیگم ناز کے بیگ پر پڑی۔ براؤن پلاسٹک کا بیگ ایک طرف سے پھٹ چکا تھا۔ ان سب کو بغور دیکھا۔ سب کے لباس میں کہیں نہ کہیں کوئی نقص تھا یا ٹانکے لگے تھے۔ ماں بیٹی نے نقلی زیور پہن رکھے تھے۔ یہ بہت خستہ حال لوگ تھے۔

"بیّو جب یہاں آئی تھیں سیدھی مہاراجہ پٹیالہ کے ہاں سے۔" منشی سوختہ نے

بھی اسی رَو میں بہتے ہوتے دروازے میں سے اطلاع دی: "ہم سے پوچھیے۔ ہم سب جانتے ہیں۔ یہاں انہیں حاجی مجتبیٰ خان نے ڈنر پر بلایا۔ صاحب بیگم صاحب بھی گئے تھے۔ ماسٹر موگرا آپ لوگوں نے تھیٹر میں بھی کام کیا ہے؟ ہم نے تو مختار بیگم کو کورنتھین تھیٹر کلکتہ میں آغا حشر کاشمیری کی غزل گاتے سنا — چوری کہیں کھُلے نہ نسیم بہار کی۔ اور بے بی نور جہاں کلکتہ میں تھیٹر کی کورس گرل تھیں۔ سرکار ایک کیس کے لیے کلکتے گئے تھے تب کی بات ہے۔ مخدوم باندی بھی تھیٹر میں تھیں۔"

"بھوانی پچا آپ ہمیں یہاں بڑی نمائش میں تھیٹر دکھلانے بھی تو لے گئے تھے۔ ہم نے ضد کی تھی۔"

"جی ہاں پرستان تھیٹر۔ اس میں اختری بائی فیض آبادی ہیروئن تھیں۔"

قنبر میاں نے روس کی خارجہ پالیسی بالائے طاق رکھی اور گھنٹی بجائی۔ عیدُو حاضر ہوتے۔ نوٹنکی والوں کو دیکھ کر کھیسیں نکالیں۔

"ذرا چار۔ تولاؤ بھئی فٹافٹ۔" قنبر میاں نے کہا۔ اب وہ تفریح کے مُوڈ میں آچکے تھے۔

"ہاں تو بھوانی پچا — اختری بائی —"

"جی ہاں بھیّا۔ نندن نواس میں رہتی تھیں۔ ایک دیوانہ چاندنی راتوں میں سارے شہر کی سڑکوں پر چاک سے اپنا نام لکھتا پھرتا تھا اور اس کے آگے۔ عاشق زار اختری بائی۔ کبھی کبھی باٹا کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گٹار بجاتا تھا۔ سُنا تھا اچھے گھر کا لڑکا تھا۔ انسان کا دماغ لوٹتے کیا دیر لگتی ہے۔ بس خدا بُری گھڑی سے بچائے۔"

سوختہ اس پارٹی کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کو نظر انداز کر کے ماسٹر موگرے نے کہا "سرکار یہ غلام اور اہلیہ دونوں فلم اسٹار ہیں۔ یہاں نسیم سندیلوی رشید دُلہن بنا رہے تھے — اس کے لیے اہلیہ کو آفر مل سکتا تھا مگر اس زمانے میں ہمارے پاس بمبئی میں کام بہت تھا۔ پھر یہاں سنبل کی آرزو بنتی شروع ہوئی اس کے لیے بھی

گفت و شنید رہی۔ خیر وقت کی بات ہے۔ حضور عرض یہ ہے کہ یہ ہماری دُختر نیک اختر گلِ عباس سلمہا — جسے ہم نے پنج گنی میں پڑھایا ہے۔ ہم اسے بیلا رانی کے نام سے پردہ سیمیں پر پیش کرنے والے ہیں۔" جیب سے ایک کاغذ نکالا "یہ اپنے تینوں رسالوں میں چھاپ دیجیے۔ اشتہار۔"

بیلا کرسی پر بیٹھی پیچ و تاب کھایا کی۔

"استاد یہ خالص سیاسی پرچے ہیں ہم ان میں اس قسم کے اشتہار چھاپتے ہی نہیں۔"

"ملاحظہ تو فرمائیے۔"

قنبر نے بھنویں اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

صنوبر پکچرز۔ اندھیری۔ بمبئی
کا
اوّلیں شاہکار
گلزارِ محبّت
بیلا۔ رابیل کمار۔ پرنس گلفام۔ چنبیلی دیوی۔ لوٹن کبوتر۔
کہانی اور مکالمے: دیوتا ڑبارہ بنکوی
گیت: بہار پھُولپوری چکوترا گڑھوالی۔
ڈانس ڈائریکٹر: چھونگے مہاراج
موسیقی: اے۔ بی۔ موگرے رقص: میڈم ٹھُمکی
نائب ہدایت کار: پریزادہ گلاب
پروڈیوسر فنانسر: ایڈل جی بومن جی پوچ کھانا والا
ڈائریکٹر: پرنس گلفام۔

قنبر میاں نے قہقہہ لگایا۔ "یہ فلم کمپنی ہے یا کمپنی باغ؟"
"جی ہاں سرکار۔ بلکہ باغیچۂ سلیمانی۔" ماسٹر موگرے نے باچھیں کھلائیں۔

قنبر میاں کو تعجب نہیں ہوا جب انہوں نے ابرار حسین عرف بوبی میاں کی دعوت ولیمہ میں پوری صنوبر کمپنی کو موجود پایا۔ ڈنر کے بعد ان کا پروگرام پیش کیا گیا۔ ماسٹر موگرے، نوٹن کبوتر (جو دراصل پریزادہ گلاب ہی تھے) اور چکوترا گڑھوالی کی نقلیں۔ بیلا رانی کی نغمہ سرائی۔ تین کٹوری ہاؤس کی برساتی کے سامنے آدھا چبوترہ بنا ہوا تھا جو اس قسم کی محفلوں کے لیے اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ نقلیں ختم ہوئیں۔ بیلا رانی شوخ سلمہ ستارہ کی چم چم کرتی ساری میں سرسراتی آکر قالین پر جلوہ گر ہوئیں۔ ان کی والدہ زرق برق غرارے کا جوڑا پہنے ماتھے پر نقلی کندن کا جھومر چپکا لگائے ہارمونیم بجا رہی تھیں۔ موگرے اور گلاب نے سارنگی اور طبلے پر سنگت کی۔ بیلا رانی نے اپنی والدہ کا کلام پیش کیا جو ان کے لیے دراصل بہار چھوپوری لکھتے تھے۔ یہی غزلیں وہ ترنم سے مشاعروں میں پیش کرتی تھیں اور جب سے انکی قوالی پارٹی فیل ہوتی تھی۔ مشاعرے ہی ان کا ذریعۂ آمدنی تھے۔ بیلا رانی کے پروگرام کے بعد چکوترا گڑھوالی نے بانسری پر سحر آفریں دھنیں سنائیں۔

بہت خاصی بیل ملی۔ سوائے بیلا رانی کے موگرا اینڈ کمپنی مسرور ہوئی۔

شامیانے میں قنبر میاں دولہا کے ساتھ بطور شہ بالے سامنے ہی موجود تھے۔ دولہا کی چھوٹی بہن صفیہ نزدیک کی کرسی پر بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھیں کہ جلد از جلد اسی صوفے پر قنبر میاں سہرا باندھے بیٹھے ہوں۔ صفیہ سلطانہ نے دل ہی دل میں مہمانوں کی فہرست بھی مرتب کرنی شروع کر دی تھی لیکن شیخ قنبر علی بہت ہی بے تکے آدمی تھے۔ اس دوٹکے کی بیلا کو اتنے دھیان سے دیکھ رہے تھے گویا زندگی میں آج تک

نہ ایسی عجوبہ روزگار مغنیہ دیکھی نہ ایسا گانا سنا۔ اور وہ گاتے ہوئے بھی حد سے زیادہ بیزار معلوم ہوتی تھی یا اس کی شکل ہی ایسی تھی۔ ٹرسی اور نک چڑھی۔

قنبر علی نے "ریڈ روز" کے دو صفحات رنگین کر دیے تھے۔ کل تین ہفتے قبل پریس میں جاتا تھا وہ آرٹسٹ کے بورڈ پر جھکے لے آؤٹ کی فائنل چیکنگ میں مشغول تھے کہ ایک سب اڈیٹر برآمدے میں آیا۔ "کامریڈ (قنبر میاں کا اصرار تھا کہ سب انہیں کامریڈ کہیں) کسی مہیلا کا فون ہے کہتی ہیں فوراً بات کیجیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"ان سے کہو پانچ منٹ بعد کنوئیں میں کود یں۔" آرٹسٹ نے جواب دیا۔ "ایک تو یہ مہیلائیں کامریڈ اڈیٹر کو چین نہیں لینے دیتیں۔ قنبر میاں ذرا یہ سائز ——"

"ابھی آیا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔"

قنبر علی کے دل نے کہا تھا کہ یہ بیلا ہوگی۔ وہی نکلی۔ فرانٹے سے انگریزی بول رہی تھی —— "اسے S.O.S. سمجھیے۔ آپ پروگریسو آدمی ہیں۔ اس شہر میں سب سے تعریف سنی۔ یہ لوگ مجھے ایک منٹ کے لیے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے کوئی ترکیب نکالیے کہ ان کی غیر موجودگی میں آپ سے مل سکوں۔"

ملاقات سے پہلے قنبر میاں نے اپنے چیف رپورٹر معراج میاں کو ڈیوٹی پر لگایا کہ طائفے کے اصل حالات سے آگاہ کریں۔

ایک ہفتے بعد معراج احمد نے آکر کہا۔ "چنبلی بیگم ذات کی ڈومنی ہیں۔"

"نون سنس" قنبر نے غصے کے ساتھ بات کاٹی۔ "کیسی ذات کیسی پات۔ یار تم بھی رجعت پسند ایکسٹریمسٹ نکلے۔"

"کامریڈ اڈیٹر۔ آپ نے رپورٹ طلب کی تھی۔ سو حاضر ہے۔ ڈومنی ہیں۔"

”فوک سِنگر کہو۔“

”اور شریف لوگ ہیں۔ پیشہ ور عورتیں نہیں چنبلی بیگم کی ماں جعفر باندی کا نواب حشمت جہاں بیگم کی مرثیہ خوانوں میں اسم تھا۔ چنبلی کا اصل نام اللہ جلائی ہے۔ نواب صاحبہ کے صاحبزادے ان پر زہر کھانے لگے۔ بیحد حسین تھیں۔

”نواب صاحبہ نے راتوں رات ماں بیٹی کو محل بدر کیا۔

”جعفر باندی نے اللہ جلائی کو موگرا بھانڈ کے پلے باندھ دیا موگرا کی مناسبت سے چنبلی کہلائیں۔ میاں بی بی نے چند سال شادیوں میں گا بجا کر پیٹ پالا۔ امام بخش عرف موگرا کو فلموں میں میوزک دینے کا سودا تھا بیوی بچوں کو لیکر بمبئی پہنچے۔“

”بچے کون — ؟“

”یہی گلاب اور گل عباس عرف بیلا۔ طرح طرح کے پاپڑ بیلے۔ ماسٹر آئی۔ بی۔ موگرے کے نام سے چند میوزک ڈائریکٹروں کے اسسٹنٹ رہے مجبوراً چنبلی بیگم بھی چھوٹے موٹے رول کرنے لگیں۔ ایک بات ماننا پڑے گی یہ اتنی خوبصورت تھیں کہ اگر چاہتیں تو آسانی سے ہیروئن بن سکتی تھیں۔ مگر نیک چلن عورت تھیں۔ بہن بھابی پر اکتفا کیا۔ مٹاپا سوار ہوگیا تو سائیڈ رول بھی ملنے بند ہوگئے۔ انہوں نے ایک اسٹوڈیو کے احاطے میں برگد تلے انگیٹھی رکھ کر قورمہ کباب پراٹھے پکانے شروع کیے۔ قورمے کے ذریعے ہیرو تک رسائی ہوگئی۔ وہ ایک سنکی آدمی تھا۔ اس نے گل عباس کو بیٹی بنا لیا۔ پنج گنی پڑھنے بھیجدیا۔ وہاں سے ان کو جلد ہی واپس آنا پڑا کیونکہ خود ہیرو برگد تلے آچکا تھا لیکن اب موگرے نے ٹھان لی کہ بیلا کو نرگس کی طرح لانچ کریں گے۔ اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہار پھولپوری نے رائے دی کہ قوالن پارٹی بناؤ۔ چنانچہ شکیلہ بانو بھوپالی کے توڑ پر بیلا بھاونگری اینڈ پارٹی تیار ہوئی۔ ماں بیٹیاں قوالی گانے لگیں۔ ان کے پروگراموں میں ایک باواجی بہت آیا کرتے تھے ایڈل جی بومن جی پوچ کھانا والا۔ وہ ریس کے گھوڑوں کا مالک ہے۔

”بہار پھولپوری نے اسے گانٹھا کہ پکچر فنانس کرے۔“

”بھائی یہ تو بہت ہی شیڈی سیٹ اپ ہے مگر پیداواری رشتوں سے اس صورت حال کا جو تعلق ہے۔ ہمیں اس کا تجزیہ کرنا چاہیے۔“

”جی ہاں بیشک۔ ان سے ملاقات کی ترکیب بہت آسان ہے ماسٹر موگرا کو کہلوا بھیجیے —— جشن میں بیلا کا گانا بہت پسند آیا۔ ریڈ روز، لال گلاب اور گلِ سرخ تینوں میں ان کے متعلق ایک خصوصی فیچر شایع کرنا چاہتے ہیں یہ فلاں تاریخ دفتر میں آجائیں۔“

”ٹھیک ہے یار تم آدمی سمجھدار ہو۔ مگر منشی سوختہ کو ابھی نہ بتلانا۔ انہوں نے اس منڈلی کو زیادہ اپرڈو نہیں کیا۔“

قنبر میاں نے فیچر کا عنوان سوچ لیا۔

ویمن قوال

ہندوستان کی نئی عوامی فنکار

پیپلز آرٹسٹ۔ لوک کلاکار۔ الفاظ، اصطلاحات میں بڑی طاقت ہے۔ ڈوم دھاڑی میراثی بھانڈ میں جس قدر تحقیر مضمر ہے فوک سنگر، فوک آرٹسٹ۔ ایمیج ہی بدل جاتا ہے۔

سنیپچر کی صبح فوٹو سشن اور انٹرویو۔

قنبر نے منشی سوختہ کو دفتر کے کام سے الہ آباد بھیج دیا۔ گو وہ کام ڈاک یا ٹیلیفون سے بھی ہو سکتا تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ماہر اقتصادیات سے مضمون منگوانا تھا۔ منشی جی کچی گولیاں تو کھیلے نہیں تھے۔ کچھ کچھ اندازہ انہیں نوبی میاں کی شادی میں بھی ہو گیا تھا۔ الحمدو سے کہتے گئے ہمارے پیچھے کیا ہوتا ہے سب خبر رکھنا۔

وقت مقررہ پر ریڈ روز کے ڈرائنگ روم میں بیلا مع ماں باپ اور بھائی کے آن کر بیٹھیں۔ وہ تینوں انگریزی سے نابلد تھے۔ موگرا محض دستخط کر سکتے تھے پریزادہ گلاب پہلی کلاس پاس تھے۔ پروگرام کے مطابق اسٹاف فوٹوگرافر نے اپنا سازوسامان جمانے کے بعد اطلاع دی کہ کیمرہ خراب گیا سٹن اگلے روز پر ملتوی ہوا۔ اسطرح کئی دن گزر گئے۔ پریزادے کی بھی تصویریں کھنچیں انھوں نے اپنے لقب کی وجہ تسمیہ بتلائی والدہ بیحد حسین تھیں۔ عطر پری کہلاتی تھیں۔ چنانچہ وہ پریزادہ گلاب کیوں نہ مشہور ہوتے۔ وہ سورت کی ایک پرانی ٹاٹ تھیٹر کمپنی میں زنانہ پارٹ بھی کر چکے تھے اور بمبئی کی گجراتی اسٹیج پر بھی ان کو کام ملا تھا۔

یہ بڑے دلآویز لوگ تھے۔ ذہین اتنے باصلاحیت اور اتنے بدقسمت۔

"فنکار ہمارے پونجی وادی سماج ہی میں اتنا پریشان حال کیوں رہتا ہے۔" مضمون لکھنا شروع کیا۔ پھر خیال آیا مکمل اسٹوری کے لیے بیلا سے مزید بات چیت ضروری ہے۔ منشی سوختہ الہ آباد سے واپس آچکے تھے۔ رسالوں کے اسٹاف میں چہ مگوئیاں شروع ہونے کا احتمال تھا۔ المحمود نے ان لوگوں سے مخاصمت کا پہلے ہی اظہار کر دیا تھا جب دوسری مرتبہ وہ فوٹو سشن کے لیے پہنچے بڑی بی نے اندر آکر کہا تھا "بھیا وہ آتے گئے۔"

"کون بھئی؟"

"وہی ماسٹر موگرا جو بھیڑیے کی طرح منہ چیرے سارے میں گھومت ہیں۔"

چنانچہ بیلا کو گھر پر بلانا قطعی مناسب نہ تھا والدین اونچے کلبوں کے ممبر تھے۔ یہ اسے لیکر وہاں جا سکتے تھے۔ لیکن بسلسلہ ترقی پسندی ان بورژوا اداروں سے وہ خود مستعفی ہو چکے تھے اب مصیبت یہ تھی کہ اس کو ہمراہ لیکر کسی ڈھابے میں بھی تو

نہیں جا سکتے تھے۔ کوالٹی میں جاکر بیٹھتے سارا شہر جان جاتا کہ باپ کے مرتے ہی چھوٹی موٹی فلم ایکٹرسوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے لگے۔ اصلیت تو کسی کو معلوم نہیں باتیں سب بنانے لگتے ہیں۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ طویل ڈرائیو مع وائیر ریکارڈر۔ ماں باپ کی اجازت سے۔ پریزادہ گلاب ہمراہ چلیں۔

"ہم تو جاتے ہی ہیں۔ ہم نے نوٹنکی کا ٹور کیا ہے اور اپنی قوال پارٹی کے ساتھ سارے مہاراشٹرا اور گجرات میں گھومے گاؤں کھیڑے میں رات برات ٹھہرنا اسی مارے ہم تو رامپوری چاقو بھی اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔" پریزادہ نے اپنی مرصع بیلٹ پر ہاتھ پھیر کر بتایا۔

دفعتاً قنبر میاں اکتا گئے۔ ہم عوامی فنکاروں سے ہمدردی کے چکر میں بڑے پھنسے۔ یہ چاقو چھری کیا معنی۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اپنی کار پر موگرا کے جائے قیام یعنی عبدالرحمٰن بیکری والے کے ہاں پہنچے۔ مع پکنک باسکٹ۔ فلاسک۔ وائیر ریکارڈر۔

سلیکس میں ملبوس سر پر بصورت پگڑی اسکارف باندھے بیحد اسمارٹ بیلا رانی آکر گاڑی میں بیٹھیں۔ گلاب پچھلی سیٹ پر براجے۔ موگرا اور چنبیلی نے اوپر بالکنی میں سے خدا حافظ کہا۔ قنبر جھینپ سے گئے دل میں کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ سارا محلہ دیکھ رہا ہے۔ شہر میں قنبر میاں کو کون نہیں پہچانتا تھا۔

لیکن لمبی ڈرائیو پر جاتے ہوتے پچھتاتے نہیں دوران گفتگو بیلا کی شرافت اور خودداری نے ازحد متاثر کیا۔ وہ ایک نہایت حساس اور مصیبت زدہ لڑکی تھی اور صحیح معنوں میں آرٹسٹ — اور اس نے جو کہانی اپنی اور اپنے لوگوں کی سنائی اس سے سماجی تجزیات کے لیے ایک اور تناظر حاصل کیا — وہ تو دراصل ابتک عوامی زندگی کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ کوٹھی میں پیدا ہوتے۔ مسوری میں پڑھے۔ پُرآسائش زندگی بسر کر رہے تھے ہمیشہ سے۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ سلمز میں لوگ کس طرح

رہتے ہیں۔ غلیظ گلیوں کے اندر ۔ گاؤوں کے تاریک کچے مکانوں میں ۔ یکلخت احساس ہوا کہ وہ واقعتاً ایک آرام چیئر لفٹنٹ تھے ۔

اندرون شہر سے نکلتے ہوئے ایک پرانا پھاٹک دکھلائی پڑا ۔

"نواب حشمت جہاں کی حویلی ۔ امّاں اور نانی کو انھوں نے بلاقصور راتوں رات یہاں سے نکال دیا تھا۔"

"بیلا ہم ان سب کی طرف سے معافی چاہتے ہیں۔"

"ہم لوگوں نے ان گلی محلّوں میں بہت جوتیاں چٹخائی ہیں —

"یہاں شادی بیاہ منگنی بسم اللہ سنّتیں ان ساری تقریبوں میں گانے کیلئے آتے تھے ۔ شادیوں میں امّاں سے ایک گانا اکثر سنا جاتا ۔ او ہی رے دیس بابل چُنری بھئی مہنگی ۔ تو سیندور رہوا بڑا مول رے ۔ او ہی سیندور لکے کارن چھُوٹا ہے بابل کا دیس رے ۔"

سیندور —— شربری کی بحث یاد آئی —— کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا: "یہی سارا فتنہ ہے بیلا ۔ سیندور رہوا بڑا مول رے اس کی اکنومکس ہمارے پیداواری رشتوں سے جُڑی ہوئی ہے" ۔

"امّاں مجھے گوٹے لچکے والا فراک پہنا کر لاتیں ۔ تقریبوں میں پہننے کے لیے میرے پاس وہ ایک ہی فراک تھا ۔ سر پر گوٹے کی ٹوپی اڑھا دیتیں ۔ آنکھوں میں خوب سا کاجل لگاتیں ۔ ہم لوگ ہمیشہ دروازے کے پاس جوتیوں کے ڈھیر کے نزدیک بیٹھتے تھے ۔ امّاں مجھے گانے کے لیے کھڑا کر دیتیں ۔ بیویاں کبھی مجھے بڑے شوق سے گواتیں کبھی بُری طرح جھڑکتیں —— اری چُپ ہو جا ری ۔ بات کرنے دے اور مَیں

سہم کر امّاں کی گود میں جا بیٹھتی —— ہم نوکروں کے ساتھ کھانا کھاتے امّاں اور نانی دوپٹے میں شیرمال اور کباب باندھ کر گھر بھی لے آتیں ۔ ابّا باہر مردانے میں نقلیں کرتے کبھی جانوروں کی بولیاں بولتے ۔"

"ابّا مینڈک والی نقل خوب کرتے تھے ۔" پریزادہ گلاب نے کہا "ندی کے اس پار ایک مینڈک ٹرّا رہا ہے ۔ دوسرے کنارے پر دوسرا جواب میں کیسے ٹرّاتا ہے ۔ کبھی آپ بھی سُنیے گا ۔ مینڈکوں کا سوال جواب ۔"

کار شہر سے نکل کر جنگل کے راستے پر آ گئی ۔
قنبر نے رفتار تیز کی ۔ ہوا فرّاٹے بھرنے لگی ۔

"اس روز بھی بڑی تیز ہوا چل رہی تھی ۔" بیلا نے کہنا شروع کیا ۔ "ہم لوگ تھرڈ کلاس کے ایک چوڑے سے ڈبّے میں بیٹھے تھے ۔ اس زمانے میں تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ بہت بڑے ہوا کرتے تھے اور مسافر بھی بہت کم ۔

"ہم چاروں تھے ۔ اور ایک دو مسافر اور ۔ ابّا ہم لوگوں کو بمبئی لیے جا رہے تھے

"ٹرین کے دونوں طرف بڑی ہریالی تھی ۔ برسات کا موسم تھا ۔ میں ایک مسافر سے لے کر تازہ انڈین لسنر کے ورق پلٹ رہی تھی ۔ اس کے کوَر پر ایک راجستھانی پینٹنگ تھی جنم اشٹمی کے متعلق کہ اندھیرے آسمان پر بجلی چمک رہی ہے ۔ اور ایک عورت تیز بارش اور بجلی میں پھوار سے بچتی بھاگ رہی ہے ۔ بجلی کی تصویر بڑی ریلسٹک تھی ۔

"دور سمندر نظر آیا ۔ نمک کی ڈھیریاں ۔ ہرے بھرے ٹیلے ۔ ناریل کے جھنڈ ۔ ابّا بولے ہم جنّت کی طرف جا رہے ہیں ۔ بمبئی عروس البلاد کہلاتی ہے ۔ اور زمین کی جنّت ہے ۔

"مغربی گھاٹ کے سرسبز سلسلے پر بارش کا آبی غبار تیرتا جاتا تھا۔ پھر کھپریل کے دو منزلہ مکان ظاہر ہوتے۔ اور بانکپن سے اودی نیلی آٹھ گزی ساریاں باندھے جوڑوں میں پھول سجائے تصویروں جیسی گھاٹی عورتیں ——

"شیروانی پہنے ایک لمبے بالوں والا دبلا پتلا لڑکا کھلے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ جھانسی سے سوار ہوا تھا۔ بہت غریب معلوم ہوتا تھا۔ اماں نے ناشتے دان نکال کر جب سیٹ پر اخبار بچھائے اور ابا نے دستور کے مطابق اس سے کہا آئیے کھانا کھائیے تو وہ چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا اور ہمارے قیمے پراٹھوں میں شریک ہوا۔ شکریہ ادا کرکے پھر کھڑکی میں جا بیٹھا اور شعر گنگنانے لگا۔ ابا نے پوچھا آپ کا اسم شریف۔ بولا۔ ہم بہار پھولپوری ہیں اس انداز سے گویا ہم جگر مرادآبادی ہیں۔
"ابا نے پوچھا آپ موضع پھولپور ضلع الہ آباد سے تشریف لائے ہیں؟ کہنے لگا صاحب آپ نے مجھے کھانا کھلایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذاتی سوالات کا جواب بھی دوں اور راستے بھر فکر سخن کے بجائے فضول بکواس کرتا رہوں۔

"اب وہ دروازے میں جا کر ترنم سے شعر پڑھ رہا تھا۔ ہینڈل پر زور ڈال کر باہر کو جھول جاتا۔ اماں کہتیں الٰہی خیر —— اے بھیا کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔
"وہ اسیطرح کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ لوکل اسٹیشن سر سر گذرنے لگے۔
"شہر کے نزدیک —— ایک کمپاؤنڈ کی دیوار پر چونے سے اردو اور انگریزی میں بڑا بڑا لکھا نظر آیا۔ بھونانی پروڈکشنز۔ ابا نے فوراً ٹوپی سر پہ رکھی اور بولے میرا دل کہتا ہے یہیں اتر جاؤ۔
"جب گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی ہم چاروں اپنی گٹھریاں پوٹلیاں ٹرنک سنبھال کر پلیٹ فارم پر اترے۔ ٹرین چلی اور بہار پھولپوری بال ہوا میں لہراتے آگے نکل گئے۔
"ماسٹر امام بخش موگرا کی دل کی آواز نے ہمیں بہت کنویں جھنکائے۔

"بمبئی روانہ ہونے سے قبل ہم لوگ بہرائچ درگاہ گئے —— وہیں پرانا رکلی جھیل میں نہاتے ایک خانصاحب ابا کو ملے وہ بمبئی میں کانچ کی بنگلیہ، پون پل پر سازندے تھے پتہ لکھوا دیا تھا۔ —— ان کے ہاں پہنچے۔ پھر بہت مارے مارے پھرے۔ وہ سہگل کا آخری دور تھا ابا نے اب دل کی آواز سنگر اسٹریٹ سنگر والے سہگل کی دھج بنائی۔ ہارمونیم گلے میں ڈالا اماں کو کانن بالا جیسی بجلیاں پہنائیں اور کسی نہ کسی طرح ایک اسٹوڈیو میں گھس گئے۔ دونوں کو ممتاز علی اور شہزادی ٹائپ ناچ گانے کا کام مل گیا۔ ناگپاڑہ کی ایک ٹوٹی پرانی چال میں دس روپئے مہینے کی کھولی بھاڑے پر لی۔"
بیلا اچھی خاصی اردو بولتے بولتے یکلخت بمبیّا پر اتر آتی تھیں۔

"سرکار —— میں بتلاتا ہوں ——" گلاب پچھلی سیٹ پر سے آگے جھک کر بولے۔
"دھیرے دھیرے اماں کو سہیلی کے رول ملنے لگے۔ اس زمانے میں حضور اشتہاروں میں کاسٹ کی فہرست ہوا کرتی تھی۔ جلو بائی۔ امینہ۔ خاتون۔ چارلی۔ غوری۔ ڈکشٹ۔ اسیطرح کی فہرستوں میں اماں اور ابا دونوں کے نام آنے لگے۔ ہماری عید ہو گئی۔ چنبیلی دیوی اور ماسٹر آئی۔ بی۔ موگرے۔ وہ جھوٹ کی داڑھی لگاتے سادھو یا فقیر کے بھیس میں ایک با موقع گانا گاتے اسکرین پر سے گذرتے تھے۔" گلاب خوب ہنسے۔ "ڈھومی خاں کی دھوم مچ رہی تھی اور جھنڈے خاں نے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ ابا کو یقین تھا کہ وہ بھی بطور استاد موگرے خاں شہرت حاصل کریں گے مگر قسمت کے ہیٹے رہے بہر حال حضور اب اماں ——"
"بھئی آپ لوگوں سے اتنی بار کہا ہے کہ ہمیں حضور سرکار نہ کہیے۔" قمر نے ٹوکا۔ اور شہر واپس جانے کے لیے اٹھے ——

"اماں ایک سی کلاس فلم میں سیکنڈ ہیروئن بن گئیں۔ ہم لوگوں نے کھولی کو

اپنی نئی حیثیت کے مطابق سجایا۔ میں نے ایک سنگھار میز نُما منّا سا آئینہ دیوار سے ٹانگا۔ کاغذی پھول کانچ کے گلدانوں میں رکھے گھی کے خالی ٹینوں میں پودے لگا کر اگاسی کے نیچے اٹکا دیئے۔ ابّا ایک سیکنڈ ہینڈ مسہری خرید لائے جس کے سرہانے پھولدار ٹائیل لگے تھے۔ امّاں چونکہ اب باقاعدہ گویا ہیروئین تھیں وہ مسہری پر سوتیں۔ ابّا نیچے فرش پر۔ گلّو بھائی پلنگ کے نیچے۔ مسہری کی چھت پر میرا بستر بچھتا۔ بمبئی میں بڑے بڑے کنبے اور بہت پیسے والے بھی اسیطرح ساری زندگیاں گذار دیتے ہیں۔ چال سسٹم کی اپنی کلچر ہے۔ آپ کبھی کسی چال میں گئے ہیں ؟" بیلا نے پوچھا۔

"نہیں۔" قنبر نے ذرا شرمندگی سے جواب دیا۔

"ایک کونے میں موری۔ دوسرے میں اسٹوو۔ اوپر ریک میں برتن۔ رنگین مچھلیوں کا ٹینک اور شوکیس کھولیوں میں اسٹیٹس سمبل ہے۔ دونوں چیزیں ہمارے ہاں آگئیں۔ امّاں نے اپنے چمکیلے جوتے اور کپڑے شوکیس میں رکھے۔ اندر بلب لگا دیا۔ اب لمبے لمبے فراک پہنے خوجہ اور میمن پڑوسنیں دروازے میں آکر کھڑی ہو جاتیں اور امّاں بڑے فخر سے ان کو اپنے پوشاکیں دکھلایا کرتیں۔ ہمارا کنبہ ساری چال میں مقبول تھا —— زندگی بڑی باقاعدگی سے گذر رہی تھی۔ صبح صبح میں یا امّاں اگاسی میں اسٹوو رکھ کر کھانا تیار کرتے۔

"اونٹی ہوئی چائے گلاسوں میں ڈال کر پیتے۔ گلاب جا کر مغل کی دوکان سے گرم تازہ ڈبل روٹی اور مکھن انڈے لے آتے۔ ناشتے کے بعد کھانا ٹفن کیریر میں رکھا جاتا۔ امّاں اور ابّا ناشتے دان سنبھال ریلوے اسٹیشن کا رخ کرتے دونوں ہمیشہ ایک ہی اسٹوڈیو میں کام کرتے تھے میں بستہ اٹھا کر میونسپلٹی کے اردو اسکول روانہ ہو جاتی۔ گلّو بھائی آوارہ گردی میں لگے رہتے۔ ابّا نے سمجھا بجھا کر انہیں اسٹوڈیو میں لائٹ بوائے لگوا دیا۔ وہاں سے یہ کچھ گجراتی ایکٹروں کے ساتھ سورت بھاگ گئے۔

"امّاں اب معمولی پکچروں میں بھابی اور ماں بننے لگیں۔ پھر بہت سخت بیمار ہوئیں۔ سال بھر پڑی رہیں۔ سارا اندوختہ ان کے علاج معالجے میں لگ گیا اچھی ہوئیں تو کام نہ ملا۔

اسی اسٹوڈیو میں بَڑ کے نیچے انگیٹھیاں رکھ کر قورمہ کباب پراٹھے تیار کرنے لگیں۔ امّاں کے ہاتھ کا پکا لذیذ کھانا ہِٹ ہو گیا۔ گلّو سورت سے لوٹے۔ میں بالٹی میں پانی بھر کر برتن دھوتی۔ گلّو بھائی پلیٹیں اندر لے جاتے۔ ابّا خریداروں سے پیسے وصول کرتے۔

"قورمے کے ذریعے بی کلاس پکچروں کے ہیرو پرنس گلفام تک رسائی ہوئی۔ انہوں نے پہلی بار مجھے دیکھا تو رو پڑے۔ کچھ تھیٹریکل سے آدمی تھے۔ قنبر صاحب آپ نے انکی فلمیں دیکھی ہیں ؟"

"نہیں بھئی۔"

"وہ زیادہ تر کوسٹوم پکچرز میں آتے تھے پرانے ایکٹر تھے۔ کانوں میں موتی پہنتے۔ ہلکا سا پوڈر لپ اسٹک بھی لگائے رکھتے۔ بھویں PLUCK کرتے تھے۔ بہت ہی بھلے آدمی تھے۔"

"ٹھیک ہے مگر تمہیں دیکھ کر وہ روئے کیوں ؟"

"پہلے روئے پھر ہنسے۔ حاتم طائی کی طرح۔ کہنے لگے ان کی لاڈلی بیٹی بالکل میری ہم شکل تھی جو مر گئی۔ آج اتنے برسوں بعد انہیں وہ نظر آ گئی۔ آج سے تم مابدولت کی بیٹی ہو۔ آج سے تمہارا سارا خرچہ مابدولت کے ذمّے۔ پرنس گلفام بادشاہوں کا رول کرتے کرتے عادتاً اسیطرح بولتے تھے۔ ابّا نے دست بستہ عرض کی۔ جہاں پناہ۔ ہم اسے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانا چاہتے ہیں۔ اتنا بوتا نہیں۔" جوش سے بولے ہم اسے پنچ گنی میں پڑھائیں گے اور نرگس کیطرح لانچ کریں گے۔

"لیکن پرنس گلفام اسٹائل کی ایکٹنگ کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کی آخری پکچر فیل ہو گئی۔ میں پنچ گنی میں صرف دو سال گذار کر واپس آ گئی۔ کیونکہ خود بیچارے گلفام کو بھی اسی برگد تلے آکر بیٹھنا پڑا جہاں بیکار اداکاروں اور ایکسٹراز کا ہجوم کام کے انتظار میں دن بھر موجود رہتا تھا۔"

گلاب اور بیلا نے پکنک کا سامان ٹوکری میں واپس رکھا۔

"اسی بھیڑ میں ایک روز بہار پھولپوری ابّا کو ٹکرا گئے۔ ان کا حال اب بھی پتلا

معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ٹرین میں اس بُری طرح ڈانٹ چکے تھے اس لیے ابا نے کوئی ذاتی سوال نہ کیا کہ اتنے برس کہاں رہے اور کیا کیا — گُلّو بھائی نے ایک مرتبہ بتلایا تھا کہ ماہم کی جھونپڑپٹی میں ایک آنٹی کی بھٹی پر انہوں نے بہار صاحب کو دیکھا تھا مگر وہ بالکل آؤٹ تھے اور انہیں پہچانے نہیں۔ کئی نامور شاعر گُلّو بھائی نے بتلایا کہ وہاں آیا کرتے تھے۔ اب بہار صاحب نے خود ہی فرمایا کہ وہ ایک بڑے نغمہ نگار کے اسٹاف پر ہیں اور اس کے نام سے گیت لکھتے ہیں۔ اچھے پارٹنر مل جائیں تو اپنی ٹیم بنالیں۔

"وہ چنبیلی کے ڈھابے پر اکثر آنے لگے۔ ایک روز بولے — ہم فقط دس روپیے جیب میں ڈال کر گھر سے نکلے تھے اور وہ دس روپئے ہم نے بمبئی میں مستقل قیام کے اخراجات کے لیے بچا رکھے تھے اور بیحد بھوک لگ رہی تھی تب آپ نے ہمیں پیٹ بھر کھانا ٹرین میں کھلایا تھا اس احسان کا بدلہ ہم اس طرح چکائیں گے کہ گل عباس سلمہا کو لانچ کریں گے۔

"جس نے انہیں لانچ کرنے کی اسکیم بنائی وہ ڈوبا۔ میاں اپنے کام سے لگے رہو۔ ہر مہینے تنخواہ مل جاتی ہے ابا نے کہا۔ بولے۔ سنیے تو سہی آج کل زنانہ قوالی کا ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ سپلائی کم۔ ہم نے مشاعرہ قوالی مارکیٹ کو بہت اسٹڈی کیا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ کس شاعر کی اسٹار ویلیو اس وقت کیا ہے —— کیونکہ ہندوستان میں ہماری پیاری چہیتی مادری زبان اردو اب ایک انٹرٹین منٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب ہم گل عباس سلمہا کا نام شکیلہ بانو بھوپالی کے توڑ پر بیلا بھاؤ نگری رکھیں گے۔ اور ایک قوالن پارٹی بنائیں گے۔"

"بہار صاحب کو برجستہ نام تجویز کرنے کا عجیب و غریب ملکہ حاصل ہے —" قنبر نے اظہار خیال کیا۔

"لہٰذا ہماری قوال پارٹی بنی۔ اور شروع شروع میں بہت کامیاب رہی۔ اس پارٹی میں کومیڈین چکو ترا گڑھوالی بھی شامل ہو گئے یہ نام بھی بہار صاحب نے

رکھا تھا۔ ہم لوگوں نے دورے بھی کیے اورنگ آباد اور کرناٹک تک گئے۔ مگر ڈیمانڈ کے ساتھ ساتھ لیڈی قوالوں کی سپلائی بڑھتی گئی۔ کمپی ٹیشن تیز ہو گیا۔ بمبئی کی خوش حال قریشی انصاری برادری فری اسٹائل کشتیوں اور قوالیوں کی سرپرست ہے۔ قوالی ان لوگوں میں بھی بیحد مقبول ہوئی جن کی مادری زبان اردو نہیں تھی خاص کر گجراتیوں میں — ہمارے پروگرام زیادہ تر صابو صدیق پولی ٹکنک کے اوپن ایر تھیٹر میں ہوتے قوالی کنگ اور قوالی کوین کے خطاب دیے جاتے۔ ایک باوا جی ان پروگراموں میں بہت آتا تھا:

"ایڈل جی بومن جی پوچ کھانا والا —" قنبر نے بات کاٹی۔

"جی ہاں اس کو بہار صاحب نے پٹایا کہ ہمارے لیے پکچر بنائے۔"

"اب یہاں سے واپس جاتے ہی انشاء اللہ کام شروع —" میاں گلاب نے عقب سے اطلاع دی۔

"یہ رکاب گنج کے بیکری والے جن کے ہاں ہم لوگ ٹھہرے ہیں یہ بھی ہمارے قوالی فین ہیں ان کی بیکریاں بمبئی اور پونا میں ہیں اور یہ ہمارے پروگراموں میں ہمیشہ آیا کرتے ہیں۔ انہوں نے ابا سے اصرار کیا جب وطن تشریف لائیں میرے غریب خانے پر قیام فرمائیے گا۔"

شہر قریب آرہا تھا۔ نشاط گنج کے بازار میں کار روک کر قنبر نے گلاب سے کہا۔ "بھائی ذرا ہمارے لیے ایک پیکٹ گولڈ فلیک تو لے آئیے۔" پیسے نکال کر دیئے۔ وہ مستعدی سے اترے — "گولڈ فلیک نہ ملے تو کوئی اور برانڈ چلے گا؟"

"جی نہیں۔ وہی تلاش کیجیے۔"

وہ دوکانوں کی طرف لپکے۔ بیلا نے لمبی سانس بھر کے سیٹ سے سر ٹکایا۔ اخلاقاً گفتگو جاری رکھنے کی غرض سے قنبر علی بولے "اب بہار صاحب کے دن بھی پھر جائیں گے۔ بذریعہ صنوبر پکچرز —"

"وہ توآل ریڈی پھر گئے ہیں۔ ان کا بوس شاعر پالی ہل پر اپنے لکثری فلیٹ میں رہتا ہے۔ تین موٹریں رکھتا ہے۔ یہ بے چارے برسوں سے ایک بالکنی میں پڑے ہوئے تھے۔ لیکن گلا غضب کا پایا ہے۔ مشاعروں میں ان کا ترنم ہٹ ہو چکا ہے۔ دُور دُور بلاتے جا رہے ہیں۔ اب ان بے چارے نے مارے ہم لوگوں سے وفاداری کے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ اسی مشاعرے میں شریک ہوں گے جس میں چنیلی بیگم ناز اور بیلا رانی شوخ کو بھی مدعو کیا جاتے۔ ایک بار وطن گئے تھے۔ والدین نے شادی کر دی۔ بیوی کو ساتھ نہ لاسکے۔ اب کہہ رہے تھے کمرہ مل جاتے تو بیوی کو لے آئیں گے یہ سب قنبر صاحب گُڈ لک بیڈ لک کی بات ہے۔"

"لک کوئی چیز نہیں بیلا۔ یہ اصطلاح بھی سرمایہ داروں کی جعلسازی ہے۔"

"قنبر صاحب ہمارے محلّے میں بہت سے یہودی رہتے تھے۔ مراٹھی بولنے والے بنی اسرائیل پڑھے لکھے تھے وکیل اور ڈاکٹر۔ بغدادی یہودی گھر میں عربی بولتے تھے زیادہ تر غریب۔ پرانے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ شام پڑے وہ نکڑ پر مغل کے ریسٹوراں کے سامنے بنچ پر بیٹھ جاتے۔ موٹا لدھڑ سا ایرانی ان کو چار کے گلاس بھجواتا رہتا۔ وہ تربوز کھا کر اس کے چھلکے کچرے کے ڈھیر پر پھینکا کرتے۔ رفتہ رفتہ وہ سب اسرائیل چلے گئے۔ داؤد نصر اللہ ٹیکسی ڈرائیور ہماری چال میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام روزا تھا۔ لڑکی ربیکا۔ بوڑھی ماں حنّہ۔ ربیکا فورٹ میں ٹائپسٹ تھی۔ نصر اللہ داؤد بھائی کہلاتا تھا۔ بہت نیک دل آدمی تھا۔ امّاں جب بیمار پڑیں ہمارا کڑکی کا زمانہ تھا۔ وہ امّاں کو بلا کرایہ لیے برابر ہسپتال لے جاتا رہا۔ اس کا لڑکا اسرائیل جا چکا تھا وہاں فوج میں سولجر بھرتی ہو گیا تھا —— روزا نے اس کی تصویر دیوار پر لگائی جس میں وہ وردی پہنے بندوق تانے کھڑا تھا۔ وہ تصویر دیکھنے کے بعد گلّو بھائی نے امّاں سے کہا تھا اب داؤد بھائی کی ٹیکسی پر ہر گز مت بیٹھنا اور یہ بیلا کی بچّی اگر ان کے ہاں گئی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دونگا۔ وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔

ذاتی دوستی اور پاس پڑوس کا لحاظ قومی دشمنی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

"داؤد بھائی کی نوّے سالہ ماں حنّہ ساری چال کی 'اولڈ ماما' تھی۔ مراٹھے اسے حنّہ تائی کہتے۔ ساؤتھ انڈین حنّہ امّاں۔ گجراتی حنّہ بین یا باَ۔ مسلمان حنّہ بائی یا حنّہ بی۔ تیس سال سے اس نے اپنی خوش مزاج بہو روزا سے بات چیت بند کر رکھی تھی سفید چوغہ پہنے آرام کرسی پر بیٹھی بائیکلہ سنے گوگ کے عبادت گذاروں کیلئے گول ٹوپیاں سیتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی عربی میں بڑبڑاتی سوء الحظ —— سوء الحظ ——

"مجھے اس سے ڈر لگتا تھا۔ خبطی بڑھیا تھی —— آسیب سی۔

"ہماری قوّال پارٹی فیل ہو گئی۔ رُوک اینڈ رول ٹائپ قوّالی کا زور بندھا۔ ابّا ٹریڈیشنل میوزیشن ہیں۔ وہ رُوک اینڈ رول کے لیے راضی نہ ہوتے۔ دوسرے کمرشل قوّالوں قوّالنوں نے بڑے بڑے آرکیسٹرا تیار کر لیے۔ ڈرم۔ الیکٹرک گٹار وغیرہ۔ ہمارے پاس وہی طبلہ ہارمونیم۔ اتنی پونجی بھی نہ تھی کہ اپنی پارٹی کو موڈرن بناتے۔ —— امّاں کی فلموں کے زمانے کی گھسی ہوئی کارچوبی ساریاں پہن کر اسٹیج پر جاتے۔ آخری بار ہم نے اندھیری میں پروگرام دیا۔ وہاں ہمارے بھٹیچر گٹ اپ اور روایتی قوّالی پر ہوٹنگ ہو گئی۔ گھر واپس آکر میں خوب روئی۔ امّاں ناکامیاں سہنے کی عادی تھیں۔ چپ چاپ اسٹوو کے پاس اکڑوں بیٹھ کر چار اونٹنے لگیں۔ میں آنسو بہاتی رہی۔ کافی رات گئے بہار صاحب دم دلاسہ دینے تشریف لائے۔ کہنے لگے ہوٹنگ فلاں قوّالی گروپ کے آدمیوں نے کی تھی وہ تم کو بالکل لائن سے باہر کر دینا چاہتے ہیں۔ ابّا نے ٹین کی کرسیاں برآمدے میں ڈالیں جو ساری چال کا کومن ورانڈہ ہے بہار صاحب ایک پنا ما سُلگا کر بولے۔ فلم بنانے کے لیے ایڈل جی کو پٹا رہا ہوں بیلا پر پرنس گلفام کا بڑا احسان ہے۔ بیچ گنی بھیج کر اس کی زندگی بنا دی۔ ان کی حالت بہت سقیم ہو چلی ہے۔ ان کے احسان کا بدلہ یوں چُکا سکتے ہیں کہ پکچر ان سے ڈائریکٹ کروائیں اور باپ کا رول بھی وہی کریں۔ دیوتا زبارہ بنکوی کے نام سے کہانی اور مکالمے میں

لکھنے شروع کرتا ہوں۔ بس اب ایڈل جی سے روپیہ لینا باقی ہے۔ اس وقت تک مشاعروں کی آمدنی پر گذر کیجیے۔

"ان کے جانے کے بعد ابّا، امّاں، گلّو تینوں سو رہے پتی ورتا امّاں اب فرش پر سوتی تھیں۔ کیونکہ ابّا ضعیف ہو چلے۔ ان کو آرام کی ضرورت تھی۔ وہ مسہری پر اور گلّو اس کی چھت پر۔ میں مسہری کے نیچے۔

"میں کرسیاں اٹھانے باہر گئی تو وہیں جنگلے سے ٹِک کر پھر رونے لگی۔

"ہم لوگ پانچویں مالے پر رہتے ہیں۔ اسی مالے کے سرے پر نصراللہ کی کھولی تھی۔ نیچے احاطے میں ایک اندھا کنواں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسمگلر اپنا مال لا کر اس میں چھپا دیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں اوپر سے دیکھیے تو وہ بہت خوفناک لگتا ہے۔

"میں جنگلے پر جھکی اسی کنویں کو تک رہی تھی کہ آہٹ ہوئی۔ گھُپ اندھیری رات۔ ساری چال میں سنّاٹا۔ دیکھا تو آسیب کی طرح سفید چوغہ پہنے بوڑھی حنّہ سامنے موجود۔ وہ اکثر ساری رات اپنی آرام کرسی پر گذار دیتی تھی جو اس کے کمرے کے سامنے ورانڈے میں رکھی رہتی تھی۔" بولی۔ چھوکری روتا کیوں ہے باؤڑی میں کُودی مار—

"میں سہم گئی۔ وہ کہتی رہی — بات سنو۔ لائف میں یا بیڈ لک ہے یا گُڈ لک تیسرا کچھ نہیں۔ ہمارا ہزبنڈ عراق سے ادھر چلا آیا۔ وہی دن دوسرے جہاز سے اس کا بھائی امریکہ چلا گیا۔ اس کا فیملی اُدھر عیش کرتا ہے۔ میں نے پچّاس برس اس کھولی میں نکال دیا۔ ہمارا لک نہ بدلا۔ ہمارا چھوکرا ٹیکسی ڈرائیور ہی رہا۔ سرڈیوڈ سیسُون کے موافک بوہے کا بڑا سیٹھ نہ بنا۔ اب ہمارا گرینڈسن اسرائیل آرمی میں چلا گیا ہے۔ اگر اس کا بیڈ لک ہے مارا جائے گا۔ گُڈ لک ہے زندہ رہے گا۔ بُڈھّا ہو کر مرے گا۔

"ہم ہمیشہ اپنا بائیکلہ کا مسجد میں جا کر دُعا مانگتا ہے کہ اگلے سال یروشلم۔ اب اگر ہمارا گُڈ لک ہے۔ اگلے برس ہم یروشلم میں بیٹھا ہوگا۔ ورنہ ادھر ہی مرجائے گا۔ ینگ گرل کو ہنسنا مانگتا۔ تُو ہمیشہ روتا ہے۔ اگر ہنسنے کا کوئی چانس نہیں تیرے کو دِکھتا تو بھی اس

باؤڑی میں کُودی مار۔ بیڈ لک ہے تو گرتے ہی پٹ سے مرجائے گی۔ گُڈ لک ہے تو گولڈ بسکٹ پر ہاتھ پڑے گا۔ نکال کر اوپر لے آنا۔ اس دیوانی ضعیفہ نے میرے کندھے پر اس طرح ہاتھ رکھا جیسے نیچے دھکا دینے والی ہو۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ وہ عربی میں بڑبڑاتی اپنی آرام کرسی کی طرف چلی گئی۔

"چند روز بعد وہ مرگئی۔ اس کی بہو روزآ نے مسکرا کر بتایا۔ ماما پورے سَو سال کی تھی مگر عمر چھُپا کر نوّے سال بتاتی تھی۔

"پانچ چھ مہینے بعد داؤد بھائی، روزآ اور ربیکا اسرائیل ہجرت کر گئے — گلّو واپس آ تے۔

"پوچ کھانا والا کا خط آیا ہے۔ وہ روپیہ لگانے کے لیے تیار ہے۔ ہم لوگوں کو فوراً بلایا ہے۔ کہانی پر بیٹھنے کے لیے۔"

"اوہو — ونڈرفل۔ مبارک ہو۔ مگر کہانی پر کس طرح بیٹھتے ہیں؟"

"نیور مائینڈ — بات سنیے۔ میں ایک دوکان سے فون کر رہی ہوں۔ ابھی ابھی میں نے امّاں سے کہا میں کسی پچر وکچر میں کام نہیں کروں گی۔ اس پر انہوں نے مجھے خوب مارا۔"

"مارا؟ پرسوں پکنک پر تم نے کسی مار پیٹ کا ذکر نہیں کیا۔"

"کرتی کیسے۔ گلّو جو سر پہ سوار تھے۔ امّاں کہنے لگیں۔ قنبر میاں کے جھّرے میں نہ آنا۔ ہم ان رئیسوں کو خوب جانتے ہیں۔ ڈومنی سے اگر نکاح کر بھی لیں چند روز بعد چھُٹی —"

نکاح بیاہ کا یہ کون تذکرہ تھا۔ قنبر علی سٹ پٹا گئے۔ نروس ہو کر پھر ہکلانے لگے "بھ — بھئی — ہم نے تو — یعنی کہ — ہم نے تو کچھ بھی نہیں کہا —"

"امّاں تو سمجھ گئی ہیں۔ ابّا۔ عبدالرحمٰن بیکری والے۔ پاس پڑوس کے لوگ۔"

قنبر میاں کو ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔

"اب یہ چاہتے ہیں فوراً مجھے یہاں سے لے جائیں بمبئی۔"

"مشورے ہو رہے ہیں آپس میں بھیجتے ہیں ہمیں بنارس میں
— مثنوی زہرِ عشق!"

"آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"

"بھئی تم ضرور بالضرور واپس جاؤ۔ اسٹار بننے کا سنہرا موقع ہے۔"

"آپ کیسے پروگریسو آدمی ہیں؟ میرا پورا قصہ سننے کے بعد بھی یہ کہہ رہے ہیں؟
آپ جانتے ہیں پوچھ کھانا والا سرمایہ داروں کا سرمایہ دار ہے۔ وہ خوفناک بوڑھا۔"

"تم تو کہتی ہو تمہاری والدہ نے اور تم نے ہمیشہ نہایت شریفانہ زندگی گزاری۔"

"بیشک۔ مگر اب حالات مختلف ہیں۔ ارے آپ کتنے بزدل نکلے۔ آپ کا
انقلاب وغیرہ سب کھوکھلے نعرے ہیں۔ میں نے تو آپ کو سچا کھرا انقلابی سمجھا تھا۔"

قنبر علی ایک منٹ تک سوچا کیے۔ وہ ہلو — ہلو — کرتی رہی پھر بولی —
"باندرہ کے راستے کی جھونپڑپٹی میں ایک جگہ بیحد غریب طوائفیں رہتی ہیں۔
وہ رات کو جب لوکل ٹرین گذرتی ہے۔ اپنے دروازوں پر لالٹین لے کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔
آندھرا میں یا کہیں اور قحط پڑتا ہے ان کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ایک جگہ پر ان کا نیلام
ہوتا ہے میڈم لوگ بولی بول کر ان کو خریدتی ہیں۔ سرمایہ داری کا وہ سب سے بھیانک
روپ ہے۔ مگر اس کے سہانے روپ بھی اندر سے اتنے ہی ہولناک —"

اچانک قنبر علی نے مضبوطی سے کہا "اچھ — اچھّا — تم سن — سنیچر کی
شام سا — سات بجے ڈالی گنج والی سڑک پر جہاں برگد کے نیچے چڑی مار پنجرے لیکر
بیٹھتے ہیں وہاں آجاؤ۔ پر یزادے کو کسطرح کاٹو۔"

"آجکل ابّا اور گلّو مغرب پڑھنے مسجد جاتے ہیں اور عشاء پڑھ کر لوٹتے ہیں۔

وہی بہترین وقت ہے۔ مگر آپ وہاں آجائیے گا ضرور — یہ میری زندگی اور موت
کا سوال ہے —"

"بیلا۔ ڈائیلاگ مت بولو — پلیز —" قنبر علی نے جھنجھلا کر ریسیور رکھا اور
ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھے رہے۔

ڈبل بیرل نام والے راجہ رگھوبیر پرشاد سنگھ کا مسوری میں اسکول مختلف تھا مگر
اسکاؤٹنگ میں قنبر علی کے ساتھی رہ چکے تھے۔ یار باش انسان تھے اور حالانکہ
سیاست سے ان کو قطعی دلچسپی نہیں تھی اور قنبر علی بنیادی طور پر سیاسی آدمی تھے۔
راجہ رگھبیر پرشاد سنگھ ہی قنبر علی کے انتہائی وفادار دوست تھے۔ یہ وفاداری ان کی
فیوڈل سرشت میں داخل تھی۔ بوائے اسکاؤٹ رہ چکے تھے۔ اور اولڈ اسکول راجپوت
اور شکاری تھے۔ کسی پر خطر مہم کا ذکر سنکر ان کی آنکھیں چمک اٹھتی تھیں۔ قنبر علی کا فون
آیا۔ "یار ایک سماج کی ستائی ابلا کو بچانا ہے۔ تم اس مہم میں ہمارا ساتھ دو گے —؟"
"گلے گلے پانی —" جواب ملا۔
"شام کو ریڈ روز آجاؤ۔"

"پہلے یہ بتلاؤ تم کو وہ لڑکی پسند ہے؟" نوجوان ٹھاکر نے صوفے پر بیٹھتے ہوتے
دریافت کیا۔ عید ؤمے نوشی کے لوازمات سنگ سبز کی میز پر رکھ گئے۔
"ہے تو۔"
"اس کے ماں باپ خوش نہ ہوں گے کہ انکی بیٹی اونچے گھرانے کی بہو بن جائیگی
اور اتنے بیوقوف آدمی کی بیوی۔"
"فلمی ماں باپ؟ تم انکی ذہنیت سے واقف نہیں۔" قنبر نے جام اٹھاتے
ہوئے ایسے تجربہ کار انداز میں کہا گویا پیدا ہی فلمی ماحول میں ہوتے تھے۔ اسوقت

انکو اپنی آزادی کے احساس نے بہت مسرور کیا۔ والدین کی زندگی میں مجال تھی جو اس دھڑلے سے گھر پہ بیٹھ کر شراب پیتے اور ایک نوٹنکی والی کو اغوا کر کے اسے بیاہ لانے کا پلان بناتے —— دوسرے لمحے میاں جان اور امّی جنیاں کی وفات پر اس طرح خوشی منانے کے کمینے پن پر نادم ہوتے۔ رگھبیر سنگھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے جام اٹھایا۔

"کامیابی کے نام ——" دونوں نے نعرہ لگایا۔

"اچھا۔ اب ترکیب نمبر ایک۔" کچھ دیر بعد قنبر پھر گویا ہوتے۔ "ڈاکٹر جانکی نندن کو جانتے ہو۔ ہمارا پرانا یار ہے۔ اس نے اپنا کلنک کھول رکھا ہے مع آپریشن تھیٹر ——"

"او مائی گوڈ —— یہ چکر ہے؟" رگھبیر پرشاد نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی۔ لاحول ولا قوہ۔ بات تو سنو۔ بیلا ایکٹنگ کریں گی کہ انکے پیٹ میں اٹھا ہے زوروں کا درد۔ ہمیں فون کروائیں گی۔ ہم جانکی کو بھیجیں گے وہ بتا دینگے اپنڈی سائیٹس۔ فوراً اپنے کلنک لے جا دینگے۔ ماں باپ اور بھائی باہر بیٹھے رہیں گے۔ آپریشن تھیٹر کے اندر سفید ماسک سفید ایپرن پہنے دولہا مولوی اور گواہ موجود۔ فوراً سے پیشتر عقد اور ہم دونوں غائب۔"

"اور اسکے بعد فراڈ اور اغوا کے الزام میں تم اور جانکی نندن گرفتار۔ شاباش۔ قنبر علی ہمیں افسوس ہے کہ تم زیادہ کند ذہن ہوتے جا رہے ہو۔ اور ان فلمی لوگوں کی سنگت میں رہ کر سینما کا اثر بھی تم پر ہو گیا ہے۔ تم نے یہ ایکدم تھرڈ کلاس پکچر کا سینریو تیار کیا ہے۔ فرگٹ اٹ۔"

"پھر کیا کریں؟" قنبر نے منہ لٹکا کر پوچھا۔

"ہمیں ذرا سوچنے دو۔" رگھبیر پرشاد سنگھ گلاس ہاتھ میں لیکر صوفے پر نیم دراز ہوتے۔ آنکھیں موندلیں۔ پندرہ منٹ بعد اٹھ بیٹھے۔ اور پوچھا "بیلا بالغ ہیں؟"

"بالغ سے بہت زیادہ۔ پچیس چھبیس سال کی تو ہوں گی۔"

"ہم اپنے چنہٹ والے بنگلے پر رکھیں گے ایک عدد اندر سبھا۔"

"واہ۔ ع جو گن آتی ہے پری بن کے پرستان کے بیچ ——!"

"دوسری منزل پر مولوی گواہ موجود۔ خفیہ۔ لیکن اس کلوک اینڈ ڈیگر بزنس سے قبل تم ایک بار ماسٹر جی سے بات کر لو۔ اگر وہ منع کریں تب۔"

"ماسٹر جی فلمی باپ ہیں۔ لالچی اور خود غرض۔ پوپچ کھانا والا کے روپئے پر عیش کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کہتے ہو وہ پیشہ ور دلاّل نہیں شریف آدمی ہیں۔"

"بیشک۔ لیکن ——"

"یار یہ پوپچ کھانا والا عجیب وغریب نام ہے۔ جیسے ہمارے کے ہاں وہ شیریں کاسل والے مسٹر آدی دادا بھوتے ڈھونڈی ——"

"اور انکے داماد۔ کیپٹن کیٹپن ——"

"بھانجے —— ڈاکٹر روسی انجینئر اور فرہاد انجینئر۔"

"مسز مانک بائی ڈھونڈی کے بھائی کا اسم شریف ہے مسٹر کیکی لال کاکا ——"

"ہاہا —— ہاہا —— ہو —— ہوہو —— کیکی لال کاکا —— ہوہو —— ہو ——"

"رگھبیر پرشاد۔ خفیہ اسکیم پر غور کرو ——"

وہ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"اچھا۔ تو بیلا اینڈ پارٹی شہر سے آن کر نیچے ہال میں بیٹھے گی۔ اندر سبھا کیلئے ہم دو تین پاتریں بھی بلوائیں گے۔ ٹھیک سات بجے ہماری رُوپا مہری زینے پر سے بیلا کو سگنل دے۔ بیلا اپنی ماں سے کہیں۔" رگھبیر پرشاد نے باریک آواز میں نقل کی "ممی میں میک اپ ٹھیک کرا آؤں" —— فوراً خیال آیا اگر یہ لڑکی انکے عزیز دوست کی لائق احترام بیگم بننے والی ہے اسکے لیے اس قسم کا رویہ مناسب نہیں۔ قنبر پلان سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔ اس باریکی پر انکا دھیان نہیں گیا۔

"دیکھو بنگلے میں ایک باتھ روم گراؤنڈ فلور پر ہے ایک اوپر۔" راجہ صاحب نے ماچس کی ڈبیا تپائی پر رکھ کر تیلیوں کے ذریعہ نقشہ سمجھایا۔ "نیچے والے کے

فرش پر پانی بھرا ہوگا۔ رُوپا بیلا سے کہے گی اوپر چلی چلیے —"
آہٹ ہوئی۔ عیدو بھُنے تیتر اور کباب میز پر رکھ گئے۔ قنبر نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔

"مگر یار اس اسکیم میں بھی کھانچہ پڑ رہا ہے۔" رگھبیر پرشاد نے سوچ کر کہا۔
"پرفیکٹ ہے۔ یار تم نے تو گلے گلے پانی کا وچن دیا ہے۔ کیسے بوگس راجپوت ہو۔"
ٹھاکر کو جوش آگیا۔ کڑک کر بولے" — DONE — "ایک کباب اٹھایا۔
اچانک چلاّئے — "اوہو۔ منشی بھوانی شنکر سوختہ۔ جو اُڑتی چڑیا کے پَر گنتے ہیں۔"
"پھر الٰہ آباد —"
دونوں نے دوبارہ گلاس بھرے اور مزید سوچ بچار میں مستغرق ہوئے۔

تیسرے روز معراج احمد چیف رپورٹر فوٹو فیچر کی تصاویر لے کر بیلا کے جائے قیام پر پہنچے۔ قنبر نے ایک تصویر کی پُشت پر مخفف پیغام تحریر کر دیا تھا۔

وقت مقررہ پر بیلا ڈالی گنج میں طے شدہ مقام پر نظر آئی۔ وہ ایک بوڑھے چڑیمار کی بہنگی کے نزدیک اکڑوں بیٹھی تھی۔ پرند فروش نے خاکی رنگ کا شکستہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ نیچے کو جھکی سفید مونچھوں اور لمبی چھدری سفید داڑھی والے اس پیرِ مرد نے دو لال پنجرے سے نکال کر حسب دستور خریدار کے سر پر سے تصدق کیے اور بیلا نے ان کو اپنے ہاتھ میں لیکر اُڑا دیا۔

اس کربناک اور پُر تاثیر منظر سے قنبر علی بہت مضطرب ہوتے۔ وہ کچھ فاصلے پر اپنی کار میں منتظر تھے۔ چند منٹ بعد بیلا دوڑتی ہوئی آن کر اگلی سیٹ پر ٹک گئی۔ راستہ سنسان پڑا تھا — کبھی کوئی ٹھیلے والا ترکاری بیچتا ہوا گذر جاتا۔ چند کمہارنیں چادر پر مورتیاں اور نقلی پھل سجاتے چُپ چاپ بیٹھی تھیں۔ دور ہنومان جی

کے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ قنبر نے پلان کی تفصیلات ذہن نشین کرائیں۔
وہ کار سے اتری۔ شیخ صاحب زن سے تاریکی میں غائب ہوگئے۔
دوسرے دن ٹھاکر رگھبیر پرشاد سنگھ کے مشیر خاص کالے خاں عبدالرحمٰن بیکری والے کے ہاں پہنچے۔ "معلوم ہوا آپ لوگ بمبئی واپس جا رہے ہیں۔ راجہ صاحب تو بنگلے پر آپکی اندر سبھا رکھنا چاہتے تھے۔"

پہلے زمانے میں بہلیوں پر سوار اندر سبھا کے طائفے جنگل میں منگل لگانے اس دو منزلہ گارڈن ہاؤس پر پہنچتے تھے۔
راجہ صاحب کی موٹر کار بمبئی کے آرٹسٹوں کو شہر سے لے آئی — ہال میں سب نقشہ فٹ تھا۔ مہرے اور مہریاں مستعد۔ پھاٹک پر لٹھ بند چوکیدار۔ تین کٹوری ہاؤس کی طرح یہاں بھی چنبیلی بیگم نے ملاحظہ کیا کہ پُرانا رئیسانہ ماحول ہنوز بہت حد تک برقرار تھا — گندھروجاتی کی باگیشوری دیوی مع پارٹی اپنے گاؤں سے آچکی تھیں۔
پاتروں کو دیکھ کر چنبیلی بیگم بہت حیران ہوئیں۔ اتنا طویل عرصہ بمبئی میں گزار کر ان کو پاتریں یاد ہی نہ رہی تھیں۔ شہر سے مہمان ابھی نہیں پہنچے تھے۔ بنگلے کے ہال کے اندر بیلا سبز پری کے میک اَپ میں جگمگا رہی تھیں۔ اور سے
اب چاہ سے یوسف کو نکلواؤ ہمارے۔ اندھیرے میں گھُٹتا ہے دلآرام ہمارا
الاپتی تھیں — گلاب پکھراج پری کے بھیس میں اِتراتے پھر رہے تھے۔ جگوترا کڑھوالی کالا دیو بنے تھے۔ چنبیلی بیگم پلاسٹک کے پَر درست کر رہی تھیں۔
"اسی لکھنؤ کے اندر اختری بائی والی اندر سبھا میں تمام پَر اصلی استعمال کیے گئے تھے۔ چڑیوں کے پَر۔ انکو مختلف رنگوں میں رنگا تھا۔" ماسٹر موگرا نے آہ بھری۔

تہمد اور پھٹی قمیصیں پہنے ننگے پاؤں سیاہ فام دیہاتیوں کی ایک ٹولی

وارد ہوئی۔ وہ پانچ تھے اور ایک ننھا سا کالا بچہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

"سلام علیکم کالے خاں بھائی —" ٹولی کے لیڈر نے آواز دی۔

کالے خاں برآمدے سے اترے۔ "او ہو حنیف بھائی — آؤ — آؤ — وعلیکم السلام۔"

"ہم کا مالوم پڑا راجہ صاحب کے ہاں آج اندر سبھا ہے۔ ہم ہُو چلے آئے —" وہ پانچوں برساتی کے فرش پر بیٹھ گئے۔

موٹر سائیکل پر سوار معراج احمد چیف رپورٹر رسالہ ریڈ روز بھی آن پہنچے۔

"قنبر میاں تشریف نہیں لاتے ؟" چنبیلی بیگم نے اندر سے جھانک کر پوچھا۔

"پریس کانفرنس کے لیے دلّی تشریف لے گئے۔ اتوار تک لوٹینگے۔ تم لوگ ٹھاکر صاحب کا انتظار نہ کرو —— وہ ذرا دیر میں پہنچیں گے۔ مہمانوں کو سناؤ۔" کالے خاں نے بھاٹوں سے فرمائش کی۔

انہوں نے اپنی اپنی بیڑیاں بجھا کر کانوں کے پیچھے رکھیں۔ لڑکا بندر کے بچے کی طرح ان کے حلقے میں چُپ بیٹھا رہا۔ وہ پانچوں اس کے باپ چچا اور ماموں تھے۔ وہ ان کی آوازیں سنتے سنتے بڑا ہوگا تو اسی طرح آلہا اودل سنا کر اپنی روزی کمائے گا۔ جس طرح استاد موگرا نے اپنے باپ چچا اور ماموں سے اپنا فن سیکھا تھا۔

ان کے قائد حنیف نے ایک سانس میں روانی سے شروع کیا ——

اُتر گئے گڑھ بہرائچ۔ دھن گئے شاہ مدار۔
پُوروی گئے نگر ایودھیا جیہہ ما رام لیہن اوتار۔

معراج احمد نے بہار پھولپوری سے کہا — "اچھا ہوا ہم آ گئے۔ ہم فوک آرٹسٹوں پر ایک فیچر چھاپ رہے ہیں۔"

"آلہا بیٹھے ہیں جمنا پر۔ سنورے بھیا ہمری بات
علیؑ علیؑ کرکے سیّد دوڑے لے علیؑ مرتضےٰ کا نام
تیغا مار دیہن چھتری پر موٹر گرے کھیتن میں جائے
سیّد حکم لگائین آلہا پر سنورے بیٹا ہمری بات
سنکٹ کاٹے ملہنا کے آئے نگر ہوبے کے میدان ——"

آواز ہال میں پہنچی۔ چنبیلی بیگم مع بیلا پھر دروازے میں آگئیں۔

"اماں یہ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

"ارے تم کیا جانو بمبئی کی چھوکری۔ جاؤ اندر بیٹھو۔" چنبیلی بیگم ذرا پریشان تھیں مہمان اب تک کیوں نہیں آئے۔ مگر یہ وقت کے پابند اہل بمبئی تھوڑا ہی ہیں۔ یہاں تو بالکل دیہاتی گڑھی والا ماحول تھا۔ رات بھر بیٹھے آلہا ہی سنتے رہیں گے۔

"تین لاکھ کے پرتھی آوا ندیا ڈیرا دیا ڈلوائے
مار بھگائین پرتھوی راج کو ٹٹوا ٹر یہو چھنائے
آلہا بولے اب سیّد سے سنورے چاچا ہمری بات ——"

معراج میاں نے جھک کر بہار صاحب سے کہا — "بھئی بہار صاحب آپ تو بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ یہ سیّد صاحب کون تھے جو آلہا اودل کے منہ بولے چچا بنے تھے اور ان کی حمایت میں پرتھی راج سے لڑے —؟"

"ارے صاحب ساری علیت تو فلمی گیت لکھتے لکھتے غت ربود ہوئی۔ سنتے ہیں بنارس کے کوئی تالار سیّد تھے۔"

"بہار صاحب اس وقت بارھویں صدی میں سادات بنارس کہاں جا پہنچے ؟"

"شاید قنوج کے سیّد رہے ہوں۔ سالار مسعود غزنویؒ کے ساتھ وہاں آن بسے
تھے۔ وہی بنارس میں بھی آباد ہوئے۔ یا قرا معلّی۔"

"بہار صاحب ——"

"بھائی آہا سننے دیجئے۔ پھولپور سے آنے کے بعد آج کان میں پڑی۔
ہم ہوم سِک ہو رہے ہیں۔"

"جی ہاں مگر ایک بات بتلایئے۔ ان بھاٹوں نے صدیوں سے اپنے آپ کو
لوک لور اور ویر گاتھا کا محافظ مقرر کر رکھا ہے اور یہ بھوکے رہتے ہیں اور یہ بھی
نہیں جانتے کہ ایک اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں ——"

برساتی کے باہر سارس پیڑوں کے جھنڈ پر اتر رہے تھے۔ حنیف خاں کی زبان
سے الفاظ نیاگرا آبشار کی طرح گرتے رہے ——

بہار صاحب سگریٹ کے کش لگایا کیے۔ پھر کہا۔

"اچھے سرپرست زمینداروں کے زوال کے بعد یہ بھوکے نہیں رہیں گے؟"

"بہار صاحب اس ملک کا واحد اور ہمہ گیر علاج صرف ایک ہے۔ کمیونزم۔"

بیلا برآمدے میں نکل آئی تھیں اور دلچسپی سے یہ گفتگو سن رہی تھیں۔

"آئیے آئیے۔" کالے خاں کرسی سے فوراً اٹھے۔

"معراج صاحب آپ بھی کمیونسٹ ہیں —— اور قنبر صاحب بھی؟"

سبز پری کمیونزم پر سوال کرتی عجیب لگی۔

"کارڈ ہولڈر تو ہم لوگ بالکل نہیں ہیں —— البتہ ——"

"کمیونزم میں یقین تو رکھتے ہیں؟"

"بالکل —— قنبر میاں نے تو یہ بھی فیصلہ کر لیا ہے کہ کوٹھی مع باغ پارٹی کو دیدی جائے۔
آج ہی کل میں اس کے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔"

بیلا چونک پڑیں۔ "پارٹی کو ——؟"

"جی ہاں قنبر صاحب اور ہم لوگ مل کر ایک نئی پارٹی بنا چکے ہیں۔ ریڈ روز پارٹی۔
اس کے ٹکٹ پر قنبر صاحب الیکشن بھی لڑیں گے۔"

اندر باگیشوری دیوی نے الاپنا شروع کیا اب رت آئی سیّاں بیناڈولن کی۔
پنکھا جھلنے کا موسم آیا ——

بیلا نے گھبرا کر گھڑی دیکھی۔ سوا سات۔
ہال میں واپس گئیں۔

روپا مہری اندر آئی۔ اس سے کہا —— "باتھ روم ——"

"چلیے ——"

"اماں ہم ابھی آتے ہیں۔ ذرا میک اپ بھی ٹھیک کر لیں۔" اپنا بیگ اٹھا کر مہری
کے ساتھ ہال کے باہر گئیں۔ چند منٹ بعد ناک بھوں چڑھاتے لہنگا ٹخنوں سے ذرا اونچا
کیے الٹے پاؤں لوٹیں۔ "توبہ اماں۔ غسلخانے میں پانی ہی پانی۔ پاتروں کے بچے وہاں
چھپک چھیّا کھیل رہے ہیں۔"

روپا مہری نے کہا۔ "اوپر چلی چلیے۔"

دوسری منزل پر پہنچتے ہی پلاسٹک کے پردے اتارے۔ مہری ایک بند کمرے
میں لے گئی جہاں قنبر علی، ایک مولوی صاحب اور دو گواہ مع کالے خاں موجود تھے۔ ٹھاکر
رگھبیر پرشاد سنگھ باقاعدہ پستول لیے دروازے میں ڈٹے کھڑے تھے۔ کمرے میں بڑی

گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ قنبر نے مخاطب کیا: "بھئی یہ کالے خاں تمہاری طرف سے وکیل ہیں —"

"چُپ رہیں۔ کالے خاں نے کہا: "شرائط کیا ہیں؟ قنبر بھیّا؟"

"بھئی شرطیں کیا ہوں گی۔ یہ تو خوشی اور محبّت کا سودا ہے اور ہم درویش آدمی۔"

"مہر کتنا —؟"

"شرعی — ہم تو کوئی مال و متاع نہیں رکھتے۔ سب جنتا کے لیے وقف کرنے والے ہیں۔"

"قنبر صاحب میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں اس کمرے میں چلے چلیے۔"

کُرسی سے اٹھیں۔ کالے خاں بھی کھڑے ہو گئے۔

"نہیں خان صاحب آپ نہیں۔ آیئے قنبر جی۔"

قنبر حیرت سے ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گئیں۔

"ریڈ روز آپ کو میرے مہر میں لکھنی ہو گی۔"

"کیا —؟"

"جی۔ قوم سے زیادہ آپ کے بیوی بچّوں کا اس پر حق ہے۔ آپ کی یہ اول فول بہت سُن چکی ہوں۔ انقلاب اور فلاناڈھماکا۔ آل بلڈی نون سنس۔ آپ پرائیوٹ پراپرٹی میں تو یقین ہی نہیں رکھتے نا اور میں اپنی نانی جعفر باندی اور ماں اللہ جلائی عرف چنبیلی کی طرح ایک منٹ کے نوٹس پر محل بدر ہونے کو تیار نہیں —"

"مگر بھئی —" قنبر کا منہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ زبان میں شدید لکنت پیدا ہوئی — "تم۔ تم سے ہم نے کب۔ کہ۔ کب کہا تھا شادی کرنے کو — تم ہی نے ہا — ہا۔ ہم سے کہا۔"

تاریک پہاڑی راستوں پر چلنے کے عادی چکوترا گڑھوالی دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے۔

بالائی برآمدے میں ادھر اُدھر جھانک کر کمرے کی کھڑکی کے نزدیک دُبک گئے۔ وہ کالے دیو کے بھیس میں تھے۔ چہرے پر کاجل پوت رکھا تھا۔ سیاہ پوشاک۔ اندھیرے میں راجہ رگھبیر پرشاد کو دکھلائی نہ دیئے۔

"آپ قول دے چکے ہیں۔"

"قو — قول — کیسا —؟"

"آپ نے اس روز کار میں پلان بتلاتے وقت کہا تھا۔ آپ میری ہر شرط مان لیں گے۔ کہا تھا یا نہیں —"

"ہمارا تو اس طرف خیال ہی نہیں گیا تھا۔ ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم — تم — اتنی — اتنی —"

"یہ آپ کے باپ دادا کی جائیداد میں آپ کی اولاد کے لیے بچانا چاہتی ہوں تاکہ آپ بیوقوفی میں آکر اسے ریڈ روز پارٹی کے نام نہ لکھ دیں۔ کیسا ریڈ روز اور کہاں کا لال گلاب۔ چلیے ادھر نکاح پڑھوایئے۔"

چکوترا گڑھوالی گھبرا کر بسرعت زینے کی سمت بڑھے وہاں ان کو راجہ صاحب ڈیوٹی پر کھڑے دکھلائی دیے۔ واپس مڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ برآمدے پر پاؤں ٹکا کر پہاڑی اُدو بلاؤ کی طرح پرنالے پر اترے اور جست بھر کر پائپ کے ذریعے برساتی میں واپس پہنچ گئے۔ دم بخود رہے۔ یہ رئیسوں کا معاملہ ہے۔ اور عورت کا چکّر۔ فی الحال چُپ سادھے رہنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ پھنس جاؤ گے بچو۔ انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہاتھوں کی گرد صاف کرتے جا کر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔ جیب سے بانسری نکالی اور دھیرے دھیرے مدھو مادھوی راگنی بجانے لگے۔

عقد کے فوراً بعد شیخ و بیگم قنبر علی خانہ باغ کے عقبی زینے پر پہنچے۔
ٹھاکر رگھبیر پرشاد سنگھ وہاں پہلے سے چوکس کھڑے تھے مع پستول۔
کار کا دروازہ انہیں نے ہاتھ بڑھا کر کھولا۔ نقاب پوش حسینہ سوار ہوئی۔ قنبر علی اور ان کے مہم پسند خواجہ تاش نے مسکرا کر انگلیوں سے بوائے اسکاؤٹ والا کامیابی کا سگنل ایک دوسرے کو دیا۔ قنبر علی نے کار اسٹارٹ کی۔ اماوس کی کالی رات میں غائب ہو گئے۔ آگے جا کر شاہجہاں پور بریلی والی شاہراہ کا رخ کیا اور کاٹھ گودام روانہ ہوئے — اور مسکرا کے فرمایا —
"موتن شائن تھیٹریکل کمپنی آف کاٹھ گودام کی اندر سبھا کا — ڈراپ سین!"

معاملہ اتنا نازک تھا کہ نینی تال میں پہلے سے بکنگ نہیں کروائی تھی۔ پہنچنے پر معلوم ہوا کسی اچھے ہوٹل میں جگہ نہیں۔ مجبوراً رات گئے راجہ صاحب تین کٹوری کے ہوٹل پر وارد ہوئے۔

بابو کالی چرن رستوگی منیجر ان کو ان کے بچپن سے دیکھتے آتے تھے۔ بیرسٹر علی اور ان کی بیگم کی زندگی کے آخری دنوں میں رانی صاحب کے ایما پر انہیں نے منشی سوختہ سے دریافت کیا تھا کہ ببی میاں کی شادی کے ساتھ ہی اگر صفیہ بٹیا اور قنبر میاں کا عقد بھی ہو جائے تو اس ہوٹل میں ان کے لیے بھی کمرے آراستہ کروا دیں۔ اب کیا دیکھتے ہیں کہ صاحبزادے ایک برقعہ پوش کو ساتھ لیے کھڑے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ رئیس باپ کے مرنے کے بعد بیٹے بدراہ ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسی بیغیرتی بھی کیا کہ خود ہوٹل تین کٹوری میں کسی آوارہ لڑکی کو برقعہ اڑھا کر لے آتے۔ بوڑھے منیجر نے رجسٹر ان کے سامنے نہیں سرکایا۔ انہوں نے ذرا کانپتے ہاتھوں سے خود ہی مسٹر اینڈ مسز اس پر لکھا۔ بڑے میاں کو اور زیادہ غصہ اور شرم آئی۔ شرفا کی اس بلند پایہ مہمان سرائے میں ایسا لفنگا پن آج تک —

نہیں ہوا تھا۔ "میاں صاحبزادے آپ سے یہ امید نہ تھی۔" انہوں نے بھنا کر کہا۔
قنبر کا رنگ فق۔
"اس وقت تینوں صاحبزادیاں بھی یہاں موجود ہیں۔ جینی۔ پپی۔ فینی بٹیا تینوں۔ منجھلی بٹیا کے میاں پاکستان سے تشریف لائے ہیں۔ صبح کو رانی صاحب اور سرکار آنے والے ہیں۔"
موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔
"اس طرف ہمارے سٹنگ روم میں بیٹھ جائیے۔ اجالا ہوتے ہی رانی کھیت نکل جائیے گا۔ ہم رومنوف ہوٹل فون کیے دیتے ہیں۔"
"ارے — ان کو نہیں —" قنبر میاں نے اور زیادہ گھبرا کر کہا۔
حاجی رحیم الدّین والے لالہ سے زیادہ خردماغ تھے۔ اور میاں جان کے پرانے دوست۔ میاں جان مرحوم ان کے لیے مقدمے لڑا کرتے تھے۔ شہر لکھنؤ میں انگریزی ہوٹلوں کی چین کے مالک تھے۔ ان کے پردادا حاجی رحیم الدین بخارا سے آئے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انگریزوں کے زمانے میں اپنے رانی کھیت کے ہوٹل کا روسی نام رکھ لیا تھا جو بہت رومینٹک لگتا تھا۔ اور آزادی سے قبل انگریزوں میں یہ ہوٹل بہت مقبول تھا۔
"رومنوف نہیں۔ ہم لوگ کہیں اور ٹھہر جائیں گے۔"
"آپ ان کو بتلا کیوں نہیں دیتے؟" بیلا نے نقاب کے اندر سے سرگوشی کی۔
"تاکہ خبر پھیل جائے اور گلاب آ کر ہمیں چاقو بھونک دیں۔"
"ارے آپ تو بہت ہی ڈرپوک ہیں۔"
"اچھا بھئی للّٰہ خاموش رہو۔ تینوں کٹوریاں بھی یہاں موجود ہیں۔ یا اللّٰہ ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے۔ اتنی بارش۔ اندھیری رات اور یہ خطرناک پہاڑی راستے۔ ہر طرف پھسلن ہی پھسلن۔ کیا پتہ راستے ہی میں کار لڑھک کر کھڈ میں جا گرے۔ رانی کھیت سے پہلے ہی بیلا رانی کھیت رہیں۔"

"خدا نہ کرے۔ ٹھیر جایئے صبح تک۔"
"جی ہاں اور صبح صبح نیچے آجائیں محترمہ صفیہ سلطان۔ بہت بُرے پھنسے۔"

رانی کھیت پہنچ کر ایک کاٹج کرائے پر لیا۔ نوکر کا بندوبست کرنے نکلے۔ بیلا نے چولہا ہنڈیا سنبھالی۔ پھر جھڑی لگ گئی۔ دن بھر گھر میں مقیّد۔ بیلا سے گانے سنتے سنتے اکتا چلے۔ اپنا پسندیدہ "اُمڈے دَل بادل شام گھٹا" بھی بور کرنے لگا۔ بااثر صحافی تھے۔ پہاڑ پر بیٹھے بیٹھے ایسا انتظام کیا کہ اس سنسنی خیز سنجوگ کی خبر پریس میں نہ آئی۔ بارش تھمتی تو بیلا خریداری کرنے نکلتیں۔ قیمتی کپڑوں کے ڈھیر لگا دیے۔ کیونکہ جس وقت ماں کے ساتھ راجہ کے بنگلے پر پہنچی ہیں صرف میک اپ کِٹ ساتھ تھا۔

پہاڑ پر گھٹاؤں نے تنبو تان رکھے تھے ایک سہ پہر کاٹج کی لاؤنج میں چاء پیتے پیتے دفعتاً قمر میاں نے دریافت کیا۔ "تمہارے گلزارِ محبت کی پوری کاسٹ سے تو ہم مل لیے۔ سوائے رابیل کمار کے۔ انکا اسم گرامی بھی صنوبر فلم کمپنی کے اشتہار میں درج تھا۔ یہ کوئی ہیرو ہیں؟"
"بہار صاحب نے نام پہلے سے سوچ لیا تھا۔ ہیرو کے لیے تلاش جاری تھی۔"
بیلا نے شوخی سے جواب دیا۔ "سو مل گیا۔"
"اچھا۔ وہ کون ہیں؟"
"یہ کیا میرے سامنے بیٹھے ہیں!"

شیخ قمر علی اڈیٹر ریڈ روز اتفاقاً ہنسے۔

---

۳ مدھو مالتی

"اصل خیر سے یہ کہہ کر سدھارے تھے کہ دلّی جاتے ہیں۔ پہنچ گئے رانی کھیت۔"
منشی جی گاؤں جاتے وقت بتلا گئے کی پہاڑ سے بھیّا کا خط آیا تھا۔"
الحمدو نے برساتی میں بچھی اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ گرمیوں میں جب بھیّا کہیں باہر جاتے سارے ملازمین کوٹھی کی مزید حفاظت کے خیال سے وہیں آکر سوتے تھے۔ پہلے محفل جمتی۔ رمضان کی بی بی پان لگاتیں۔ عیدُوا اور بھگوان دین کجریاں الاپتے۔ رمضانی داستان لندھور سناتے۔

"اے رمضانی بھیّا۔ آج ہم نے تیسری کا چاند دیکھ لیا۔ ٹوٹکا کردو۔" الحمدو نے پھر بات کی۔
انہوں نے جب تیسری کا چاند دیکھا ان کا سارا مہینہ پریشانی میں کٹا۔ چاند دیکھتے ہی رمضانی کی ڈھنڈیا مچتی۔ وہ چاندی کی کٹوری میں پانی بھر کے اس میں چونی اور ہرے پتے ڈالتے۔ الحمدو سر ڈھانپ کر مودّب ہو جاتیں۔ رمضانی اکڑوں بیٹھ کر شہزادے اور وزیرزادے کی کہانی شروع کرتے جو شکار کھیلنے نکلے اور جنگل میں انہوں نے ایک لوٹا دیکھا جس کے اندر ایک منوّر شے بند تھی اور ٹونٹی میں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے کہا میں دوسری تاریخ شب تیسری کا چاند ہوں اور بڑی تکلیف میں ہوں

اور — خود بیگم صاحبہ مرحومہ اللہ انہیں جنّت نصیب کرے تیسری کا چاند نظر آجاتے فوراً رمضانی کو بلا کر یہی کہانی سنتی تھیں اس کے بعد چاندی کی کٹوری میں

انگلیوں کی پوریں ڈبوتی تھیں اور رمضانی ان کے پاؤوں کے ناخنوں کو یہ پانی ذرا ذرا سے چھُوا دیتے تھے۔ پھر وہ مسکرا کر کہتی تھیں۔ بھیّا کو نہ بتانا۔ وہ ہنسیں گے کہ ہم وہم پرستی کے خلاف ریڈیو پر تقریریں بھی کرتے ہیں۔

"اے لو پھر نظر آ گیا کمبخت"—— الحمدو بڑبڑائیں۔

"خالہ تیسری کا چاند اتنا بڑا نہیں ہوتا۔ نہ اتنی دیر تلک رہتا ہے۔ آج شب چوتھی ہوگی——" عیدُو نے کہا۔

الحمدو کو بیگم صاحبہ مرحومہ یاد آگئیں۔ آبدیدہ ہوئیں: "کیا مُردوں کو بھی چاند ستارے نظر آتے ہوں گے:" انہوں نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

"لو۔ نظر آنا کیا معنی وہ رہتے ہی وہیں پر ہیں گے کوئی زمین کے اندر تھوڑا ہی گڑے رہ جاتے ہیں۔ وہاں سے نکل گئے کب کے۔" عیدُو نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"اے عیدُو بیٹے۔ ایسی اندھیری راتوں میں جب یہ باغ مہکت ہے۔ صاحب بیگم صاحب کہیں یہیں نہ ہوں۔ جیسے چندن کے بروا، جیسے یہ مدھو مالتی ہے یہ کوئی لڑکی ہے یا بیل——؟"

"لڑکی تو لکڑی کی بیل ہوت ہے۔" رمضانی کی بی بی نے نہایت حقیقت پسندی سے جواب دیا۔

"ایک باری منشی جی ورکش کنیا کی بات تبلاوت رہے۔" بھگوان دین گویا ہوتے۔ "لڑکی کی لڑکی۔ درخت کا درخت——"

"مدھو مالتی کے پھول رنگ بدل کر سفید سے گلابی ہو جات ہیں۔ عورتیں بھی دو رنگی۔" عیدُو نے فیصلہ کیا۔

"اے ہے اور مرد تو بڑے بھولے معصوم——" زیتون نے چمک کر کہا۔

تیز روشنی برساتی پر پڑی۔ ایک جیپ قریب آن کر رکی راجہ رگھبیر پرشاد سنگھ نیچے اترے۔ سب کھڑے ہو گئے اور کورنشات بجا لاتے۔ ٹھاکر نے جیب سے ایک سر بمہر لفافہ نکالا: "منشی جی ہیں؟"

"گاؤں گئے۔ کل آویں گے۔"

"اچھا تو امدو خالہ یہ لفافہ اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیجئے۔ منشی جی کو دیدیجئے ہمیں فوراً کلکتہ جانا ہے۔ جانے کب تلک لوٹیں۔ اور ممکن ہے بھیّا کو اس کاغذ کی فوری ضرورت پڑے۔ عدالت میں رجسٹری وغیرہ کرانی ہو۔ کیا ہو۔ ہمیں معلوم نہیں:"

"ٹھیک ہے حضور——"

وہ جیپ میں سوار ہوئے اور پھاٹک کی سمت نکل گئے۔ الحمدو لفافہ سنبھال غرارے کے نیفے سے کنجی نکالتی شاگرد پیشے پہنچیں۔ اپنی کوٹھری میں جاکر چارپائی کے نیچے سے بکس کھینچا۔ نکاح نامہ جو روانگی کی جلدی میں قنبر علی ساتھ لیجانا بھول گئے تھے، لفافہ میں بند کر کے ٹھاکر صاحب نے اس پر اپنی مہر بھی لگا دی تھی۔ الحمدو نے کپڑے ہٹا کر پیکٹ تہہ میں رکھا۔ تالہ لگایا۔ مصلّےٰ نکال کر باہر چبوترے پر نماز عشاء پڑھی۔ برساتی میں پلنگ پر آن کر لیٹیں تو دیکھا رمضانی عیدوا اور علاء الدین اپنی اپنی کھاٹوں پر خرّاٹے لے رہے تھے۔ جس طرح باڑے میں ہرن اور نیل گائے خوابیدہ تھے۔

اے لو۔ تیسری کے چاند کا ٹوٹکا تو رہ ہی گیا۔ خیر اللہ مالک ہے کروٹ بدل کر ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں وہ بھی سو گئیں۔

ایک ہفتے بعد شام کے وقت گرد سے اٹی کار آن کر برساتی میں پہنچی۔ چھت پر سامان۔ اندر سامان۔ گئے تو ایک اٹیچی کیس لیکر۔ یہ اتنے لدپھند کر کیسے آئے۔ الحمدو نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ سامنے کی سیٹ پر ایک میم صاحب۔ سر پر اسکارف۔ کالا چشمہ۔

کوٹ پتلون۔ دونوں اترے۔ "سلام امدو خالہ۔ سب خیریت؟" قنبر علی کی آواز میں
ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ خیر گھبرائے سے تو ہمیشہ ہی رہتے ہیں۔

عیدو دوڑے آئے۔ ڈکی کھولی۔ میم صاحب اسکارف اور چشمہ اتار انگلیوں سے
بال سنوارتی سیڑھیاں چڑھیں۔ سارا نجی اسٹاف بھاگا آیا۔ اتوار کا دن ۔ دفتر بند تھا۔
ورنہ عملہ ادارت بھی موجود ہوتا۔

پھنگو اور بھگوان دین نے اسباب اتارا۔ سب برآمدے میں جمع ہو گئے۔

بیلا نے انگلش پکچرز میں دیکھا تھا کوئی ینگ اینڈ ہینڈسم لارڈ کسی غریب گورنس
کو بیاہ کر اپنے کنٹری ہاؤس پر وارد ہوتا ہے تو اس کا ڈومیسٹک اسٹاف پذیرائی کے لئے
ایک قطار میں استادہ رہتا ہے۔ بٹلر۔ ہاؤس کیپر۔ ہاؤس میڈ۔ کک۔ کچن میڈ وغیرہ
کلف لگے سیاہ و سفید یونیفارم میں ملبوس سب کرٹسی کرتے ہوئے۔ یہ میل خورے کپڑوں
والے غربا و مساکین چپ کھڑے رہے۔ بھونچکے۔ یہ وہی لڑکی تو تھی نوٹنکی والی جو
بے تکی پوشاکیں پہنے فوٹو کھنچوانے یہاں آیا کرتی تھی۔ رمضانی نے زیر لب کہا ــــ

یا مظہر العجائب۔
بھیّا کی مت کٹ گئی۔

وہ ذرا درشتی سے بولے۔ "عیدو بیگم صاحب کا سامان ہمارے بیڈروم میں
لے جاؤ۔ امدو خالہ یہ ٹوکریاں اٹھائیے۔ پھل ہیں۔ رانی کھیت کے۔"

"ٹھہر جاؤ۔ میں پہلے گن لوں۔" بیلا نے آگے بڑھ کر کہا۔

قنبر علی جھینپ گئے۔

"بہو صاحب۔ یہاں ہمارے بھیّا کے باغ میں منوں آم امرود سنبھم کا فروٹ
لدا رہتا ہے ہم سیر چشم لوگ ہیں۔" الحمدو نے تلخی سے کہا۔

"او۔ کے۔ او۔ کے۔ نیور مائینڈ ــــ"

دورباغ کی سڑک پر رکشا پہنچا۔ منشی سوختہ نے اپنا سامان اتارا۔ جھک کر
صدری کی جیب سے کرایہ نکالا۔ مڑ کر دیکھا۔ وہ گاؤں سے لوٹے تھے اور بس اڈے سے
آرہے تھے۔ آگے بڑھے۔ بیلا دکھلائی پڑیں۔ وہ بھی دنگ رہ گئے۔

"آداب عرض بھوانی چچا" قنبر علی نے کھسیا کر کہا۔

"جیتے رہیئے۔"

"باتھ روم کدھر ہے ــــ؟" بیلا نے زیتون سے پوچھا۔ معاً ان کو وہ وقت یاد آیا
جب جہنٹے میں رُوپا مہری سے پلان کے مطابق یہ سوال کیا تھا ــــ دل میں ایک عجیب
سی خلش محسوس کی۔ یہ سب کیوں ہوا۔ اگر نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اچھا ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ نہ
ہوتا تو بہت بُرا ہوتا۔ میں کیا ان دو ٹکے کے نوکروں ہی کے رعب میں آگئی۔ وہ تیز تیز
قدم رکھتی زیتون کے ساتھ کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔

باتھ روم سے تازہ دم ہو کر نکلیں تو گیلری میں سے الحمدو نے آواز دی: "بہو صاحب
چائے گول کمرے میں لگا دی ہے وہیں تشریف لے چلیے۔"

یہ ہوئی نہ بات۔ بہو صاحب۔ گول کمرہ۔ تشریف لے چلیے۔ ارسٹوکریٹک
معاملات۔

گول کمرے میں جا کر لاشعوری طور پر اسی صوفے پر بیٹھ گئیں جہاں فوٹو سشن کے
دوران بیٹھتی تھیں۔

منشی سوختہ برآمدے سے گذر رہے تھے۔ قنبر علی نے انہیں پکارا: "بھوانی چچا۔"

وہ بھاری بھاری قدموں سے اندر آئے۔

"نمستے۔ سوختہ جی۔" بیلا نے فلمی انداز میں کہا۔

"جیتی رہیے۔ بہو صاحب۔" کھڑے رہے پھر بولے "معاف کیجئے گا۔ ہم ذرا اپنا
سامان بُرجی میں رکھ لیں۔ باہر پڑا ہے۔" لوٹ گئے۔

دو ہفتے گذر گئے۔ ملازمین چپ چاپ اپنے اپنے کام میں لگے رہتے۔ انکی خاموشی سے زیادہ شوہر کی بے اعتنائی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ وہ صبح نو بجے سے دفتر جا کر رسالوں میں جُٹ جاتے۔ کھانا بھی اپنے اسٹاف کے ساتھ کھاتے۔ چراغ جلے تک کام کرتے۔ اس کے بعد ڈرائینگ روم میں جا بیٹھتے۔ ادیبوں اور جرنلسٹوں کے ساتھ پینے پلانے کا دور شروع ہو جاتا۔ رات کو کہتے "کیا کریں بیلا۔ تینوں رسالے ہفتہ وار کر دیے ہیں کام بہت بڑھ گیا ہے۔"

بیلا سوچتیں اس سرد مہری کے ذریعے جو میری توہین ہو رہی ہے اس بے عزتی سے بدتر ہے جو میری ماں اور نانی برداشت کرتی تھیں جب ان کو زنانخانوں میں بیگمات کی جوتیوں کے پاس بٹھالا جاتا تھا۔ ایک بار اماں ایک بیگم کے پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں تو انہوں نے جھڑک دیا تھا — "ان کے بہت دماغ اونچے ہو گئے ہیں۔ آکر ہمارے برابر بیٹھ گئیں۔"

ریڈ روز کے نوکر بھی تو اسی وجہ سے ان کے ساتھ ایسی رکھائی سے پیش آتے ہیں۔

ایک روز انہوں نے اپنے شوہر سے یہ بات کہی۔ وہ بولے "ارے بھئی تم کو اپنے متعلق کومپلیکس ہے۔ اب یہ لوگ کیا کریں۔ تم سے بے تکلفی پر اتر آئیں تو تم شکایت کرو گی تم کو بیگم صاحبہ نہیں سمجھتے۔"

"نہیں۔ یہ بڑی عجیب سچویشن ہے۔ علاوہ سوختہ کے یہ سب کمین سمجھے جاتے ہیں مگر انہی کے طبقے کے ایک فرد کو اونچی حیثیت مل جاتی ہے تو ان کو بُرا لگتا ہے۔ یہ واقعی اپنی زنجیروں سے محبت کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں۔ آقا ہمیشہ آقا رہے۔ تم خواہ مخواہ ایک غیر طبقاتی نظام قائم کرنے کی فکر میں ہلکان ہو رہے ہو۔"

"بیلا یہ چند نوکر میرے والدین کے فیوڈل دور کی یادگار ہیں۔ ان کی اولاد جو فیکٹریوں میں کام کرے گی۔ اس کی یہ غلامانہ ذہنیت نہیں ہو گی۔ یہ مارے وفاداری کے اس قدر رنجیدہ ہیں یہ چاہتے تھے کہ اس گھر میں کوئی نواب زادی بہو صاحب بنکر آوے۔ ان

سوسیو اکنومک معاملات کا صحیح تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں بات دراصل یہ ہے کہ — کہ — نوٹنکی والے اور فلمی لوگ وغیرہ ذرا — ذرا اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے اور عوام کو ان کے متعلق بہت غلط فہمیاں ہیں۔ بدگمانیاں۔ وغیرہ اور تمہارا تعلق چونکہ — چونکہ —"

"اب زیادہ صفائی نہ پیش کرو۔"

"رہے بھوانی چچا وہ میرے باپ کے برابر ہیں۔ اگر میرے والد زندہ ہوتے ان کی خفگی بالکل ایسی ہی ہوتی۔ اور امّی جنیاں کا رویّہ یہی ہوتا جو امدو خالہ کا ہے۔ انہوں نے مجھے پالا ہے۔ اچھا تم ایک کام کرو۔ تم بہت بور ہو رہی ہو۔ ٹائپ کرنا سیکھ لو۔ ہم مزید ٹائپسٹ نہیں رکھ سکتے۔ خرچہ بڑھتا جا رہا ہے۔ اشتہار بہت کم ملتے ہیں۔ ہم اب بنک سے نکال کر رسالوں کے اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ تم ٹائپنگ سیکھ لو تو کچھ آرٹیکل تم سے ٹائپ کروالیا کریں گے۔ ٹھیک ہے؟"

بیلا خوش ہو گئیں۔ دفتر کے وقت کے بعد مس چھوٹے لال کی کرسی پر بیٹھ کر ٹائپ کی مشق شروع کر دی۔

دو مہینے اس طرح نکل گئے۔

وہ باورچیخانے کے انتظام کی ماہر تھیں کھولی میں بچپن سے کھانا پکایا تھا اور برگد تلے "چنبیلی کے ڈھابے" میں ماں کی مدد کرتی رہی تھیں۔ رمضانی کے ہاتھ کا کھانا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ ہر سالن میں ناریل ڈالنا پسند کرتی تھیں۔

رمضانی نے منشی سوختہ سے شکایت کی — سرکار مرحوم جب شکار پر جاتے تھے۔ ہم نے ان کے لیے جنگلوں میں کیلے کے پتے پر دال پکائی ہے — شاہی کے رکابدار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔ لیکن بہو صاحب نالایق سمجھتی ہیں۔

باورچیخانہ بہت دور شاگرد پیشے کے کونے پر واقع تھا۔ اس میں اونچے چولہوں

پر تپھر کے کو تلے سے کھانا پکتا تھا۔ کوٹھی میں ایک سائیڈ روم خالی پڑا تھا۔ اس میں بیلا نے موڈرن کچن بنوایا۔ سفید ٹائیل۔ سفید سِنک سفید الماریاں۔ کھڑکیوں میں سفید لیس کے جھالردار پردے۔ گلدان۔ دیواروں پر پھلوں کے اسِٹل لائف۔

ہوم اینڈ گارڈن میگزین میں باورچیخانوں کی تصویریں دیکھتی گئیں اور سجاتی گئیں۔ گیس کا چولہا لگوایا۔ زنانہ برطانوی رسالوں میں پڑھ پڑھ کر بڑھیا ولایتی بریکفاسٹ شوہر کے لیے خود تیار کرنے لگیں۔

"بھئی تم تو بہت سُگھڑ بی بی نکلیں۔" ایک صبح ناشتہ کرتے ہوتے انہوں نے مسکرا کر کہا۔ بیلا کھِل اٹھیں۔ آنکھوں میں آنسو آگئے: "شکر ہے میری کوئی بات تو پسند آئی۔"

"ارے بھئی اگر تم ہی پسند نہ ہوتیں ہم تم سے ایسی ڈرامائی شادی کیوں کرتے۔" کلف دار نیپکن سے منہ پونچھ کر دفتر کی طرف بھاگے۔

منشی بھوانی شنکر سوختہ بیرونی برآمدے میں کھڑے پوسٹمین سے ڈاک وصول کر رہے تھے۔ بیلا پاس سے گذریں۔ ان کو سلام نہیں کیا۔ علاء الدین ڈرائیور کو آواز دی۔ کار میں بیٹھ کر پھر خریداری کے لیے نکل گئیں۔ دفتر کے چپڑاسی نے ڈاک کا انبار لاکر سکرٹری مس ایلز بتھ چھوٹے لال کی میز پر رکھا۔ جو صبح سویرے سائیکل پر لال باغ سے آتی تھیں۔ انہوں نے سیکشنوں کی ڈاک الگ الگ کی۔ صاحب کے نام کے خطوط انہیں پیش کیے۔ منشی جی اندر آکر ٹیلی فون کی میز پر بیٹھ گئے۔ کفایت کے خیال سے منشی سوختہ ہی آپریٹر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اور ہر میگزین کی کال کے لحاظ سے ریڈ روز گڈ مورننگ —— گُلِ سُرخ آداب عرض —— لال گلاب نمسکار —— کہتے جاتے تھے۔

ٹیلی فون آپریٹر کے علاوہ ریڈ روز پبلی کیشنز کے قانونی مشیر بھی تھے۔ اور

گُلِ سرخ کے ادبی سیکشن کی ادارت انہی کے ذمے تھی۔ بھیّا کی خوشی کی خاطر ترقی پسند انداز کی غزلیں بھی کہنے لگے تھے جو کبھی کبھی گُلِ سُرخ کے صفحات کی زینت بنتیں۔ لال گلاب کے عملہ ادارت سے باتیں کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہتے پائے گئے تھے کہ "ہم سماج وادی لیکھکوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ ——"

اور یہ سب اس لیے کہ قنبر علی خوش رہیں کیونکہ وہ انہیں اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے اور انہوں نے محسوس کیا تھا کہ بیاہ کے بعد سے بھیّا بہت متفکر اور اداس ہو گئے ہیں۔ ان کی شادی کی خبر اب تک عام نہیں ہوئی تھی۔ دوستوں کے قریبی حلقے نے ان کے اس اقدام کی تعریف کی۔ تین کٹوری والے ششدر رہوئے اور خود بھیّا کے سامنے بھوانی شنکر نے اپنی رائے اب تک محفوظ رکھی تھی۔ منشی جی کا خیال تھا کہ بھیّا کو اس ڈرامہ بازی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر وہ کھُلے خزانے بیلا سے شادی کر لیتے تو بھی کچھ نہ ہوتا۔ مگر وہ نوجوان آدمی تھے قوم کا غم کھاتے تھے۔ لیکن ذاتی زندگی آرام آسایش سے گذر رہی تھی۔ تھوڑے سے اکسائیٹمنٹ کی انہیں حاجت تھی۔

خطوط پڑھتے پڑھتے اچانک قنبر علی نے انہیں آواز دی۔

بھیّا معمول سے زیادہ پریشان نظر آرہے تھے۔ بولے۔ بھوانی چچا ذرا اس طرف آئیے۔ ان کو ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ از طرف: —— ماسٹر آئی۔ بی۔ موگرے —— ناگپاڑہ۔ بمبئی۔

بھوانی شنکر سوختہ بیرسٹر اظہر علی مرحوم کے کلرک کی حیثیت سے قریب دہی کے مقدمات کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے تھے ان کو یقین تھا کہ وہ ناٹک جو راجہ رگھبیر پرشاد کے ہاں چہنٹ میں کھیلا گیا اس کے اصل درپردہ مصنّف ماسٹر امام بخش موگرا تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ قنبر علی ایک۔ خود مختار صاحب جائداد جذباتی اور سادہ لوح نوجوان ہیں۔ کوئی بزرگ رشتے دار نصیحت کرنے والا سر پر موجود نہیں۔ سوختہ کو معمولی منشی سمجھے۔ لڑکی سے ایکٹنگ کروائی کی ماں باپ کی قید سے رہائی چاہتی ہے۔

سوختہ کو اپنے اس یقین کا ثبوت اس وقت مل گیا جب قنبر علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوتے ذرا ہکلا کر کہا — "بھوانی چچا۔ ہا — ہمارے رسالے ہی خسارے سے چل رہے ہیں۔ ہم اس تین سو ماہانہ کی — کی گنجائش کہاں سے نکالیں۔"

بھوانی شنکر نے کمانی دار عینک ناک کی پھننگ پر جمائی —

استاد موگرے رقمطراز تھے —

— آپ جیسے بڑے آدمی نے ہم غریبوں کو اتنا بڑا دھوکہ دیا۔ ہماری صنوبر کمپنی ابھی چالو بھی نہ ہوئی تھی کہ ٹھپ ہو گئی۔ ہم تینوں بہت جلد روڈ پر آجائیں گے۔ ہم آپ رئیسوں کو پہنچانتے ہیں۔ جس طرح گل عبّاس آپ کی نظروں میں چڑھی اتر بھی سکتی ہے مگر اب وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اس کا بڑی فلم اسٹار بننے کا چانس بھی مارا گیا — بہار صاحب ہمارے خرچے کے لیے مالی امداد کہاں تک کریں۔ وہ خود بال بچوں والے آدمی ہیں۔ مبلغ تین سَو روپیہ ماہوار تاحیات پنشن مقرر فرمایئے۔ زوجہ اور ہم آپ کو دعائیں دیں گے۔

منشی جی نے عینک اتاری ایک منٹ خاموش رہے۔ پھر کہا: "بھیّا آپ نے اب تلک جو کچھ کیا سو کیا۔ اب ہم چپ نہیں رہ سکتے۔ تاحیات وظیفہ کس بات کا؟ وہ خود بتلا رہے تھے کہ ہر فن مولا آدمی ہیں۔ فراست الیدا اور باباگیری سے بھی کما چکے ہیں۔ بمبئی میں آدمی ہر طرح لوٹ پیٹ کر پیٹ پال لیتا ہے۔ اب تلک وہاں کوئی بادشاہی کر رہے تھے۔ اور وہ جوان کا ہیرو ٹبا زیر و بیٹا ہے وہ طبلچی ان کو کما کر نہیں کھلا سکتا؟ اچھا اب یہ بات آپ نے خود نکالی ہے تو پہلے یہ بتلایئے کہ آپ نے عقد کے وقت کتنی رقم مقرر کی معجّل اور موجّل؟ دلہن کی طرف سے وکیل کون تھا۔ مولانا کون آئے تھے اور گواہ کون صاحبان تھے؟"

"وک — وک — وکیل تو کالے خاں تھے۔ رگھبیر پرشاد کے ڈرائیور۔ مولانا اسی گاؤں کے تھے اور گواہ رگھبیر پرشاد کے کارندے تھے۔ ہمیں ان کے نام ٹھیک سے یاد نہیں شاید اکرام احمد اور اشفاق علی —"

"مہر — ؟"

"مہ — مہر — ارے بھوانی چچا کیا آپ ہمیں بچّہ سمجھتے ہیں۔ سارا ہندوستان ہمارے قلم سے تھر تھر کانپ رہا ہے۔"

منشی جی مسکرائے۔

"خیر سارا نہ سہی آدھا سہی۔ تمام منتری لوگ سب سے پہلے ہمارے اڈیٹوریل پڑھتے ہیں۔ خود پنڈت جی —"

"مہر — ؟ معجّل اور موجّل —"

"وہ تو ہم نے سب کام سوچ سمجھ کر کیا ہے ہم بھی تو آخر بیرسٹر کے لڑکے ہیں —"

"مہر — ؟"

"بس یہ کوٹھی ہی سمجھ لیجئے۔ مگر محض کو — کوٹھی — باغ نہیں —"

سوختہ ششدر رہ گئے۔ رومال نکال کر پیشانی سے پسینہ پونچھا — چند لمحوں تک بڑی گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ اچانک قنبر میاں نے خوف سا محسوس کیا کہ منشی سوختہ چھڑی اٹھا کر ان کو پٹینا نہ شروع کر دیں۔ اپنی ساری ہمّت مجتمع کی۔ کندھے اچکا کر ذرا تن کے بیٹھ گئے۔ ہلکی سی سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ بیفکری کے اظہار کیلئے ٹانگیں ہلانے لگے۔

"بیگم صاحبہ مرحومہ کے لاکر کی کنجی بھی آپ کے پاس تھی — ان کے زیورات —"

"اوہو — لاکر میں امّی کے زیورات ہیں؟ یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔ اچھا ہوا آپ نے بتلا دیا۔ ہم ان کو فروخت کر دیں گے اور رسالوں میں جو نقصان ہو رہا ہے اس پیسے سے اسے پورا کریں گے۔ بیلا کو نہ بتلایئے گا ورنہ وہ پیچھے پڑ جائیں گی کہ زیور بھی مجھے دے دو۔ عورتوں کو گہنے پاتے کا جانے کیوں اتنا جنون ہوتا ہے۔ بھوانی چچا لاکر میں اور کیا ہے؟ شیئر سرٹیفکٹ وغیرہ؟"

"جی ہاں۔"

"اچھا ہوا آپ نے تبلا دیا۔ موقع پڑنے پر شیرز فروخت کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں ذرا اطمینان ہوا۔ اچھا آپ منی آرڈر فارم تو نکالیے —"

"کیوں — ؟"

"موگرا چنبیلی کو بھوکوں مرنے دیں ؟ بھوانی بچا وہ ہماری بیاہتا بی بی کے نادار والدین ہیں اور ہمیں اپنی بی بی سے کوئی شکایت نہیں —"

"بھیّا یہ ساری نوٹنکی ماسٹر موگرا نے کی تھی کہ بیلا رانی اس ماحول سے نکلنا چاہتی ہیں آپ ان کی دستگیری کیجیے۔ اور آپ اتنے بھولے ہیں کہ ان کے بھرّے میں آگئے۔ ذرا غور سے سوچیے۔ ٹھنڈے دل سے۔ اور پھر انہوں نے کوٹھی بھی آپ سے اپنے نام لکھالی۔ وہ جھنجھٹ والا ڈرامہ خفیہ شادی کا نہ آپ نے بنایا تھا نہ راجہ رگھبیر پرشاد نے اس کے اصل لیکھک تھے ماسٹر موگرا اور شاید ان کے ساتھ بہار پھولپوری عرف دیوتا ڑبارہ بنکوی۔ سوچیے۔ ذرا سا غور کیجیے۔"

قنبر علی سوچا کیے پھر سر ہلایا: "بھوانی بچا ایسا ممکن بھی ہے اور نہیں بھی۔ آپ قانون داں آدمی ہیں قانون میں ایک چیز

THE BENEFIT OF THE DOUBT

ہوتی ہے۔ آپ وہ ان سب کو نہ دیجیے گا ؟"

مس بڑی چھوٹے لال نے دروازے میں سے جھانکا "سر — کال فور یو۔"

وہ اٹھے "چلیے ماسٹر جی کے نام دو سو مہینہ آج سے جاری کر دیجیے۔ اگر دیکھا جائے تو ہم نے واقعی ان کے ساتھ زیادتی کی۔ ان کا صنوبر فلم کمپنی کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا آپ کو بیچارے استاد سے کوئی ہمدردی ہی نہیں۔ آپ اب ایک پرگتی وادی پترکار ہیں۔ آپ بھی سوچیے ہمارے جاگیری سماج نے ان فنکاروں کو صدیوں تلک جوتے کی نوک پر رکھا۔ ان کا استحصال کیا۔ ہم اگر اپنی ذاتی زندگی میں اپنے آدرشوں پر عمل نہ کریں تو ہماری مارکسزم پر تین حرف — ہاں — کامریڈ چھوٹے لال — ہم آرہے ہیں۔"

ٹیلی فون الیکشن کمشنر کے دفتر سے آیا تھا۔ دوسرے روز صبح منہ اندھیرے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس قنبر علی ٹہلتے ہوئے پیپل کے نیچے پہنچے جہاں سوختہ سُوریہ نمسکار اور پوجا پاٹ میں مشغول تھے۔ سگریٹ بجھا کر دور پھینکا۔ ایک طرف کو کھڑے رہے۔ سوختہ نے جاپ ختم کر کے سر اٹھایا۔ "نمسکارم — سوامی جی!" قنبر نے شگفتگی سے کہا۔

"گوڈ بلیس یُو۔ بھیّا"

"آہا ہا — گوڈ ہی کے سلسلے میں تو اس وقت آپ کو زحمت دینے آئے ہیں۔ پہلے یہ تبلائیے آپ کون سے والے گوڈ کو مانتے ہیں ؟ کس کس کو ؟"

"خدائے واحد کو مانتے ہیں۔ ذات مطلق۔ پرم برہم۔ جس کے جلال کا مظہر شیو جی ہیں یشنکر بھگوان۔ جمال کے مظہر وشنو۔ جن کے رام اور کرشنا یہین اوتار — اور یہ سب دیوی دیوتا جو ہیں وہ ذات مطلق کا تبکدہ صفات ہے۔ اس کے کارندے۔ زائیدہ نور۔ مگر صاحبزادے آج اعلیٰ الصبح مابعد الطبیعات واعتقادات اہلِ ہنود کی طرف کیوں متوجہ ہوئے ؟"

"بھئی ہم محض اتنا پوچھ رہے تھے آپ پُوجا کس ایک دیوی یا دیوتا کی کرتے ہیں یہاں بیٹھ کر ؟"

"ہم بطور علامت جلالِ خداوندی شنکر بھگوان کی تقدیس کرتے ہیں۔" پرانے زمانے کے کائستھ تھے لہٰذا نہایت ثقیل اردو بولتے تھے۔

"بس اتنی سی بات پوچھنی تھی۔ دراصل ہم الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ آپ ایک عدد قسم کھائیں لارڈ شیوا کی کہ آپ بیلا کو نہ تبلائیں گے کہ الیکشن کے لیے پیسہ کہاں سے آرہا ہے۔"

"کہاں سے آرہا ہے ؟"

"بس سمجھ لیجیے کہ لکشمی جی ہی بھیجدیں گی۔"

"ازبرائے خدا کوئی اور بچپنا نہ کر بیٹھیے گا۔"

"بچپنا؟ دیکھیے گا ایک روز ہم منتری منڈل میں بیٹھے ہوں گے —"

قنبر علی نے منشی بھوانی شنکر کو تبلائے بغیر باپ کے خریدے ہوئے شیر زادے نے پونے بیچے۔ مقابلہ برسر اقتدار پارٹی سے تھا۔ لاکھوں روپیہ درکار۔ دوسرے ہلّے میں ماں کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا۔ کوٹھی پر زبردست ہنگامہ رہا۔ ورکرز۔ جیپ گاڑیاں پوسٹروں کے انبار۔ جھنڈیاں۔ رضا کاروں کے لیے صبح سے شام تک مسلسل چا بنتی۔ دیگوں میں کھانا پکتا۔ نجی عملہ بھی ریڈ روز پارٹی کے بلّے لگائے بیحد احساس اہمیت کے ساتھ اِدھر اُدھر دوڑتا رہتا۔

اس گہما گہمی میں بیلا کے وجود کو قطعاً نظر انداز کیا گیا۔ وہ منہ پھُلائے اپنے بیڈ روم میں پلنگ پر لیٹی ماری کوریلی کے ناول پڑھا کرتیں جو ان کی واحد سہیلی ایلزبتھ چھوٹے لال ان کے لیے لایا کرتی تھی۔

قنبر علی الیکشن لڑے اور ہار گئے۔ اس زبردست مالی نقصان اور سیاسی شکست کے بعد اپنا غم غلط کرنے کے لیے شراب کی طرف زیادہ تندہی سے متوجہ ہوئے۔

بیلا کی شاپنگ میں کوئی فرق نہ آیا۔ رکشا پر بیٹھ کر حضرت گنج امین آباد نظیر آباد چوک چلی جاتیں۔ شام کو پیکٹوں سے لدی پھندی واپس آتیں۔ اب وہ زیادہ وقت مدر کرافٹ کی دوکانوں پر گذارنے لگیں۔

ایک سہ پہر قنبر اپنے دفتر میں بیٹھے ششماہی حسابات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے منشی جی ناک کی نوک پر عینک رکھے سامنے موجود تھے۔ ان سے پوچھا "بھوانی چچا یہ آم امرود کی فصل جو اس سال بکی ہے۔ اس کا اندراج ہی نہیں ہوا۔"

"آپ الیکشن میں مصروف تھے۔ بہو صاحب نے وہ ٹھیکہ خود وصول کر لی۔ ان کو نیا فرنیچر بنوانا تھا۔"

"آپ نے ہمیں نہ تبلایا۔ کیا انہوں نے بھی قسم دِلا دی تھی؟"

آپ دیہات کے دورے پر گئے ہوتے تھے۔ بسلسلہ انتخابات عامہ۔ آپ کو مطلع کیسے کرتے؟"

رکشا آن کر رکا — بیلا برآمدے کی سیڑھیاں چڑھیں۔ قنبر کو دروازے میں سے ان کی جھلک دکھلائی دی فوراً چند کاغذات سمیٹ کر اٹھے۔

دفتر کا کمرہ اور ڈرائنگ روم آمنے سامنے واقع تھے۔ بیچ میں گیلری۔ جونہی بیلا داخل ہوئیں قنبر گیلری میں پہنچے۔ کہا ذرا ادھر آنا۔ ان کو ڈرائنگ روم میں لے گئے۔

بیلا نے اُون اور سلائیوں کے پیکٹ ایک سائیڈ ٹیبل پر رکھے۔ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ سوچیں آج پھر جھگڑا ہوگا۔

انہوں نے بات شروع کی۔ "بیلا —"

"بولو —"

"چڑیاں بولتی ہیں۔ انسان کہتے ہیں۔"

"فرمائیے۔"

"یہ دیکھو ہر دوکان سے بل پہ بل چلے آ رہے ہیں۔ تم نے باغ کی آمدنی بھی خود وصول کر کے اُڑا دی۔ ہمیں نہ تبلایا۔"

"اپنے شوق کی خاطر تم نے اپنی ممی کے داگینے ڈیڈی کے شیر بیچ ڈالے مجھے بتایا؟"

"شوق؟ CAUSE کی خاطر — اور یہ تم سے کس نے کہا۔ منشی جی نے؟"

"وہ تم سے زیادہ گھُنّے ہیں۔ مجھ سے بات ہی کہاں کرتے ہیں۔"

"پھر —؟ اس بڑّی کالے لال نے —؟"

"بڑّی چھوٹے لال —"

"تم میری جاسوسی کرتی ہو۔ اور اس بڈّھی کی بچی کو ہم نے بائبل کی قسم دلا دی تھی۔"

"اس نے کچھ نہیں بولا۔ لیکن وہ تمہاری بنک کی ساری کورسپونڈنس ٹائپ کرتی ہے — تمہارے آرڈر کے مطابق پانچ بجے کے بعد میں اس کی کرسی پر بیٹھ کر ٹائپنگ کی مشق کرتی ہوں۔ وہ دن بڑی خط کی کاربن کاپی مشین سے نکالنا بھول گئی تھی تب مجھے معلوم پڑا۔"

"اور یہ تم نے فرنیچر کس لیے بنوایا ہے؟"

"مارچ میں بے بی آنے والا ہے اس کے لیے۔"

"یہ بے بی کون صاحب ہیں اور کہاں سے آرہے ہیں — مائی گوڈ۔ بیلا تم سے کتنی بار کہا کہ یہ اپنی گھٹ پٹیا بے بی ممی ڈیڈی انکل آنٹی نہ کیا کرو۔"

"ٹھیک ہے نہیں کروں گی۔ اتنا تو یاد کرلیا ہے پینٹری کے بجائے آبدار خانہ کھانا اٹھاؤ کے بجائے دسترخوان بڑھاؤ۔ باتھ روم کے بجائے حمّام۔ لیٹرین کی جگہ چوکی پہ جانا بولتی ہوں۔ تم لوگوں کے یہ زبان کے نخرے تُوبچ ہیں۔ وہ دن —"

"اُس دن —"

"تمہارے نوکر تک زبان پکڑتے ہیں۔"

"نوکر نہیں۔ ڈومیسٹک ہیلپ۔"

"وہ دن میں نے خالی اتنا بولا۔ کلاوتی سے غسلخانہ میں جھاڑو پوچا کروا دو۔ الحمد نے دھمال ڈال دی۔ اے ہو صاحب۔ ہمارے کے ہاں شیعہ لوگ جہاں اپنے مُردے نہلاتے ہیں وہ جگہ غسلخانہ کہلاتی ہے۔"

"تمہارے ماں باپ تو یہیں سے بمبئی گئے تھے۔ تمہاری زبان — گُڈنس — ہم اصل موضوع سے بہت دور بھٹک گئے۔ یہ بل —"

"اور تم چاہتے کیا ہو۔ جو بولتے ہو — سوری — جو فرماتے ہو وہ کرتی ہوں۔"

"میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کرو۔"

"تم کیوں نہیں اپنے خرچے کم کرتے — اتنی دارُو — اتنی دارُو — نرسری فرنیچر میں نے اتنا خوبصورت بنوایا ہے۔ دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔ سفید اور اس پر

ملی ماؤس۔ ڈونلڈ ڈک اسنو وایٹ اینڈ سیون ڈوارفس — یہ جو تمہارا لیڈیز گیسٹ روم ہے اس میں انشاءاللہ نرسری بنے گی —"

"تم میرا رہا سہا دیوالہ بھی نکال دو گی۔"

"تم سے کس حکیم نے کہا تھا رسالہ نکالو۔ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ لا پڑھا تھا اپنے ڈیڈی —"

"میاں جان —"

"میاں جان کی طرح پریکٹس کرتے۔ ان کی جمی جمائی گُڈوِل تم کو ملتی۔ مگر بعض لوگوں کو فلم انڈسٹری میں گھسنے کا سودا ہوتا ہے۔ بعضوں کو پولیٹکس — مجھے تو اپنے باپ اور بہار رکھپوری میں اور تم میں کوئی فرق نظر آتا نہیں۔"

بیلا اکثر قنبر کو لاجواب کر دیتی تھیں۔

"اب اگر تمہاری آمدنی زیرو ہے رسالوں سے — بند کرو۔ باغ کی زمین پر دوکانیں بنواؤ —"

"دوکانیں؟ ہم سرمایہ داری کریں گے؟ ہم اس باغ کا ٹرسٹ بنا رہے ہیں۔ جنتا کے لیے ریڈنگ روم۔ ڈسپنسری۔ فری نائٹ اسکول تعمیر کریں گے۔"

"ساتھ ہی اپنے لیے پاگل خانہ بھی بنوا لینا تاکہ اس میں تم کو بند کر دیا جائے۔"

"اچھا اب تم اندر جاؤ۔ چاء بنواؤ۔"

"جس جنتا کے لیے تم مرے جا رہے ہو اس نے تم کو اتنے کم ووٹ دیے تمہارے پارٹی پروگرام کو جنتا نے ریجکٹ کر دیا۔ اسے اپنے مندر مسجد گوردوارے چاہئیں۔ اور کچھ نہیں۔ تمہارے رمضانی اور عیدو اور علاءالدین اور بھگوان دین اور پھنگو کی طرح وہ بھی بنیادی حالات بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ آقا کو آقا بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔ تم ان کی خاطر اپنے آپ کو تباہ کرلو وہ تمہاری کبھی نہیں سُنیں گے۔"

"کیونکہ ان کی قیادت صحیح نہیں۔ انہیں ایجوکیٹ کرنا ہے۔"

"وہ سب تم کرتے رہو لیکن باغ کا ٹرسٹ میں نہیں بننے دوں گی۔ اسے فوراً میرے نام لکھو۔"

"اچھا یہ اتنی مدلّل فاضلانہ ناصحانہ تقریر اس لیے کی گئی۔ اپنے نام لکھوا کے تو دیکھو۔ کوٹھی لکھ کر حماقت کی۔ وہ نازک موقع تھا۔ تمہارے غنڈہ صفت چاقو باز لفنگے برادرِ معظم کے ڈر سے بے چارے رگھبیر پرشاد نے پستول تان رکھا تھا کہ فوجداری نہ ہو جاوے۔ اسی ڈر سے میں نے بھی فوراً——"

"اب تم باغ بھی اسی طرح لکھو گے۔"

"مجھے بُلی مت کرو۔ اندر جاؤ۔"

"میں تو ابھی اسی وقت فیصلہ کرواؤنگی۔ ورنہ بے بی کہاں کھیلے گا——"

"تمہارے بے بی کو کھیلنے کے لیے اتنا بڑا باغ درکار ہے جبکہ عوام کے کروڑوں بچے بھوکے ننگے خاک پھانکتے پھر رہے ہیں۔"

"میں تو جب مانوں جب تم خود جا کر ان کے ساتھ جھونپڑپٹی میں رہنے لگو۔"

"موقع پڑنے پر ایسا بھی کر سکتے ہیں ہم۔"

"ہرگز نہیں۔ تم کو آرام دہ گھر بھی چاہیے اور بڑھیا ولایتی دارو بھی۔ بلواؤ وکیل ابھی۔ اور تیار کرو کاغذ ورنہ میں اور بے بی کیا روڈ پر کھڑے ہوں گے——؟"

"روڈ—— کون سی روڈ بھئی——؟"

باہر ٹھیلے والا نرسری فرنیچر لے کر آن پہنچا۔ "سامان اتروا لیجیے۔" اس نے ہانک لگائی۔

دفتر بند ہو چکا تھا اور کلاوتی بیرونی برآمدے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اس نے سرونٹ کوارٹر کی طرف جا کر اطلاع دی: "صاحب بیگم صاحب میں پھر مہابھارت چھڑی ہے۔ اب رٹت ہیں باغ میرے نام لکھدو۔"

"بھیا ہمیشہ کے دھان پان۔ اب تو بالکل پیلے پڑ گئے ہیں۔ بی بی ایسی ظالم

ملی۔ توبہ اللہ میرے گناہوں کی توبہ۔" زیتون نے کانوں پہ ہاتھ رکھے۔

اندر ڈرائنگ روم میں یُدھ جاری تھا۔

"عوام کی فکر میں بے چارے کا حال پتلا ہوا جا رہا ہے۔ اصلیت میں تم سے زیادہ کلاس کونشس کوئی نہ ہوگا۔"

"میں کلاس کونشس؟"

"تم نے آج تک مجھے اپنے دوستوں سے کیوں نہیں ملوایا؟ مجھے انڈر گراؤنڈ کر رکھا ہے —— تم ڈنکے کی چوٹ سب سے کہتے یہ میری بیوی بیلا ہیں۔ موگرا بھانڈ کی صاحبزادی۔ تم نے تو شادی کے فوراً بعد میرے متعلق فوٹو فیچر وہ بھی پریس سے واپس منگوا لیا۔ اس کو —— معراج کو بولا یہ اسٹوری فوراً KILL کردو —— قاعدہ ہے جب آدمی کی شادی ہوتی ہے اس کے دوست احباب نئے جوڑے کی دعوتیں کرتے ہیں۔ تمہارے دُلارے رگھبیر پرشاد کی رانی تک نے آج تک مجھے اِن وائٹ نہیں کیا۔ جن کے مکان پر ہی نکاح ہوا تھا —— آج تک ملیں بھی نہیں۔ جو تمہارے مفت خورے یہاں شام کو آن کر اڈا جماتے ہیں ان سے نہیں ملواتے۔"

"وہ سب انٹلکچوئیل لوگ ہیں۔ ان سے تم بات کیا کرو گی۔ وہی قوالی اور سینما۔"

اتنا کہہ کر وہ ذرا پچھتائے کیونکہ یہ بیلا جیسی ذہین اور باشعور لڑکی کے ساتھ صریحاً زیادتی تھی۔

"میری دوست کون ہے۔ بے چاری ایلزبتھ چھوٹے لال میری طرح کی مسکین غریب بیک گراؤنڈ کی لڑکی۔ میں شاپنگ بھی نہ کروں؟ خالی بنیا کیا کرے اس کوٹھے کا اناج اس کوٹھے میں۔ سارے وقت کمروں کا فرنیچر اِدھر سے اُدھر رکھوایا کرتی ہوں۔ خیر وہ تو مجھے گھر سجانے کا ہمیشہ سے شوق تھا۔ کھولی میں ٹین کے کنستروں میں گلاب اگاتے تھے۔ پرانی ساریوں کے پردے سی کر ٹانگتی تھی۔ اب اللہ نے ایسا مکان دیا ہے تو——"

"ویری گڈ۔ ہم تمہارے سلیقے کے معترف ہیں مگر بیکار کی نئی چیزیں نہ خریدو۔ یہ سب امی جنیاں کا پرانا سامان ہے۔ میرے لیے تبرّک۔ یہ میاں جان امی جنیاں ولایت سے اس زمانے میں لایا کرتے تھے جب کوئی ولایت جاتا بھی نہیں تھا۔ آجکل ہر بھنگی چمار جا رہا ہے دراصل تم اس کلاسی ساز و سامان کی قدر کر ہی نہیں سکتیں۔"

"کلاسی! بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ تم سے زیادہ کلاس کونشس —"

"پھر وہی۔ میں کلاس کونشس — ؟"

"اور مغرور — خاندان — بیک گراؤنڈ۔ مسوری کی تعلیم۔ قابلیت۔ شہرت۔ اتنے ساری کوالی فیکیشنز اور ایک اکیلی جان۔ ان کے بوجھ تلے تمہارا کچومر نکلا جا رہا ہے۔ اوپر سے خاکساری کا بھاری تاج سر پہ دھرا ہے۔ میں درویش آدمی — میں اَن پڑھ آدمی — اپنے میگزنوں میں اپنی تعریف کے خط چھپواتے بھی تم ذرا نہیں جھینپتے۔ اپنے ہی میگزین میں اپنی تعریف۔"

"پولیٹکس میں یہ سب کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تم کلاس بلکہ کاسٹ کونشس بھی ہو ورنہ بے چاری بڑّی کو منہ پر کامریڈ اور پیٹھ پیچھے اتنی حقارت سے کالے لال کیوں کہتے ہو — اور یہ کہ اب تو بھنگی چمار بھی ولایت جانے لگے۔ کیا محض تمہارے اپر کلاس ماں باپ ہی انگلینڈ جانے کا حق رکھتے تھے — ؟"

قنبر گھبرائے ہوئے بیٹھے رہے۔ یہ خاتون تو شربری دیبی سے زیادہ جھگّی نکلی۔

"اور یہ جو تم دوڑ دوڑ کر دلّی جاتے ہو۔ وجہ مجھے معلوم ہے ہر شام تم رُوس یا ایسٹرن یوروپ کی کسی ایمبیسی میں پہنچ جاتے ہو اور وہاں شرابیں لنڈھاتے ہو — تمہارے بڑے توپ انقلابی شاعر لوگ بھی کہیں جاتے ہیں تو اپنے کم حیثیت پرستاروں کے بجائے کروڑپتیوں کے گھروں پر ہی قیام کرتے ہیں۔ بہار صاحب

کے ساتھ مشاعروں میں جا جا کر مجھے اس لٹریری دنیا کا بھی کچھ آئیڈیا ہو چکا ہے۔ مجھے بیوقوف نہ سمجھنا۔"

"تم اور بیوقوف؟ توبہ توبہ۔"

ہر دوسرے تیسرے روز باغ کے معاملے پر جھگڑا ہونے لگا۔ جواب میں وہ خاموش رہتے۔ بیلا ہتھ چھُٹ بھی تھیں۔ گلاب اور چنبیلی سے مار کھا کر چالی کے بچّوں کو پیٹتی پھرتی تھیں۔ اب وہ قنبر کی خاموشی سے تلملا کر ان کو مارنے لگیں۔ قنبر فوراً ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیتے اور سوچتے مجھے اس صورت حال کا سائنٹفک تجزیہ کرنا چاہیئے۔ بیلا ایک سَلم چائلڈ ہیں اور سلمز کے تشدّد آمیز ماحول میں پروان چڑھی ہیں — قنبر کے اس سرد ردّ عمل سے وہ اور آگ بگولہ ہوتیں اور ان کے تحمّل کو انکی کلاس اسنوبری اور سرپرستانہ روّیے پر محمول کر کے ان کو مزید صلوٰتیں سناتیں۔

آج صبح ناشتے کی میز پر پھر یہی قضیہ شروع ہوا "آج تم وکیل کو بلا رہے ہو نا۔"

"تمہارے ایجنڈا پر تین آئیٹم تھے۔ ۱۔ الّو کے پٹھے قنبر علی سے شادی۔ ۲۔ قنبر علی کی کوٹھی پر قبضہ۔ ۳۔ باغ پر ایضاً۔ افسوس کہ ۳ قطعی ممکن نہیں۔"

"میں اسی باغ کے کنویں میں کُودی ماروں گی۔"

"کُود پڑونگی —" قنبر نے تصحیح کی۔

"میں تمہیں وارننگ دیتی ہوں —"

"ع پان کل کے لیے لگاتے جائیں : یاد اپنی تمہیں دلاتے جائیں —
مثنوی زہر عشق — !"

"زمین میرے نام لکھو ورنہ میں کنویں میں چھلانگ لگانے کے بعد اگر زندہ بچی تو پولس کو بیان دونگی کہ تم نے مجھے دھکّا دے کر گرایا تھا۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم کسی طرح میرا پیچھا تو چھوڑو۔"

وہ لال پیلی ہو کر میز سے اٹھیں۔ بھری ہوئی چائے دانی قنبر پر پھینکی۔ نشانہ خطا کر گیا۔

اٹھ کر باہر بھاگے یہ ان کو دھکّے دیتی مارتی ہوئی دوڑیں وہ لپک کر کار میں جا بیٹھے۔ انجن اسٹارٹ کیا اور غائب ہو گئے۔

مدھو مالتی کے بیل کے قریب چند کھٹنیک موجود تھے۔ اور ایک پآر کی کٹّرن۔ اس نے زدوکوب کی خبر تین کٹوری ہاؤس پہنچائی۔

اسی رات دو ڈھائی کا عمل رہا ہوگا کنوئیں میں کوئی بھاری چیز گرنے کی آواز آئی۔ باڑے والے چبوترے پر الحمدو نماز تہجد کے بعد چٹائی لپیٹ رہی تھیں فوراً دوڑیں۔ رمضانی، علاءالدین عیدو اور ننّھا کو جگایا۔ وہ کنوئیں کی طرف بھاگے۔ ان سب کے دلوں میں ایک ہی خیال کی چلک مک ذہنی دکی — خدا کرے یہ وہ ہوں۔ بھیّا نہ ہوں بھگوان دین اور پھٹکو نے کنوئیں کے اندر جھانکا۔ گھگھی بندھ گئی۔

پھٹکو نے اوفیلیا والی مشہور تصویر نہیں دیکھی تھی۔ پانی کی سطح پر بکھرے بال اور بالوں میں الجھے پھول اور پتّے —

"بیگم صاحب رسّی تھام لیجئے — رسّی — خوب جور سے پکڑے رہیئے — گھبرائیے مت — یا علیؑ مدد" — رمضانی کنوئیں میں اترنے کے لیے تیار ہوتے۔

منشی جی حسبِ معمول دفتر کی ردّی فرش پر پھیلاتے ایک ایک کاغذ اٹھا کر دیکھ رہے تھے کہ کوئی کام کی چیز کباڑی کے ہاں نہ چلی جائے۔ دل نہ لگا۔ دھیان بھیّا کی طرف تھا۔ جن کے مصائب کسی صورت کم ہونے میں نہ آتے تھے۔ ان کے متعلق فال دیکھنے کے لیے الماری سے دیوان حافظ اتارا۔ چھت سے لٹکتے بغیر شیڈ کے بلب کے نیچے پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہی تھے کہ حواس باختہ الحمدو اندر آئیں۔

قنبر علی صبح کی زدوکوب کے بعد اسمبلی سشن کوَر کرنے کے لیے نکل گئے تھے حسب دستور رات گئے واپس آئے۔ آتے ہی پلنگ پر گر کر سو گئے۔

الحمدو کو ہیبتناک آواز پر آنکھ کھلی وہ چلّا رہی تھیں — "منشی جی — ڈاکٹرنی کو فون — کملا گپتا ڈاکٹرنی کو فون —"

اگلے چند روز میں بیلا کی حالت بوجہ شدّت گریہ ابتر ہو گئی۔ جب غنودگی میں ہوتیں بڑبڑایا کرتیں۔ اولڈ ماما — حنّہ بائی — تم ہمارے کو کیا بولا تھا۔ باوڑی میں کود دی مارو — یا بیڈ لک ہوگا یا گڈ لک۔ پن ہمارا بیڈ لک ہو گیا۔ ڈیم بیڈ لک —"

قنبر علی نے اس المناک حادثے کی کسی کو ہوا نہیں لگنے دی۔ علاءالدین سے لیکر پھٹکو چوکیدار تک سارے ملازم جاں نثار۔ "بھیّا ایک بار منع کر دیں ہم سر کٹا دیں گے مگر کوئی بات یہاں سے نکلنے نہیں پاویگی۔"

"شاباش رمضانی ہمیں تم سے یہی امید تھی" انہوں نے خود کو کسی پرانے جاگیردار کی طرح بات کرتے پایا۔ بیحد جھنجھلائے۔ حالات اور واقعات اور معاملات نے انکے خلاف سازش کر کے ان کو جال میں پھانس لیا تھا۔ جسطرح یہ ہرن باڑے میں محصور تھے۔ اندرونی کمروں کے دروازوں میں چٹخنیاں لگی رہتیں۔ یوں بھی بیگم صاحبہ سے ملنے کون آتا تھا۔ اب بڑی چھوٹے لال کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں رہی۔

چند دن بعد بیلا کو افاقہ ہوا۔ قنبر علی نے وکیل بلا کر باغ ہبہ کیا۔ بیلا نے تکیے سے اُچک کر ان کو دستخط کرتے دیکھا۔ قلم کی جنبش ہی سے سمجھ گئیں اب Q بنا رہے ہیں۔ Q ایک خاص طرح بناتے تھے جیسے چینی کی ایک مونچھ بہت نیچے چلی جائے۔ باقی حروف بڑے آرٹسٹک طریقے سے گھسیٹتے تھے۔ علی کا A گویا ایفل ٹاور کھڑا ہے۔ وہ مسکرائیں ایسا نیک سیدھا سچّا شوہر۔ مرنجاں مرنج۔ گو تھوڑا سا ضدّی۔ سُنا ہے ماں کے لاڈ نے اتنا ہٹیلا بنا دیا ورنہ آخر میں کرتے وہی ہیں جو میں کہتی ہوں۔ قنبر علی نے دستاویز ان کو دی۔ جب وہ چلنے پھرنے لگیں خود ڈاکخانے گئیں اور اس کا پیکٹ والد کے نام بمبئی روانہ کر دیا۔

قنبر علی ان کو برائے تبدیلی آب وہوا رانی کھیت لے گئے۔

چلتے وقت بیلا نے الحمدو سے فقط اتنا کہا۔ میں رات کو تازہ ہوا کھانے ذرا باہر نکلی تھی۔ ٹہلتی ہوئی کنویں تک چلی گئی۔ منڈیر پر کھڑے ہو کر ایسے ہی نیچے جھانکا۔ پتھر کی کائی پر پیر رپٹ گیا۔

الحمدو نے چُپ چاپ سر ہلا یا۔ پیر رپٹنے پر رپٹ لکھانے کا ڈر تھوڑا ہی ہوتا ہے بھیّا کیسے بار بار منشی جی سے کہہ رہے تھے کہیں پولس کیس نہ بن جائے۔ پولس کیس۔ ارے میرے بچے کی جان کیسی آفت میں پھنسی ہے۔

صاحب بیگم صاحب کے پہاڑ جانے کے بعد کوٹھی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ رسالوں کا عملہ صبح ساڑھے نو بجے آتا۔ پانچ بجے واپس چلا جاتا — منشی سوختہ حسب معمول پیپل کے نیچے گیان دھیان کرتے۔ علاء الدین رمضانی عیدو نتھا گوشے کی مسجد میں نماز پڑھنے کے بعد کچھ دیر وہیں بیٹھے رہتے۔ کام دھام کچھ تھا نہیں۔ صاحب کی طرف سے پریشانی بہت تھی۔ الحمدو فجر پڑھ کر تسبیح پھیرتی جا کر پیپل تلے بیٹھ جاتیں۔ اور منشی سوختہ سے باتیں کرتیں۔ وہ سب اس رات کے واقعے سے اب تک دہشت زدہ تھے۔

بھیّا اور ان کی بیگم کو رانی کھیت گئے تین چار دن گذرے تھے جب منگل آیا — بھگوان دین ان کی بی بی گنگا دئی اور بھانجے بھٹکو پرشاد ہاتھ میں لیے ماتھے پر تلک لگائے پُل والے مندر سے لوٹ کر پیپل کے نیچے آن بیٹھے۔

”بندگی ایدو کھالا“ بھگوان دین نے کہا۔

الحمدو نے تسبیح پھیرتے ہوئے ہنکارا بھرا۔

چند منٹ بعد جب انہوں نے اپنا وِرد ختم کیا بھگوان دین بولے۔ ”بھیّا بڑے سنکٹ میں ہیں۔ ایدو کھالا سُنیے۔ ہم نے اب تلک کسی کو تبلایا نہیں تھا۔ اب سُنیے جس رات یہ گجب ہوا اس سے تین روج پہلے کی بات ہے۔ اِی بھینسن کی سانی

کرت رہیں سبیرے سبیرے۔ بیگم صاحب آن پہنچیں۔ ان سے کہن۔ مالن ہم نے سنا ہے تم صاحب کی ممی کے لیے روز صبح موگرے کی مالا بنا کر لے جاتی تھیں اور ان کے لیے ہر جمعے کو مہندی پیستی تھیں۔ ای کہن جی ہاں۔ کہن ہمارے لیے کیوں نہیں گوندھتی ہو ہار اور پیستی ہو مہندی۔ ای کہن جب حکم کیجے بنا دیں گے۔ پھر ہم سے کہن کیوں مالی یہ کنواں کتنا گہرا ہے۔ ہم بتا دا یہاں بُوٹی اگت رہی ہم پنچ ہولی کے روج بُوٹی پیت رہے۔ بڑی بیگم صاحب ڈریں۔ اِی نشے میں آ کر ہم لوگ کہیں کنویں ہی میں چھلانگ نہ لگا دیں۔ انہوں نے اس کے اندر ڈھیر ساری مٹی بھروا دی۔

”بہو صاحب پوچھن۔ اب اس میں کوئی گرے تو نہ ڈوبے؟ ہم کہن۔ ارے نہیں بیگم صاحب تھوڑا ہاتھ پاؤں مار کر ڈول کی رسّی پکڑے اور تُرنت اسے اوپر کھینچ لیں — تو کاہے کو ڈوبے —“

سب چُپ رہے۔

”ایدو کھالا“ بھگوان دین نے بات جاری رکھی ”بھیّا بڑے کشٹ میں ہیں۔ ہم نے مندر میں ان کی کھاتر ہنومان چالیسا سروع کروا رکھا ہے۔“

وہ تینوں اٹھے اور سوختہ کے لیے پرشاد کا دونا پیپل کے چبوترے پر رکھتے ہوئے کچی بنگلیہ کی سمت چلے گئے۔

الحمدو نے تسبیح چوم کر آنکھوں سے لگائی کلائی میں لپیٹی اٹھ کر روش پر بےچینی سے ٹہلنے لگیں۔ لیموں کا ایک پتّہ توڑ کر سونگھا۔ آگے بڑھیں۔ امرود کے پیڑ کو غور سے دیکھا۔ اس کا ایک پتّہ بھی توڑا۔ واپس آ کر اپنے پتھر پر ٹک گئیں۔ سوختہ مہا دیو جی کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہے۔ سوچتی ہوئی آواز میں بولیں: ”منشی جی ہو — اللہ کی شان دیکھو۔ پھول پتّے درخت۔ چرند۔ پرند سب لاکھوں برس سے ویسے ہیں جیسے تھے — لیموں ہے تو اس کی مہک مزا وہی۔ آم ہے۔ جامن۔ کروندہ۔

بُھٹا جو پھل ترکاری چکھو۔ ویسن — بس آدم زاد خراب گیا:"

منشی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دنیا کی کوئی چُولے ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ کیوں منشی جی؟"

"ہاں امدو باجی۔ دنیا مقام عبرت ہے۔ آدمی اپنے آپ کو اچھے بُرے الفاظ میں، نیک و بد اعمال میں — سُروں میں ڈھال لیتا ہے کبھی بے سُرا ہو جاتا ہے۔"

"پوری طرح کہاں ڈھال پاتا ہے۔ منشی جی۔ ہمارے گھر کے پاس امام گنج میں قبرستان ہے۔ ہم جمعرات کے روز اپنے ماں باپ اور خاوند کی قبروں پر اگربتی سُلگانے جاتے تھے اور سوچتے تھے کیا کچھ یہ سب کہتے تھے کہ کریں گے نہ کر پائے نہ کہہ پاتے۔ ایک بیری ہم نے وہاں ایک مٹّی کی خالی ہانڈی پڑی دیکھی تو سوچے منشی جی کہ اس میں کھانا پکایا۔ بھاپ نکل گئی۔ کھانا لوگوں نے کھایا۔ خالی ہانڈی دھو دھا کر رکھدی۔ ہمرے باپ اسی آس میں جیے کہ ایکّہ بیچ کر تانگہ خریدلیں گے — یہی آرزو کرتے کرتے قبر میں جا لیٹے۔ ہمرے شوہر پچیس سال کی عمر میں گذر گئے ہم اٹھارہ سال کے تھے منشی جی جب بیوہ ہوئے۔ محنت مجوری کر کے لڑکن کو پالا۔ بیاہ کیے۔ اے منشی جی ہمرے آنگن میں امرود کے پیڑ رہے وہ تو ویسن ہیں — نہ ان کی خاصیت بدلی نہ مہک۔ ہمرے لڑکے آدم زاد۔ وہ بدل گئے۔ بہوؤں نے لڑ لڑ کر ہم کو گھر سے نکال دیا —"

"باجی۔ اب وہ سب یاد کرنے سے کیا فائدہ۔ جو بیت گئی سو بیت گئی۔"

"ہم یہاں پہنچے۔ بیگم صاحب کی اتنے برس خدمت کی۔ اب دیکھو ان میم صاحب کے تریا چلتّر۔ ارے اگر ڈوب جاتیں اس رات — توبہ توبہ آخ تھو خدانخواستہ بھیّا کو توالی چبوترہ —"

"اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر کی امدو باجی۔"

"کون دُعا وظیفہ ہم نے چھوڑا ہے بھیّا کی سلامتی کی خاطر۔ اللہ میاں لنگڑی چیونٹی کی دُعا بھی سُن لیت ہیں۔ کل رات ہم نے ایک عجیب خواب دیکھا منشی جی۔

جیسے اس باغ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ بڑی جڑ میں سے موگرا چنبیلی گلاب تینوں نکلے۔ تینوں جنے زمین پر بیٹھ کر جیسے کچھ ڈھونڈنے لگے تو کینچوے ان کے ہاتھوں سے چپٹ گئے۔ وہ اپنے ہاتھ جھٹکیں اور کینچوے انہیں چھوڑیں نہیں۔ پھر ان کے ہاتھ غائب۔ بڑی جڑیں موجود۔ ارے پھر منشی جی وہ تینوں خود موگرا چنبیلی گلاب بن گئے۔ اب جیسے ہم وہیں کھڑے تھے۔ ہم سوچا کیے کہ یہ پہلے موگرا چنبیلی گلاب تھے یا اب۔ بڑی عقل چکرائی منشی جی۔"

"ہاں پریشانی کا خواب تھا امدو باجی۔"

"پھر ٹھنڈی ہوا چلی اور جنگل میں سیار بولنے لگے۔" چند لمحوں بعد گفتگو کا رخ موڑا۔ "وہ کیا قصہ ہے کہ کٹ کٹو اجاڑے کی رات سیار چلّات رہے نواب آصف الدولہ نے پوچھا یہ کیا فریاد کرتے ہیں ان کے وزیر نے کہا جناب عالی ان کو سردی لگتی ہے۔ نواب آصف الدولہ نے سات سو دوشالے انہیں اڑھانے کے لیے بھجوا دیے —"

سرد ہوا کا جھونکا آیا۔

الحمدو نے دوسوتی کی چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹی۔ "موسم بدلنے لگا منشی جی اور دیکھو موسم بھی ہر برس ایک ہی سے آت ہیں۔ سردی گرمی۔ برسات۔ یہ نہیں کہ جاڑے میں گرمی پڑے۔ برسات میں جاڑا۔"

"امدو باجی۔ دو چار ایٹم بم اور پھٹنے دو ایسا بھی ہو جائے گا۔ بھیّا بتا رہے تھے کہ اب مسوری میں گرمی پڑنے لگی ہے۔"

ایک بڑی اسمارٹ سی سیاہ سر سیاہ گردن والی دھوبن چڑیا اپنی لمبی دُم کو جنبش دیتی گھاس پر چل رہی تھی۔ الحمدو اس پر نظر ڈال کر بولیں۔ "منشی جی ہو — کھر بنچا پہاڑ سے اتر آوا۔ جاڑے آگئے —!"

جُھکی جُھکی باورچی خانے کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ریڈرز روز میں سردیاں بڑی خوشگوار ہوتی تھیں۔ دوب پر تیرتا کُہرہ۔ درختوں پر دبیز دھند۔ پھولوں پر سرد منجمد بوندیں۔ سورج کی نئی نئی کرنوں کے ہمراہ ہزارہ سنبھالے کنٹوپ ڈانٹے، بھگوان دین پھلواری کی سمت بڑھتے نظر آتے۔ باڑے میں بھینسیں ڈکراتیں۔ چڑیوں کی چہکار شاگرد پیشے کی آوازوں پر غالب آتی۔ سوختہ جاڑوں میں بھی سامنے ندی پر جاکر اشنان کرتے تھے۔ سوریہ نمسکار کے بعد واپس آتے پیپل کے نیچے پوجا کرنے بیٹھتے۔ اس کے بعد اپنی برجی میں پہنچتے۔ عیدو ان کے لیے چارے آتا۔ پیالی ہاتھ میں لیکر نیل گاتے اور ہرنوں کو چارہ کھلانے نکل جاتے۔

پہلے موکلوں کی آمد سے دن کا آغاز ہوتا تھا۔ اب ریڈرز روز، گُلِ سرخ اور لال گلاب کی سرگرمیاں شروع ہوتیں۔ رانی کھیت سے واپسی پر بھی بھیا کے روزمرہ کے معمولات میں سرِمو فرق نہ آیا تھا۔ بریکفاسٹ کے بعد دفتر میں آن بیٹھتے۔ منشی سوختہ۔ مس چھوٹے لال۔ معراج احمد۔ سارے سب اڈیٹر۔ پروف ریڈر۔ کاتب آرٹسٹ وقت پر پہنچتے ہی اپنے کام میں مشغول ہوجاتے۔ ٹھیک گیارہ بجے عیدو چائے کی بہت بڑی کیتلی اٹھائے اندر آتے۔ ساتھ ان کے الحمدو کشتی سنبھالے اسٹاف کی میزوں پر چائے کی پیالیاں رکھتی جاتیں۔ بھیا اپنی ناکامیوں اور ذاتی پریشانیوں کے باوجود سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے۔ خوش گپیاں۔ مذاق۔ لطیفے۔ گُلِ سرخ اور لال گلاب والوں کے درمیان نوک جھونک جاری رہتی۔ پلائی وُوڈ والے برآمدے میں دونوں کے اڈیٹر آمنے سامنے بیٹھتے تھے۔ لال گلاب کے سمپادک دریافت کرتے: "کیوں صاحب اس شبد کا انوواد کس پرکار کیا جاوے؟"

مدیر گُلِ سرخ مسکرا کر جواب دیتے "لکھ دیجئے جو جو رہے ہیں۔"

"واہ آپ نے کیا بے جوڑ بات کہی۔"

"بے جوڑ تو انمل بے جوڑ ہے۔ بے مثال کے معنوں میں للّٰہ نہ استعمال کیجئے۔"

سمپادک کہتے — "صاحب۔ ہمارے محاورے الگ۔ آپکے الگ۔"

مدیر اعلیٰ اپنی میز پر سے آواز دیتے: "مل بانٹ کر کھاؤ بھائی مل بانٹ کے۔"

اندر بیلا کا دن اکتاہٹ اور ڈپریشن سے شروع ہوتا۔ نرسری کا فرنیچر پچھلے برآمدے میں پڑا تھا۔ اسے دیکھ دیکھ کر روتیں۔ پھر زنانہ رسالوں میں کھانے کی ترکیبیں پڑھنے بیٹھ جاتیں۔ پلنگ پر لیٹی رہتیں یا کوئی کمرہ از سرِ نو سجانا شروع کردیتیں۔

وہ اتوار کی ابر آلود صبح تھی۔ قنبر بیڈ ٹی پینے کے بعد فوراً تیار ہوتے۔ کوئی روسی وفد نئی دہلی سے آرہا تھا۔ اس کے خیر مقدم کے لیے ایرپورٹ چلے گئے۔ بیلا اپنے وقت پر بستر سے اٹھیں۔ پہاڑ سا دن کاٹنے کو پڑا تھا۔ ناشتے کے بعد سوچتی رہیں۔ آج کیا کریں۔ الحمدو کو آواز دی۔ وہ آئیں۔ "بیرے کو بلا کر لاؤ۔" انہوں نے حکم دیا۔

عیدو جھاڑ پونچھ کر رہے تھے۔ جھاڑن کندھے پر پھینکتے ہوتے وہ بھی نمودار ہوتے۔ بیلا نے کنجیوں کا موٹا گچھا سنبھالا۔ بنگالی کہانیوں پر مبنی پکچروں میں بہت دیکھا تھا کہ گھر کی بہو کنجیوں کا گچھا آنچل کے کونے سے باندھے رہتی ہے بیلا بنگالی طرز کی ساری نہیں پہنتی تھیں۔ لیکن ملکیت کے راحت بخش احساس کے ساتھ چابیاں چھنکاتی، سرت چندر بوس کی کسی ہیروئن کیطرح سہج سہج چلتی باہر گئیں۔

بیرونی برآمدے کے دونوں طرف ڈیڑھ برجی نما کشادہ کمرے بنے ہوتے تھے۔ ایک میں سالہا سال سے سوختہ قیام پذیر تھے۔ وہ ہر پندرھویں دن جمعے یا سنیچر کی شام بس پکڑ کر دو گھنٹے سفر کے بعد اپنے گاؤں پہنچتے تھے جہاں انکے آبائی کچے مکان میں ان کی بیوی، دو ودھوا بھاوجیں ایک ودھوا بہن مع اپنے بچوں کے رہتی تھیں۔ منشی جی اولاد نرینہ نہ رکھتے تھے۔ تین لڑکیاں تھیں۔ جنکی شادی بیاہ

کے فرض سے سبکدوش ہو چلے تھے۔ اتوار کی شام پابندی سے کوٹھی پر واپس پہنچ جاتے اور ہمیشہ گاؤں کی کوئی نہ کوئی سوغات لیکر آتے۔ گڑ۔ ہرے بونٹ۔ سنگھاڑے۔ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھے دیر تک پڑھا کرتے۔

دوسرے برجی نما کمرے میں بڑو بیگم مرحومہ نے گھر کا فالتو سامان مقفل کر رکھا تھا اور ایسی چیزیں جو کبھی کبھی استعمال میں آتی تھیں۔ چاندنیاں۔ گاؤتکیے مہمانوں کے لیے لحاف توشک۔

مردانہ گیسٹ روم مع باتھ روم تیسرے برآمدے کے سرے پر واقع تھا۔ زنانہ گیسٹ روم اندر تھا۔

بیلا نے برجی کا تالا کھولا۔ اندر جا کر سامان کا جائزہ لیا۔ عیدو اور الحمدو کو پکارا اور چیزیں اٹھوانا شروع کیں۔ ”کہاں رکھوائیے گا؟“ عیدو نے پوچھا۔

”وہ جو کمرہ ہمارے بیڈ روم کے بازو میں ہے جسے تم لوگ زنانہ مہمان کمرہ بولتے ہو۔ اس کے برابر ہم نے کچن بنوایا ہے۔ ہم اس میں — اس میں نرسری —“ آنسو پی کر کہا۔ ”اب ہم اس کا بریکفاسٹ روم بنائیں گے — یہ کمرہ بیکار پڑا ہے اسے ہم لیڈیز گیسٹ روم کیے دیتے ہیں۔“

”بڑے مہمان لوگ یہاں کہاں رہیں گی برساتی کے پاس؟ اور باتھ روم کہاں جائیں گی؟“ الحمدو نے ناک پر انگلی رکھ کر سوال کیا۔

”منشی جی کدھر جاتے ہیں؟“

”وہ تو ہم لوگوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ مہمان بیبیوں کو آپ کیا اُدھر بھیجیے گا؟“

”دیکھا جائے گا۔ یہاں کون سی باؤس گیسٹ لوگ کا تانتا بندھا ہے۔ میرے ہوتے تو کوئی چوہیا بھی مہمان نہیں آئی۔“

”بیگم صاحب کے زمانے میں تو برابر آتی تھیں۔ ایک سے ایک لیڈی لوگ۔ ولایت تلک سے آتی تھیں۔“

”سنو الحمدو۔ مجھ سے بحث مت کرو جو میں حکم دوں خاموشی سے کرتی جاؤ۔ یہ نمکدان اٹھاؤ۔ مانجھ کر ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دو۔“

الحمدو دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر ہنسیں۔ ”یہ نمکدان نہیں بیگم صاحب کا قلمدان ہے چاندی کا۔“

”خیر ہوگا۔ اور یہ ایسے خوبصورت گلدان بھی یہاں پڑے ہیں۔“

”اگالدان ہیں بہو صاحب۔“

وہ جھلا گئیں۔ عیدو سے کہا۔ ”کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو یہ سارے لحاف گدّے اٹھا کر ہمارے بیڈ روم کے برابر والے کمرے میں رکھ آؤ۔ چلو —“

ماسٹر بیڈ روم اور زنانہ مہمان کمرے کا درمیانی کمرہ بڑو بیگم مرحومہ کا ڈریسنگ روم تھا۔ الحمدو پیچھے پیچھے گئیں۔ ”بہو صاحب۔ یہ بیگم صاحب کا جامے خانہ ہے۔ اسے گودام نہ بنائیے۔“

”جو میں کہہ رہی ہوں کرو۔ سُنا کیا؟“

الحمدو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”ارے پہلے کوٹھیوں میں رہنا تو سیکھیے۔ پھر حکم چلائیے۔“

بیلا اس گستاخی پر سنّاٹے میں آگئیں۔ پیر پٹخ کر چیخیں — ”نکل جاؤ اسی وقت فوراً۔ پہلی تاریخ کو آ کر حساب کر لینا۔“

الحمدو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر سرد آواز میں کہا۔ ”چلے بھی جائیں گے۔“

”کالا منہ کرو۔ گٹ آؤٹ۔“

چُپ چاپ الحمدو اور عیدو نے لحاف۔ توشک گاؤتکیے باہر سے لا لا کر ڈریسنگ روم میں رکھے۔ کام ختم کر کے الحمدو نے ہاتھ جھاڑے اور ماتھے پر تین انگلیاں لیجا کر کہا ”اچھا سلام بہو صاحب۔ بوڑھ سہاگن ہو جیے —“

”گٹ آؤٹ۔“

عیدُو سکتے کے عالم میں کھڑے رہے الحمدو رم جھم آنسو بہاتی کوارٹروں کی سمت روانہ ہوگئیں۔

اپنی کوٹھری میں جاکر اسباب باندھنا شروع کیا۔ سارے ملازمین اور ان کے بچے پرسشِ احوال کے لیے جمع ہوگئے۔

بیلا پچھلے برآمدے میں نمودار ہوتیں۔ عیدُو کو آواز دی: "بیرہ" وہ ہمیشہ عیدو کو بیرہ ہی پکارتی تھیں: "آیا کے سامان کی تلاشی لو——"

سب چُپ رہے۔ عیدُو بھی ٹس سے مَس نہ ہوئے۔

"آیئے آپ خود دیکھ لیجیے:" الحمدو نے للکارا۔

"ارے امدو باجی یُو تو بک جھک کر چُپ ہو جئیں۔ کہاں جات ہو۔ یُو تو اب بھی صاحب کا مارے دوڑت ہیں۔ ان کی بھلی چلائی:"

بھگوان دین نے آہستہ سے سمجھایا۔

بیلا آن پہنچیں۔ الحمدو دونوں بکس گھسیٹ کر کوارٹر کے برآمدے میں لائیں۔ ایک ایک کپڑا جھاڑ کر انہیں دکھلایا۔ بیگم صاحبہ مرحومہ کے دیے ہوئے پرانے غرارے۔ دوپٹے۔ قمیصیں۔ سویٹر۔ شالیں۔

"یہ سب جنّت سدھارنے والی نے ہمیں دیا تھا ہم نے کچھ چُرایا نہیں ہے۔ باقی یہ ہماری چاندی کی چوڑیاں ہیں۔ بالیاں۔ جمیل۔ اور یہ سونے کی دو چوڑیاں بیگم صاحب نے بنوادی تھیں جب اللہ رکھے بھیّا انورسٹی پاس ہوتے تھے:"

"اچھّا اچھا ٹھیک ہے:" بیلا ذرا نادم سی واپس گئیں۔

الحمدو نے سارا اثاثہ فرش پر بکھیر دیا تھا۔ بڑے صندوق کی تہہ میں بچھا اخبار اٹھانا یاد نہیں رہا۔ جس کے نیچے نکاح نامے کا سربمہر لفافہ پوشیدہ تھا۔ شادی کے

بعد ایسے تابڑ توڑ خوفناک واقعات پیش آئے تھے کہ وہ لفافہ منشی جی یا بھیّا کے حوالے کرنا ہی بھول گئی تھیں۔ چلتے وقت بھی ان کے ذہن سے اتر ا رہا۔

"اب کہاں جاؤ گی:" رمضانی نے پوچھا۔

"امام گنج ہی جاویں گے۔ اور کہاں جاویں گے:"

"بھیّا کو آجانے دو امدو کھالہ۔ ایسا غجب نہ کرو:"

نہیں۔ پھنکُو۔ ہمرا دل ٹوٹ گوا۔ ہمرے سامان کی تلاشی لی۔ اب ہم یہاں کیسے رہ سکت ہیں:"

"اچھا منشی جی کو تو آجانے دو——"

"جب انہوں نے کہا ہے گٹ آؤٹ گٹ آؤٹ تو اب یہاں رک کر اپنی اور بے عزتی کروائیں اس بڑھاپے میں؟ جا بھیّا پھنکُو میرے لیے رکشا تو لے آ بس اڈّے کے لیے۔ جا میرے بچّے——"

"ٹھیرو امدو باجی۔ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ تمہارا پتہ تو بھیّا کو معلوم ہوگا۔ وہ ضرور واپس بلوالیں گے۔ چلو تم کو بس تلک چھوڑ آویں:" رمضانی نے ہتھیلی سے آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔

منشی سوختہ اس روز صبح دم ہی بابا نیم چمیلی کے درشن کے لیے بالا گنج چلے گئے تھے۔ دو سائیکل رکشا رمضانی، الحمدو اور ان کے اسباب کو لادے ریڈرو کے ایک پھاٹک سے باہر نکلے۔ پندرہ بیس منٹ بعد منشی سوختہ دوسرے پھاٹک سے داخل ہوئے۔

---

۴ کادمبری

بیلا شاگرد پیشے سے لوٹ کر مضطرب سی اپنے کمرے میں آئیں ۔ سوچا عرصے سے ٹائپنگ کی پریکٹس نہیں کی ۔ آفس روم میں گئیں. بڑی چھوٹے لال کی کرسی پر بیٹھ کر ریمنگٹن کا غلاف اُتارا۔ کاغذ چڑھایا۔ جی اچاٹ رہا۔ ساس کی وفادار خادمہ۔ قنبر اسے اتنا چاہتے تھے۔ اس طرح کھڑے کھڑے نکال کر جلد بازی کی۔ مگر میں جو اتنے نامی گرامی شوہر سے نہیں دبتی دو ٹکے کی مُنہ چڑھی نوکرانی کے طعنے اور بدتمیزی سہونگی ؟

ٹاپ کرنا شروع کیا۔ برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ سمجھ گئیں وہ والرس جیسی مونچھوں والا بڈھا آگیا۔ منشی کوفتہ۔ اب شاید وہ بازپرس کرے۔ قنبر واپس آکر جانے کتنا چیخیں چلائیں گے۔ یا ممکن ہے اس معاملے کو بھی پی جائیں۔

سوختہ نے چق اٹھائی۔ انکے پیچھے ایک عورت کی جھلک دکھلائی دی بیلا ڈریں کہ راستے میں الحمد و منشی کو مل گئی ہوگی۔ اسے واپس لائے ہیں۔

منشی جی نے کھنکار کر کہا۔ "ایک بی بی بھیا سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔"

اوہ۔ بیلا نے اطمنان کی سانس لی۔ تینوں میگزین ذرا ذرا پنپ چلے تھے۔ حال ہی میں قنبر علی نے تینوں میں پبلک کی شکایات کے لیے ایک ایک صفحہ مخصوص کردیا تھا۔ لوگ باگ اپنے اپنے کھرّے لیکر آنے لگے تھے۔ ان میں برقعے والیاں بھی خاصی تعداد میں ہوتی تھیں۔

"بلائیے۔"

باہر گئے۔ ایک برقعہ پوش ذرا جھجھکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ٹائپسٹ کی مقابل کی کرسی پر ٹِکیں۔ تھکی ماندی لگتی تھیں۔ نقاب اٹھائی۔ موٹے شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ معمولی ساری۔ سفید پلاسٹک کی چوڑیاں۔ گلابی ربر کی چپلیں عوام کی اصل نمائندہ۔ قنبر اسی قسم کے لوگوں پر تو فدا تھے۔ بیلا اخلاقاً مسکرائیں۔ ان کا شکایت نامہ موصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

نو وارد قطع سے بیلا کو کرسچین ٹائپسٹ سمجھیں کہ بنج گنی کی تعلیم یافتہ اور بمبئی کی پروردہ مسز علی گھر پہ عموماً سلیکس اور جرزی میں ملبوس رہتی تھیں۔ ان بی بی نے چاروں طرف نظر ڈال کر خفیف سے مخاصمانہ انداز میں بات شروع کی۔ "آج تو اتوار ہے۔ آپ آج بھی کام پر آئی ہیں؟ چرچ نہیں گئیں؟"

"جی نہیں۔ میگزین کا ورک سنڈے کو بھی چالو رہتا ہے۔" بیلا نے بھی ذرا سے پنجے نکالے۔ منشی سوختہ نے پھر چق اٹھائی۔ ایک سُوٹ کیس اور لوٹا سنبھالے کمرے میں آئے۔ باہر جاکر بستر بند لے آئے۔ اور گرد آلود اسباب مہمان کی کرسی کے نزدیک رکھدیا۔ بیلا نے سوالیہ نگاہوں سے منشی کو دیکھا۔ اور مسکرائیں۔ الحمد و کے واقعے کے بعد سوختہ کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری تھی۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ سادھے پھر باہر چلے گئے۔

"میں ظفر پور سے آئی ہوں۔ سیدھی ریلوے اسٹیشن سے آرہی ہوں۔"

بیلا ظفر پور کے نام سے واقف تھیں۔ قنبر کی ننھیال۔ ساس وہیں مری تھیں۔ بولیں — "ظفر پور — وہ تو بہت دور ہے۔"

"جی ہاں۔ ہمالیہ پہاڑ کے نزدیک۔ رات بھر کا سفر تھا۔"

"تب تو آپکو کنٹال آیا۔"

"جی — ؟"

"اپنے کو انٹروڈیوس تو کرنا چاہیے۔"

"میں قمبر صاحب کی خالہ کی لڑکی ہوں۔ چاندنی بیگم۔"

"ہلو——" بیلا کو علم نہ تھا کہ قمبر کی کوئی خالہ بھی موجود ہیں انہوں نے بتلایا تھا کہ سارے ننہیالی پاکستان چلے گئے۔

"سگی خالہ——؟"

"سگی ہی سمجھئے۔ بلکہ سگوں سے زیادہ۔"

بیلا نے گھنٹی بجائی۔ منہ پھلائے عبدو حاضر ہوئے۔

—— الحمدو کی بے عزتی اور اچانک روانگی سے سارا شاگرد پیشہ بیحد مغموم تھا اور میم صاحب کا بہت زیادہ مخالف ہوگیا تھا۔ عادتاً منہ سے نکلا الحمدو کو بھیجو۔ فوراً خیال آیا وہ خر دماغ بڑھیا اب کہاں۔ کہا "چاء لاؤ۔ آپ نے ناشتہ تو نہ کیا ہوگا۔ آئیے اندر چلیے۔ صاحب شام تک آئیں گے۔"

چاندنی بیگم نے محسوس کیا کہ کرسچین سکریٹری قمبر علی کے گھر پہ حاوی ہے۔

"صاحب رُوسیوں کو لینے گئے ہیں۔ دن بھر انکے ساتھ رہیں گے۔ میں بول نہیں سکتی کب تک لوٹیں۔ جرنلسٹوں کے ٹائیم کا کچھ ٹھیک نہیں۔" دوبارہ ٹائپ شروع کیا۔

عبدو ٹرے میز پر رکھ گئے۔

قمبر علی سے اپنائیت ظاہر کرکے اس ٹائپسٹ گرل کو اسکے صحیح مقام پر پہنچانے کی غرض سے چاندنی بیگم نے پھر گفتگو کا آغاز کیا۔

"افسوس کہ بتّو خالہ——"

"بتّو خالہ——؟" بیلا نے سر اٹھا کر بے دھیانی سے دہرایا۔ چاء بنائی۔

"قمبر میاں کی والدہ——"

"اوہ یس—— اف کورس—— آپ صاحب سے کب سے نہیں ملیں؟"

"کبھی نہیں۔ ایک بار بتّو خالہ کے ساتھ ظفر پور تشریف لائے تھے جب مسوری

میں پڑھتے تھے۔ اماں سے ملنے آئے۔ میں اسکول گئی ہوئی تھی۔" چاندنی بیگم نے جواب دیا۔ سچ بولنا بھی ضروری تھا۔

"ظفر پور میں آپ کیا کرتی ہیں؟"

"کالج میں پڑھاتی تھی۔ تین دن ہوئے استعفےٰ دیدیا۔"

دور گرجا گھر میں سُریلے گھنٹے بج رہے تھے۔ دریچے میں ایک پرندہ آن بیٹھا۔ بالکل کرسمس کارڈوں والے روبن ریڈ بریسٹ جیسا۔ بیلا اسے دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔

پرندہ اُڑ گیا۔

"میری باجی اماں بھی اسیطرح اچانک پھُر سے اڑ گئیں"

چاندنی بیگم کی آواز پر وہ چونکیں۔

"انہوں نے بھی حد کردی۔ زنگ آلود چاقو سے ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ ہاتھ کٹ گیا۔ میں نے کہا اینٹی ٹیٹنس انجکشن لگوا لیجئے۔ انہوں نے پرواہ نہیں کی۔ پٹی باندھ کر کام کاج میں لگی رہیں۔ جسم میں زہر پھیل گیا۔ ابھی دو مہینے پہلے کی تو بات ہے۔ میں نے قمبر میاں کو اطلاع دی تھی۔ شاید انہیں خط ملا نہیں ورنہ تعزیت کی دو سطریں ضرور لکھ بھیجتے۔ دنیا میں اب انکے سوا میرا کوئی بھی سہارا نہیں ہے۔" دفعتاً چاندنی بیگم لرزاں ہاتھوں سے چاء کی پیالی میز پر رکھ کر رونے لگیں۔

بیلا گھبرا کر اٹھیں۔ انکے قریب جاکر دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ "ارے آپ تو بہت ہی زیادہ دکھی معلوم ہوتی ہیں۔"

"دُکھی سی دُکھی" چاندنی بیگم نے چشمہ اتار کر برقعے کے کونے سے آنسو خشک کیے۔ بیلا نے نوٹس کیا کہ موٹی عینک نے انکی صورت بگاڑ دی تھی ورنہ وہ کافی دلکش تھیں۔

"آرام سے بیٹھو یہاں کوئی نہیں ہے۔"

چاندنی نے برقعہ اتارا۔

گرجا گھر میں گھنٹے بجا کیے۔

"اور آپ کے ڈیڈی۔ وہ کہاں ہیں؟"

"پاکستان گئے۔ وہاں سے باجی اماں کو طلاق لکھ بھیجی"

"اور کوئی سگے والے نہیں ہیں؟ میرا مطلب ہے رشتے دار۔۔؟"

"ہیں۔ سب خود غرض۔ کمینے۔ جو اچھے رشتے دار تھے وہ مر گئے۔ میرے دادا ——" وہ تلخی سے ہنسیں "بابا میرے ہفت ہزاری۔ دادا صوبیدار ——! میرے گرینڈ فادر خان بہادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نانا بڑے زمیندار۔ وہ کیا میری خاطر سَو سَو برس جیتے؟ اپنا اپنا وقت آنے پر مر گئے۔ زندوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ابا کے جانے کے بعد ان سب نے آنکھیں پھیر لیں کہ باجی اماں کی اور میری کفالت نہ کرنا پڑے۔ باجی اماں بے چاری نے خود بی اے بی ٹی کیا۔ مجھے ایم۔اے۔ بی ایڈ کروایا۔ بس ایک بٹّو خالہ تھیں کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ ہم وطن تھیں اور اماں کے ساتھ علیگڈھ اسکول میں پڑھی تھیں۔ جب کبھی بٹّو خالہ ظفر پور آتیں باجی اماں کی خیر خبر لیتیں۔"

بیلا مبہوت رہیں۔

"بٹّو خالہ نے ایک آدھ بار مالی امداد بھی کرنا چاہی مگر میری باجی اماں اتنی غیور تھیں کبھی ایک پیسہ ان سے نہ لیا۔ بٹّو خالہ کوئی نئی ساری یا کپڑے لے آتیں وہ بھی بڑی مشکل سے قبول کرتی تھیں۔ تین سال ہوئے بٹّو خالہ ظفر پور آئیں اور انہوں نے —— انہوں نے ——"

اب بیلا بڑے غور سے سُن رہی تھیں۔

"—— انہوں نے اماں سے کچھ بات بھی کی تھی۔"

"کیا بات ——؟" بیلا نے چونک کر پوچھا۔

"اب تم سے کیا چھپاؤں۔ تم نیک سی لڑکی معلوم ہوتی ہو حالانکہ میں نے اب لوگوں پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ پھر بھی۔ تم قمبر میاں کی سکریٹری ہو تو انکے سبھی معاملات سے واقف ہو گی۔ شاید انہوں نے تم سے ذکر بھی کیا ہو ——"

"انہوں نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"بٹّو خالہ نے باجی اماں سے میرے متعلق تقریباً طے کر لیا تھا۔"

بیلا کا حلق خشک ہو گیا۔

"اور انہوں نے یہاں واپس آکر اماں کو لکھا کہ قمبر میاں نے تصویر دیکھی اور پسند کیا۔ اور اب وہ جلد ظفر پور آنے والے ہیں۔"

"پھر ——؟"

"پھر کیا۔ پہلے ان کے میاں جان مرے۔ پھر بٹّو خالہ۔ پھر میری باجی اماں۔ والدین کی ایک بُری عادت یہ ہے کہ موقع پاتے ہی مر جاتے ہیں اولاد پڑی جھینکتی رہے۔ ان کی بلا سے —— اماں کے انتقال کے بعد میں اکیلی کیسے رہتی۔ ڈھنڈار مکان۔ نہ نوکر نہ چاکر۔ جس گرلز کالج میں اماں اور میں پڑھاتے تھے وہ پرنسپل اور ان کے شوہر کی ذاتی ملکیت ہے۔ انہوں نے کہا تنہا کیسے رہو گی ہمارے ہاں آجاؤ۔ میں ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ بڑے میاں ابا کے دوست تھے۔ جوان اولاد کے باپ۔ تین ہفتے ان کے ہاں رہتے گذرے تھے کہ بڑھئو کی نیت میں فتور آگیا۔"

"ارے۔ یُو ڈونٹ سے ——"

"جہاں بیوی کی پیٹھ مڑی ذومعنی باتیں کرنے لگیں۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ارادہ کیا ان کی بیگم سے کہہ دوں۔ مگر اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ایک رات

جب سب لوگ سو چکے تھے آہٹ پر میری آنکھ کھُلی۔ دیکھا بڑے میاں میرے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہیں۔ میں نے گھبرا کر بتی جلائی۔ کھسیانے ہو کر واپس بھاگے۔ بیوی شاید باتھ روم جانے کے لیے اٹھی تھیں۔ انہوں نے شوہر نامدار کو چوروں کی طرح میرے کمرے سے بھاگتے دیکھ لیا۔ انھیں پہلے سے کچھ شبہ ہو چلا تھا۔ طوفان کھڑا ہو گیا۔ بڑے میاں نے کہا یہ آوارہ لڑکی ہے۔ جب سے یہاں آئی ہے میرے پیچھے پڑی ہے کہ میں بے سہارا ہوں پرنسپل صاحبہ تو بڈھی کھوسٹ ہو گئی ہیں مجھ سے نکاح کر لو۔

”بیوی نے یہ سنکر بای اٹھائی اور مجھے مارنے دوڑیں۔ میں نے بھی بہت شور مچایا۔ سارا گھر جاگ گیا۔ صبح ہوتے ہی میں نے استعفےٰ لکھ کر بیوی کے ہاتھ میں پکڑایا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا سوائے اس کے کہ ریل پر بیٹھ کر قمبر صاحب کے ہاں پہنچ جاؤں اس امید پر کہ بٹو خالہ والا وعدہ شاید ان کو یاد ہو——“

بیلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاندنی کو تک رہی تھیں۔

”تم کو یہ قصہ سنکر بڑا افسوس ہوا۔“

”افسوس سا افسوس۔“

عید کمرے میں آتے۔ ”بیگم صاحب گیارہ بج رہا ہے۔ سودے کے لیے پیسے دید یجئے——“

چاندنی بیگم پر جیسے بجلی گری۔

بیلا باورچیخانے کی طرف چل دیں۔ معلوم ہوا رمضانی احمد و کو بس پر پہنچانے گئے ہیں۔ زیتون کو حکم دیا کہ لنچ تیار کریں۔ واپس آئیں۔ چاندنی بیگم کرسی پر بُت بنی بیٹھی تھیں۔ انہوں نے متوحش نگاہوں سے اس گھر کی مالکن کو دیکھا۔

”آئی ایم سوری۔“ بیلا نے آہستہ سے کہا۔

وہ چُپ رہیں۔

”قمبر نے مجھ سے کبھی آپ کا تذکرہ ہی نہیں کیا میں بالکل لاعلم تھی اور وہ اتنے بُھلکڑ آدمی ہیں کہ مجھے یقین ہے وہ خود اس بات کو فراموش کر چکے ہیں جو ان کی ممی نے آپ کی مدرسے کی تھی ورنہ وہ بہت اصول پرست کھرے سچے سیدھے انسان ہیں۔ اگر انہیں ذرا بھی یاد ہوتا —— ارے وہ تو ایسے بھلکڑ ہیں کہ بعض دفعہ مجھے بیلا کے بجائے شبری شبری پکار بیٹھتے ہیں۔ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ کوئی بنگالن کلاس فیلو تھی —— اچھا —— خیر —— اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ دھواں دھار سفر سے آئی ہیں نہا لیجئے میں نے حمّام گرم کروا دیا ہے۔ پھر آرام —— ہمارے لیڈیز گیسٹ روم میں —— اسے ابھی ٹھیک کروائی ہوں۔ ایک بجے لنچ۔“

”کہاں کا لنچ اور کیسا ڈنر۔ میں اب یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہرنا چاہتی۔ میں تو شرم سے گڑی جا رہی ہوں۔ یہ قصہ سنانے کے بعد اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہوں۔ آپ کتنی ہی نیکدل سہی مگر میں آپ کو اور آپ کے شوہر کو اپنی صورت نہیں دکھانا چاہتی۔ اور انہوں نے دیکھی ہی کب تھی میری منحوس صورت۔“

”ارے ایسا نہ کہئے آپ تو بہت گڈ لُکنگ ہیں۔ آپ کو نٹیکٹ لینس لگایا کیجئے۔“

”مجھے کسی اور جگہ پہنچا دیجئے۔ وہاں ٹِک کر کوئی نوکری ڈھونڈ لونگی۔ آپ تو یہاں بہت لوگوں کو جانتی ہوں گی۔“

”کسی کو نہیں جانتی ——“

”مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی —— شیخ قمبر علی اڈیٹر ریڈرز کی شادی کی اطلاع مجھے کیوں نہ ہوئی؟ ظفر پور اللہ میاں کے پچھواڑے آباد ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں۔ کسی کی آمد و رفت نہیں۔ لیکن یہ خبر پیپرز میں تو ضرور چھپی ہوگی۔“

"ان کی ممی کی برسی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے کوئی دھوم دھام نہیں کی گئی۔ عقد نہایت سادگی اور خاموشی سے ہوا۔" یہ کہہ کر بیلا دل ہی دل میں ہنسیں۔

"اچھا۔ اب مجھے کہیں پہنچا دیجیے۔" چاندنی نے دہرایا۔

"بھئی میں آپ کو کہاں لے جاؤں۔ میں خود یہاں اجنبی ہوں۔ میرے ہزبینڈ کام میں اتنے مصروف رہتے ہیں۔ ہماری کوئی سوشل لائف ہے ہی نہیں۔ ارے — ہاں — تین کٹوری ہاؤس — خوب یاد آیا —"

"چھوٹی کٹوری بھی تو —"

"آپ کو معلوم ہے!"

"بٹو خالہ مرحومہ نے باجی اماں کو بتلایا تھا۔"

"چھوٹی کٹوری ہی نے اپنے گھر پہ اسکول کھول رکھا ہے۔ وہاں آپکو جوب مل جائے گا۔ بہت بڑا مکان ہے۔ رہنے کو جگہ بھی —"

"چلیے۔ ابھی چلیے۔ فوراً۔ قنبر میاں کے آنے سے پہلے۔"

"کھانا تو کھا لیجیے۔"

"اس گھر کا آب و دانہ میری قسمت میں نہیں ہے۔" چاندنی نے جھک کر لوٹا اٹھایا۔ بیلا نے سوچا۔ ٹھیک ہے یہی بہتر ہے کہ یہ ناگہانی آفت قنبر کے آنے سے پہلے ہی ٹل جائے۔ عیدو کو رکشا لانے کا حکم دیا۔ پہلے سوچا کرتی تھیں شادی کی پہلی سالگرہ پر اپنے لیے کار کی فرمائش کریں گی۔ میاں وہی تنگدستی کا رونا روتے۔ یہ مار پیٹ کر کے فیٹ خرید وا ہی لیتیں — مگر کنویں والی ٹریجڈی کے بعد سے اتنی داداگیری کی ہمت نہیں رہی تھی۔

رانی صولت زمانی کی خوابگاہ میں کپڑے سیے جا رہے تھے۔ منجھلی صاحبزادی پروین سلطانہ عرف پینی میکے آئی ہوئی تھیں اور بے شمار ساریاں خرید کر کراچی

واپس جانے والی تھیں — وہ تخت پر بیٹھی بڑے انہماک سے ایک بلاؤز کی آستین ماپنے میں جٹی تھیں۔ چھوٹی صفیہ سلطان عرف فینی رنگ برنگے فال ساریوں سے میچ کر رہی تھیں سب سے بڑی زرین سلطانہ عرف جینی دوسرے تخت پر غرارے کی گوٹ تراشنے میں مصروف تھیں۔ الاچی خانم فرش پر آلتی پالتی مارے دھنک کے گوٹے بنا رہی تھیں۔ رانی صاحبہ چھپر کھٹ پر نیم دراز تمام کارروائیوں کو سُپروائز کر رہی تھیں۔ ایسے پرسکون ماحول میں بیگم قنبر علی بم کے گولے کی طرح آن گریں۔ ایک مجہول سی برقعہ پوش عورت ان کے پیچھے پیچھے داخل ہوئی۔

بیگم علی شادی کے بعد پہلی بار تین کٹوری ہاؤس آئی تھیں۔ پچھلی بار بحیثیت مغنیہ باہر چبوترے پر بیٹھ کر طبلے سارنگی کے ساتھ غزلیں گاتی تھیں۔ آج خدا کی شان ہے کس تمکنت سے فرانسیسی کاؤچ پر براجیں۔ بُٹرن بتلا گئی تھی ایسی دبیٹ ہیں کہ میاں کی ٹھکائی بھی کرتی رہتی ہیں۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

آج وہ تین کٹوری والوں کی ٹکر کے خاندان کی بہو تھیں اور قنبر علی جیسے اہم اور نامور آدمی کی بیوی۔ اپنے آپ کو واقعی بیگم سمجھنے لگی تھیں کیونکہ تقریباً نیم پردے میں رہتی تھیں۔

برقعہ پوش اب تک جھجکی ہوئی کھڑی تھی۔ پروین عرف پینی کی نظر اس کی ربر کی چپلوں پر گئی۔ پیڑھی کی طرف اشارہ کیا یعنی وہاں بیٹھ جاؤ۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

بڑی صاحبزادی زرینہ سلطان نے کہا۔

"اوہو بیلا رانی شوخ کیسی ہو۔ شادی کے بعد ادھر کا رستہ ہی بھول گئیں۔"

"آپ نے کبھی بلایا بھی؟" پھر بیلا نے چاندنی کو محبت سے مخاطب کیا۔

"بیٹھتی کیوں نہیں؟"

"ہاں ہاں بیٹھ جاؤ — پیڑھی لے لو۔" زرینہ سلطان نے کہا۔

طویل سفر اور صبح کو منزلِ مقصود پر پہنچ کر قیصر کی شادی کی لرزہ خیز انکشاف نے چاندنی کو نڈھال کر دیا تھا۔ وہ دھم سے پیڑھی پر گر سی گئیں اور تخت کے پائے سے ٹیک لگالی۔ بیلا نے متنفر نگاہوں سے ان بیجس بیویوں کو دیکھا جو سینکڑوں برس سے غریب عورتوں کی تذلیل کرتی رہی تھیں۔ "بیوی" اور "باندی" دو مختلف طبقے تھے۔ اب اگر اس وقت وہ خود چاندنی کا ساتھ دینے کے لیے فرش پر بیٹھ جاتیں تو بیویاں سمجھتیں کہ ڈومنی کو اپنی اوقات یاد آگئی۔

بادل ناخواستہ صوفے پر جمی رہیں۔

"یہ کون ہیں؟" صفیہ نے دریافت کیا۔

"انہی کی خاطر آنا پڑا۔ اگر آپ کے اسکول میں جگہ ہو ان کو ٹیچر رکھ لیجیے۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہیں۔ کالج میں پڑھاتی تھیں۔"

"اسکول تو ہمیں فی الحال بند کرنا پڑا۔ معلوم ہوا اسی نام کا ایک سینٹ جانز کانونٹ نخاس میں کئی سال سے چل رہا ہے۔ اب ہمیں نام بدلنا پڑے گا۔"

"کسی اور رومن کیتھولک سینٹ کا نام سوچ لیجیے۔" بیلا نے طنزاً کہا۔

صفیہ سلطان کے اوپر سے گزر گئی بولیں: "تقریباً سارے رومن کیتھولک سینٹ پرائیویٹ اسکولوں میں کھپ گئے۔ اب میں نے سینٹ صفیہ کانونٹ ہی طے کر لیا ہے۔"

"سینٹ صفیہ کانونٹ۔ سبحان اللہ۔" بیلا پر ہنسی کا دورہ سا پڑا۔ صبح صبح پہلے الحمد و کا ٹنٹا۔ اس کے فوراً بعد چاندنی بیگم کی غیر متوقع آمد اور اس کا ٹنشن۔ بیلا کے اعصاب بھی جواب دے رہے تھے۔

"اسٹاف میں تو جگہ ہے نہیں۔ آیا کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری اپنی ماما میں مہریاں بہت کافی ہیں۔ باقی یہ کہ —"

"یہ بہت ضرورتمند ہیں۔" بیلا نے لجاجت سے کہا۔ غرض اور مجبوری انسان

کو پل کی پل میں جھکا دیتی ہے۔ چاندنی کو یہاں ضرور بالضرور نوکری ملنا چاہیے۔ کسی حالت میں ریڈ روز واپس نہ آئیں۔

کراچی والی پروین سلطانہ ذرا نرم پڑیں۔

"سلائی کر لیتی ہو؟"

چاندنی نے سر اٹھایا: "جی ہاں۔ نیڈل کرافٹ کا ڈپلوما بھی لیا ہے۔"

"ہمیں ڈھیروں سلائی کروانا ہے۔ درزی بہت دیر لگاتا ہے۔ میرا ایک مہینے کا ویزا اور باقی ہے۔ ساٹھ بلاؤز سلوانے ہیں۔"

"ساٹھ —؟ ان کو یہاں رہنے کے لیے کمرہ دیدیجیے۔ یہ ساٹھ چھوڑ سو سی دینگی۔ ہیں نا مونی —؟"

"مونی —! اے یہ کون نام ہے؟" رانی صاحبہ نے پہلی مرتبہ بات کی۔ "کہاں سے آئی ہو۔ اے بیلا رانی شوخ۔ تم ان کو اچھی طرح جانتی ہو؟ کچھ ان کا پتہ نشان بھی تو چاہیے۔ کیا یہ بھی تمہارے باپ کی کمپنی میں تھیں؟ ایسی لگتی تو نہیں۔"

رانی کے اس آخری جملے میں بیلا اور ان کے کنبے کے لیے جو بے پناہ توہین مضمر تھی۔ بیلا نے اپنی حاجتمندی کی وجہ سے اسے نظر انداز کیا۔

"ایم۔ اے کی سند ہے تمہارے پاس؟" پروین سلطان نے چاندنی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ کچھ ایسے حالات میں کالج سے استعفیٰ دینا پڑا کہ میرے تمام کاغذات پرنسپل نے اپنے قبضے میں کر لیے۔"

"کیسے حالات بھئی؟ کہیں ہمیں کسی چکر میں نہ پھنسوا دینا۔ اے بیلا رانی شوخ۔ تم ان کی ضمانت لیتی ہو؟ انہیں کب سے جانتی ہو؟"

"یہ آج صبح میرے ہاں پہنچیں۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ فوراً انہیں ملازمت ڈھونڈنا چاہی۔"

"اے ووئی۔ پھر وہی حالات۔ کیا معاملہ ہے بھئی؟" رانی صاحب جھنجھلا گئیں۔

اب بیلا کو سچ بولنا پڑا۔ "یہ میرے ہزبنڈ کی مدر کی فرینڈ کی لڑکی ہیں۔"

"اے ہے یہ چاندنی بیگم ہیں؟ انہی کے لیے بٹّو باجی مرحومہ آخر دنوں میں کہنے لگی تھیں کہ صاحبزادے ایک بنگالن کے پھیر میں پڑ گئے تھے۔ اب شکر ہے ایک غریب بے زبان لڑکی کے ساتھ دو بول پڑھوانے پر راضی ہوتے ہیں۔ خدا کی شان ہے قبر کی قسمت میں تو تم لکھی تھیں۔"

بیلا فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "اب تو آپ کو کسی ضامن کی ضرورت نہیں۔ یہ آپکی ساری سِلائی وِلائی کر دیں گی۔ پھر اسکول میں لگا لیجئے گا۔ ویسے ہم بھی ان کے لئے نوکری تلاش کرتے رہیں گے۔ او۔ کے — مُونی — بائی۔ بائی —"

بیلا کے جاتے ہی صفیہ نے فوراً اٹھ کر ایک نقشیں الماری میں سے ضخیم سنہرا البم برآمد کیا۔ "چاندنی بیگم ادھر آؤ۔"

انہوں نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے گردن بڑھائی۔ "یہ دیکھو۔ ہمارے بوبی بھائی کی شادی کی تصویریں۔ دلہن بھابھی آجکل میکے گئی ہوئی ہیں۔ یہ فوٹوگراف دیکھو۔ یہ ہیں بیلا رانی۔ ان کی والدہ محترمہ ہارمونیم بجا رہی ہیں۔ والد محترم اور بھائی پیچھے بیٹھے ہیں میراثیوں کا خاندان —"

چاندنی نے فلیش لائٹ تصویر کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

رانی صاحب نے زرینہ سے سرگوشی کی۔ "یہ بیلا واقعی بڑی چنڈالنی ہے۔ کل بھتری۔ اپنی بلا ہمارے سر منڈھ گئی۔" باآواز بلند چاندنی کو مخاطب کیا۔ "سنو بھئی چاندنی۔ بات یہ ہے کوٹھی کے اندر تو بالکل جگہ نہیں ہے۔ ماشاءاللہ سے پَتنی بٹیا اور ان کے بچّے آئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے تمام عزیز و اقارب آتے رہتے ہیں۔ سارے کمروں میں مہمان ہی مہمان۔ تم فی الحال الائچی خانم کے ساتھ بسر کر لو۔ ان کا باتھ روم وغیرہ بھی اُس طرف نزدیک ہی ہے۔ انھیں بھی آجکل باہر ہی رہنا پڑ رہا ہے۔"

سونا کلی نے دروازے میں آ کر عرض کی۔ "رانی صاحب خاصہ تیار ہے۔"

وہ پائینچے سنبھال کر چھپر کھٹ سے اتریں۔ تینوں بیٹیوں نے اپنا اپنا کام سمیٹا۔ ان سب نے ڈائننگ روم کا رخ کیا۔ چاندنی پیڑھی سے اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ جب ظفر پور سے روانہ ہوئی تھیں شام کو ایک اسٹیشن پر خوانچے والے کو بلا کر سموسے خرید لیے تھے۔ صبح سے شدّت کی بھوک لگ رہی تھی۔ بیلا کے ہاں محض ایک پیالی چائے پی تھی۔ اس نے لنچ پر رکنے کے لیے کہا۔ مارے طنطنے اور غم و غصّے کے انکار کر دیا۔ اب وہ طنطنہ ختم ہونے والا تھا۔ الائچی خانم نے اشارہ کیا اور آہستہ سے بولیں۔ "کدھر جا رہی ہو —؟ میز پر ماشاءاللہ سے آجکل پندرہ سولہ جنوں کے لیے خاصہ چُنا جاتا ہے۔ وہاں جگہ نہیں ہے۔ کھانا ہمارے ساتھ کھا لینا۔ وہ سامنے آنگن میں نلکا لگا ہے۔ ہاتھ واتھ دھو لو۔"

"میرا لوٹا اور اسباب —" چاندنی کے حلق سے نحیف آواز نکلی۔

"منگوائے لیتے ہیں۔ باہر رکھا ہوگا۔ چلو۔"

ایک گھنٹے بعد نوکروں کے کھانے کی نوبت آئی۔

مطبخ کے فرش پر جھوٹی رکابیاں بکھری پڑی تھیں۔ مامائیں اور ان کے بچّے پٹڑے اور پیڑھیاں گھسیٹ کر چاروں طرف بیٹھ گئے۔

"آؤ چندرینا۔ بسم اللہ کرو۔" الائچی خانم نے آواز دی۔ چاندنی صحن کے کونے میں نل کی منڈیر پر بیٹھی ریل کے دھوئیں کی کالونچ رگڑ رگڑ کر دھوتی جا رہی تھیں اور پٹ پٹ آنسو بہا رہی تھیں۔ الائچی خانم کی پکار سن کر منہ پر چھپکے مارے۔ لال لال آنکھیں لیے باورچی خانے میں گئیں۔ سونا کلی کے برابر پٹڑے پر بیٹھ گئیں۔ ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے میز پر سے آیا ہوا جھوٹا کھانا مت دینا۔"

"ارے نہیں۔ چاندنی بیگم۔ ہم لوگ کیا جھوٹن کھاتے ہیں۔ جھوٹن ساری انگوری اور ببلیا کے لیے اس قاب میں ڈال دی جاتی ہے۔"

کھانے کے بعد الایچی خانم سے کہا: "میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔"
"ہاں۔ ہاں آؤ—— آجکل مجھے بھی اسیطرف سونا پڑ رہا ہے۔"

محل خانے کے کواڈرینگل میں ایک وِنگ ماماؤں کے لیے مخصوص تھا۔ دالان میں چارپائیاں ایک قطار میں بچھی ہوئی تھیں۔ کھدر کے گدّے۔ چھینٹ کے لحاف۔ میلے میلے تکیے۔ خوش قدم۔ بتاشن بوا۔ وزیرن، نورن، سونا کلی۔ سب وہیں سوتی تھیں۔ الایچی خانم کا پلنگ سرے پر تھا۔ اس کے برابر ایک کھاٹ چاندنی بیگم کے لیے بچھا دی گئی۔ "تمہارا سوٹ کیس ہم نے اندر اپنی کوٹھری میں رکھ دیا ہے۔ لاؤ تمہارا بستر لگا دیں۔" الایچی خانم نے کہا: "کھاٹ ادھر کو سرکا لو۔ دھوپ میں۔"
"یہیں ٹھیک ہے۔" چاندنی نے جواب دیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں مُوندیں۔
مقابل کے دالان سے پروین سلطان نے پکارا: "آتو صاحب—— دن جا رہا ہے۔ ذرا چاندنی کو بھیجیے۔"
الایچی خانم نے آہستہ سے کہا—— "جاؤ۔ روزگار پر لگے پہلا روز ہے۔ آج ہی دل لگا کر کام نہ کیا تو——"
وہ تکان سے چُور چُور تھیں۔ اٹھ کر پھرنل کی طرف گئیں۔ نیند بھگانے کے لیے منہ دھویا۔ عینک لگائی۔ کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔

رات تک ایک خالی کمرے میں بیٹھی ساریوں پر فال لگاتی رہیں۔ انگلیاں دکھ گئیں۔ آنکھوں میں درد ہونے لگا۔ پھر مطبخ میں کھانا کھایا۔ اہلِ خانہ ساڑھے نو بجے سونے کے لیے چلے گئے۔ چاندنی دالان میں آئیں۔
نوکرانیوں کا بیت الخلا صحن میں بہت فاصلے پر تھا۔ لالٹین لیکر روانہ ہوئیں۔ واپس آکر کھٹیا پر لیٹیں۔ خوش قدم نے روئی کے پردے گرائے۔ چاندنی لحاف میں دبک گئیں۔ نیم کوہستانی ظفر پور بہت سرد مقام تھا مگر وہاں کمرے میں سوتی تھیں۔

باہر سونے کا پہلا اتفاق تھا۔ کوٹھی میں سب لوگ برقی انگیٹھیاں جلاتے اپنے اپنے کمروں میں محوِ خواب تھے۔ شام انہوں نے خوش قدم سے دریافت کیا تھا کہ تم لوگ اندر کوٹھریوں میں کیوں نہیں سوتیں۔ اس نے کہا تھا کُٹھریاں رہنے کے لائق نہیں۔ کھڑکیاں دروازے ٹوٹ گئے۔ راجہ صاحب ان کی مرمت کروانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ہم لوگ باہر ہی سو جاتے ہیں۔ روئی کے پردوں میں ٹھنڈ نہیں لگتی۔
چاندنی کو سردی محسوس ہوئی۔ گٹھڑی مُڑی ہو کر پڑ گئیں۔ گذشتہ شب گڑگڑاتی ٹرین میں گذری۔ پرسوں رات وہ ظفر پور میں تھیں۔ جو ان سے شاید ہمیشہ کے لیے چُھٹ گیا۔ اور کیسے کیسے صدمے ذلتیں سہنے کے لیے چُھٹا۔ خیر اللہ کا احسان ہے۔ یا ربِّ کریم تیرا کس منہ سے شکر ادا کروں تو نے فوراً کے فوراً سر پر چھت بھی دیدی۔ پیٹ بھر کھانا بھی کھلایا۔ خوب گرم چاء بھی پلا دی۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر——
باپ سے بیحد محبّت تھی جو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے تھے۔ کبھی بھولے سے خط نہ بھیجا۔ لیکن وہ ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے دعا کرتی تھیں۔ یا اللہ تو ابا کو زندہ سلامت رکھ۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ واپس آجائیں۔ یا اللہ امّاں کو زندہ سلامت رکھ۔ یا اللہ ابا خیریت سے ہوں۔ ماں کی وفات کو دو مہینے گذر چکے تھے مگر اب بھی عادتاً درخواست کرتیں یا الٰہی اپنے حبیبؐ کے صدقے امّاں کو زندہ سلامت رکھ ان کی لمبی عمر ہو—— فوراً تصحیح کرتیں ان کی مغفرت فرما۔ جنّت میں جگہ دے۔ آمین۔

پلنگ پر کروٹیں بدلتے دیکھ کر الایچی خانم نے ہنکارا بھرا۔ اب سو بھی جاؤ چندیا۔ سویرے اٹھنا ہے۔

نیلگوں صبح مٹیالے پردوں کی درزوں سے جھانکی۔ چاندنی بیگم آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھیں۔ کلمہ پڑھا۔ ایک لمحے کے لیے ذہن ماؤف رہا۔ میں کہاں ہوں۔

سردیوں کی صبح اپنے گھر کے مانوس در و دیوار نظر آتے تھے۔ کھڑکی میں سے باغ کا منظر۔ کبھی کوئی شریر بے ضرر بھٹکتے ایسا پہاڑی لنگور کسی ڈالی پر جھولتا دکھلائی پڑتا۔ ہمالیہ کے پرند شور مچاتے۔ دھوبن چڑیاں۔ پہاڑی مینائیں۔ لال چونچ والا گل سہرا ــــ نیلے رنگ کے نُور پوش۔ دادا میاں پیار سے آواز دیتے۔ چاندنی بٹیا۔ دیکھو میاں نُور پوش تمہیں سلام کرنے آ گئے۔ رخت خواب سے اٹھو۔ نماز پڑھو۔

ابا دن چڑھے تک سویا کرتے۔ امّاں دادی اور دونوں چچیاں امور خانہ داری میں مشغول ہو جاتیں۔ صحن کے یوکلپٹس ہوا میں جھومتے۔ دوسری منزل پر نیپالی وضع کی سیاہ چوبی بالکنی میں دادا میاں کی آرام کرسی بچھتی۔ وہ دھوپ میں بیٹھ کر اخبار پڑھتے۔

ابا کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ دادا میاں کی ڈانٹ پھٹکار پر ان کو گستاخی سے جواب دیتے۔ بیوی اور بھائیوں سے لڑتے۔ بندوق اٹھا کر جیپ میں جا بیٹھتے اور شکار کے لیے نکل جاتے۔

وہ بچپن کے جاڑے تھے۔ پھر اکثر صبح جب آنکھ کھلتی گھر کا ایک فرد غیر حاضر ہوتا۔ دادا میاں۔ دادی۔ چچا۔ چچیاں۔ انکی اولاد۔ کچھ مر کر نکلے۔ کچھ زندہ۔ ابا بھی غائب ہو گئے۔ دور سر کنڈوں میں چھپے امام باڑے کی طرح کوٹھی کھنڈر ہوتی گئی۔ باغ اجڑ گیا۔ ایک بار ایام محرّم میں جھاڑیوں میں چھپا تیتر زور زور سے بولا۔ امّاں بی اے کے امتحان کے لیے پڑھنے میں مصروف تھیں۔ سر اٹھا کر بولیں۔ کہتے ہیں دشت کربلا میں ایک تیتر بولتا ہے اس کی صدا بھی ایسی سُنائی دیتی ہے جیسے کہتا ہو ــــ کُشتہ شُد حُسینؑ ــــ کُشتہ شُد حسینؑ ــــ

رات کو بہت دور سے حُسینی باجے کی آواز آتی۔ بسوآں میں بنے تعزیوں سے لدی بیل گاڑیاں کُہر آلود سڑک پر سے گذر جاتیں۔ امّاں سر ڈھانپ کر نذر نیاز کا انتظام کرتیں۔ خود ہی بیٹھ کر شہادت نامہ پڑھ لیتیں۔ دادا دادی کی وفات۔ ابا اور چچاؤں کی پاکستان روانگی اور گھر کے زوال کے بعد بھی وہ تن تنہا جیسے تیسے بن پڑتا دادی

امّاں کے زمانے کی روایات نبھائے جا رہی تھیں۔

سنہ اٹھارہ سو اٹھاون میں بے چاری ملکہ حضرت محل نے اسی راستے سے نیپال ہجرت کی تھی۔ انکے شکست خوردہ قافلے کے بہت سے افراد اوپر پہاڑیوں تک نہ جا پائے تھے اور ان جنگلوں میں بس گئے تھے۔ ان کی اولاد بوسیدہ مکانوں میں آباد تھی۔ اور ان کا امام باڑہ کھنڈر کی صورت میں موجود تھا۔ اب بھی وہاں اعزاداری ہوتی تھی۔ رات کے سناٹے میں نوحوں کی آوازیں صاف سنائی دیتیں۔ لوگ کتنے سخت جان ہیں۔

امّاں کتنی سخت جان تھیں۔ علیگڈھ سے میٹرک کرنے کے بعد ان کی شادی ہوئی تھی۔ ابا کے فرار کے بعد انہوں نے خود ہی پڑھ پڑھ کر انٹرمیڈیٹ اور بی اے بی ٹی کیا۔ آدھی عمر ان کی صعوبتیں جھیلتے گذری۔

اچھا ہوا مرنے سے پہلے اس چوٹی میراثن سے قمبر میاں کے بیاہ کی خبر انہوں نے نہ سُنی ورنہ ایک اور کاری چوٹ دل پر لیے گور میں اترتیں۔

پہلے جب کبھی گوگا پیر کے لال سُوتی گوٹوں والے جھنڈے اٹھائے مہتر سڑک پر سے گذرتے، رمنیا جھاڑو دینے کے بعد امّاں سے بصد ادب کہتی بیگم صاحب آج ہم لوگن کا تہوار ہے جلدی چھٹی دید تجئے۔ اب وہ آ کر بڑے فخر اور خود اعتمادی سے اطلاع دیتی تھی۔ بیگم صاحب ہمارے بیٹے کا کیمشٹری کا پیپر ہے ہم اس کے ساتھ سہر جا رہے ہیں ــــ امّاں کہتیں "کیا پتہ دس سال بعد اس کا لڑکا اسی ضلع کا کلکٹر ہو کر آوے ۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ"

صاحبزادی پروین سلطان کی آواز کانوں سے ٹکرائی ــــ "ارے سونا کلی۔ کیا چاندنی اب تک سو رہی ہیں۔ ان سے کہو۔ ادھر آ کر کام شروع کریں۔"

"جینی — پینی — فینی — لوبی۔ مدر فادر فرینڈز ریلیٹوز اینڈ کنٹری مین دیکھو مجھے جو —" ایک کراری صدا کاؤڈرینگل کے تیسرے دالان سے بلند ہوئی۔

تینوں بہنیں جو دھوپ کھانے صحن میں نکل آئی تھیں فوراً غائب ہو گئیں ایک گورے چٹے جوان آدمی گھنی سیاہ داڑھی آنکھوں میں ذرا سی وحشت، بیش قیمت ڈریسنگ گاؤن۔ ایک ہاتھ میں پائپ دوسرے میں تازہ اخبار۔ تھیٹر کے جولیس سیزر کیطرح تول تول کر قدم رکھتے دالان کی سیڑھیاں اترے۔ چاندنی دکھلائی پڑیں جو امرود تلے نلکے پر ہاتھ منہ دھو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی صابن دانی درخت کی ایک شاخ میں چھپا دی تھی تاکہ نوکرانیاں اسے استعمال نہ کریں۔ اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ صابن پھسل کر نالی میں گر گیا۔ الجھ کر جھکیں۔ سر اٹھایا تو جولیس سیزر سر پر موجود۔

انہوں نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ پھر صابن دانی اٹھا کر بڑے احترام سے انہیں پیش کی پوچھا: "اور آپ کون محترمہ ہیں؟"

الائچی خانم نے دور سے اشارہ کیا ادھر بھاگ آؤ۔ ادھر بھاگ آؤ۔

"یہ صاحب کون ہیں؟ جو تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ لیڈر ہیں؟" شام کو الائچی خانم سے دریافت کیا۔

"سرکار کے بڑے صاجزادے۔ پگلا گئے ہیں۔ لیڈر ہی سمجھو —"

چاندنی مزید کہانی سننے کے لیے منتظر رہیں۔

"لو ذرا یہ چاول بینو —"

"اللہ بتلائیے نا۔"

انہوں نے چاروں طرف دیکھ کر سرگوشی کی "———— تین کوڑی تین کوڑی ہو گئی اس غم میں ذرا کھسک گئے۔ باپ نے پڑھنے کے لئے ولایت بھیجا۔ وہاں سے میم کر لائے۔" پردین کو برآمدے میں نمودار ہوتے دیکھ کر باآواز بلند کہا۔

"ارے چاندنی بٹیا۔ آج کتنے بلاؤز سیے؟"

پردین اندر گئیں۔

"وہ میم بھی سِڑن تھی۔ اور گھوڑی ایسی۔"

"ارے واہ ——!" کھلکھلا کر ہنسیں۔

"شکر ہے چندرینا تم کو ہنسی تو آئی ——"

"اچھا —— پھر ——؟"

"اور وِلی میاں اتنے خوبصورت۔ خیر گھر والے سب چپ۔ کیا کر سکتے تھے —— اے چاندنی بیگم —— تم کو تیپچی بھرنی بھی آتی ہے؟"

چاندنی نے صحن پر نظر ڈالی۔ صفیہ سلطانہ زینے پر جا رہی تھیں۔

"گئیں۔ آگے بتائیے۔"

"بھگل گانٹھ کر باہر نکلتیں۔ ایک بار بلاؤز پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گون پہنے پہنے کلب پہنچ گئیں۔ ایک دفعے ہیٹ کی جگہ ردی کی ٹوکری اوڑھ ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے لگیں۔ اب کوئی ان کو باہر نکلنے نہ دے —— یہ کوشش کریں بھاگنے کی تو میاں انکو پیٹنے لگے۔ چار پانچ برس بٹیا وہ اس محل خانے کی قید میں رہ کر پٹتی رہیں۔ ایک رات تالی بجانے والوں کے ساتھ نکل گئیں۔"

"تالی بجانے والے —— عوام؟"

"اے نہ آم نہ عوام۔"

"پبلک یعنی جب لیڈر تقریر کرتے ہیں اور جو باقی لوگ تالی بجاتے ہیں۔ وہ؟"

"وہ نہیں —— وہ جو پہلے تالی بجاتے ہیں پھر بات کرتے ہیں۔"

"ہم سمجھے نہیں۔"

بہت شائستہ خاتون تھیں۔ بمشکل کہا: "ارے —— وہی۔ زنانے۔"

"اوہ ——!" چاندنی بیگم دوپٹے میں منہ چھپا کر خوب ہنسیں۔

"مالی کے ہاں لڑکا بالا ہوا تھا۔ ایک ٹولی کیا وَنڈ میں آ گئی۔ میم صاحب بڑی

دلچسپی سے ان کا ناچ گانا کھڑکی میں سے دیکھتی رہیں۔

"دوسری رات بتاشن بُوا نے دور سے ایک لمبی تڑنگی عورت کی جھلک دیکھی جو ساری پہنے گھونگٹ کاڑھے ڈیوڑھی سے نکل رہی تھی۔ بتاشن بوا سمجھیں۔ سلوچنا ہوں گے —— اندر انعام لینے آئے ہوں گے۔"

"سلوچنا —— کون —— ؟" چاندنی نے بات کاٹی۔

"ارے وہی زنانوں کے لیڈر۔ یہ لوگ اکثر سینما کی ایکٹرسوں کے نام خود رکھ لیتے ہیں۔ ان کے بوڑھے چودھری پرانے زمانے کی سلوچنا کہلاتے تھے —— صبح کو معلوم پڑا۔ تب سے —— بھیا زیادہ کھسک گئے۔ لمبی لمبی اسپیچیں دینے لگے —— چُنا ؤ میں کھڑے ہونے والے تھے۔ بڑی مشکل سے روکا گیا۔"

"حکیم کو نہ ڈھونڈا۔"

"گھر والے عزّت کے مارے چُپ۔ مشہور کر دیا ولایت گئی —— سلوچنا نے اس کا نام آسمان سے ٹوٹا ستارہ سفیدالزمانی غلیچہ بیگم رکھا ——"

"آسمان سے ٹوٹا ستارہ سفیدالزمانی غلیچہ بیگم ۔!" چاندنی نے دہرایا۔ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بابو کالی چرن نے کہا قاعدے کی لڑکی سے وِکی میاں کی دوسری شادی کر دیجئے ۔ یہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔"

"توبہ ۔ پاگل آدمی کو کون لڑکی دے گا۔" چاندنی نے کہا۔

"نہیں ایسے پاگل بھی نہیں ہیں۔"

جاڑوں کی راتیں طویل ہوتی جارہی تھیں۔ پروین سلطانہ کے ویزا کی میعاد قریب الختم تھی۔ چاندنی شام تک ان کے کپڑے سیتیں۔ رات کو دالان میں آکر اپنے بستر

پر لیٹ جاتیں اور الائچی خانم اور بتاشن بوا سے تین کٹوری ہاؤس کے قصّے سنا کرتیں۔ یا خود ان کو اپنے ددھیال، ننھیال کے بھلے دنوں کے واقعات بتاتیں۔

"میرے نانا پرنانا وغیرہ اسقدر مغرور اور بد دماغ تھے کہ انکے علاقے میں کسی کو پختہ مکان بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ ساری رعیت کچے گھروں میں رہتی تھی۔ ایسی رعونت۔ اتنی فرعونیت۔ اسکا انجام بھی تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

"آج پینی باجی نے کشمیری شال فروش سے پشمینے کی چادر خریدی۔ اس میں ڈو ڈو بالشت چوڑی جامہ وار کی پٹی لگی تھی۔ بہت مہنگی دے گیا۔ میں نے کہا ارے پینی باجی ہمارے نانا باون گاؤں کے مالک تھے ان کے ہاں تو پورا شامیانہ جامہ وار کا تھا۔ پینی باجی نے فوراً ڈانٹ دیا۔ بس بس اڑاؤ مت۔ اگر تم کبھی پاکستان گئیں اور وہاں یہ کہا تو مقامی لوگ بہت ہنسیں گے کہ جو مہاجر آتا ہے وہ اسی قسم کے زیٹ ہانکتا ہے۔ پھر کہاں گیا وہ شامیانہ جامہ وار کا —— ؟

"میں رونہکی ہو گئی۔ پچھتائی کہ یہ ذکر کیوں چھیڑا۔ میں نے کہا میرے ماموں عیاش اوران پڑھ ہیں۔ انہوں نے حویلی کے پھاٹک دروازے کڑیاں سنگِ مرمر ایک ایک چیز بیچ کھائی۔ شامیانہ چبوترے پر پھیلا کر دونوں بھائی بڑی بڑی قینچیاں لیکے اکڑوں بیٹھ جاتے اور اس کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر بیچنے کے لیے ڈو ڈو انگل پر ایک دوسرے سے جھگڑتے ——

"—— پھر وہ بھی پاکستان چلے گئے تمہارے ابا کی طرح —— ؟ پینی باجی نے طنزاً دریافت کیا۔ میں نے بتلایا کہ ایک مر گئے۔ دوسرے دلّی میں ٹیکسی ڈرائیور ہیں۔ انہوں نے بھی کبھی ہماری خبر نہ لی۔"

کچھ دیر بعد چاندنی نے بتاشن بوا کو مخاطب کیا —— "باجی امّاں روز رات کو خواب

میں نظر آتی ہیں۔ کل رات تو ان کے ساتھ دادی اماں اور ان کی پیش خدمت سنہرا بوا بھی آئی تھیں۔"

"تم آجکل بڑی مصیبت پریشانی میں ہو نا اس وجہ سے ان لوگوں کی روحیں تمہارے لیے بیکل ہیں۔"

"ہم نے تو اپنی ماں کا بہت دل دکھایا اور وہ ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ہمارے لیے بے چین ہیں۔"

"اولاد کا تو یہ کام ہی ہے کہ ماں باپ کا دل دکھاتے۔"

"جب تین چار سال اُدھر بتّو خالہ قنبر میاں کی بات لیکر آئی ہیں باجی اماں کے پاؤں میں بڑی سخت موچ آگئی تھی وہ چلنے پھرنے سے معذور تھیں۔ میں کالج سے آئی تو کھسکتے کھسکتے پائینتی تک آئیں اور کہنے لگیں۔ چاندنی تمہارے لیے ——

"بس تباشن بُوا جہاں باجی اماں نے یہ کہا اور میرا پارہ چڑھا۔ جب کسی کا ٹوٹا مارا پیغام آتا وہ اس کا ذکر شروع کرتیں اور میں منہ پھلا کر کمرے سے نکل جاتی۔ وہ متواتر بکتی جھکتی رہتیں۔ ابا کو برا بھلا کہتیں۔ یہ وبال بلائے جان میرے ذمہ ڈال کر بھاگ گئے۔ میں چپ سادھے رہتی۔ ہفتوں ان سے بات ہی نہ کرتی۔ اب اس روز بتّو خالہ کے جانے کے بعد وہ کھسک کر پائینتی آئیں۔ میں چپ رہی۔ منہ پھیر لیا۔ وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ مایوسی کے ساتھ سرکتے ہوئے واپس پھر اپنے تکیے سے ٹیک لگالی۔ اب میں وہ منظر کبھی بھول ہی نہیں پاتی۔

"سنہرا بُوا زندہ تھیں۔ انھوں نے مجھے بتلایا کہ بڑی بیگم اپنے بیٹے کے لیے بات کر گئی ہیں۔

"میں نے باجی اماں کا بہت دل دکھایا۔ کبھی کبھی میں چلاتی۔ تم خود ہی بُری ہو ورنہ ابا چھوڑ کر کیوں جاتے۔ اے تباشن بُوا میرا جی چاہتا ہے کہ کسی طرح کراچی جا کر ابا سے مل آؤں۔ انھوں نے کبھی نہ سوچا کہ جوان بیٹی کس حال میں ہے؟ بُوا لوگ ایسے پتھر دل کیسے ہو جاتے ہیں؟"

"آدم زاد اصلیت میں بہت ہی بد ہے چندینا۔ ورنہ کاہے کو اتنے پیغمبر آتے۔"

"آخری بار جب بتّو خالہ پہنچیں ظفرپور۔ مرنے سے دو دن پہلے انھوں نے باجی اماں کو اور مجھے بلوا بھیجا۔ باجی اماں بیمار تھیں۔ ان کو بڑی جھنجھلاہٹ آئی۔ چاندنی کو کیوں بلایا ہے۔ قنبر کو ساتھ لیکر یہاں آئیں۔ ہم کیوں انکے سامنے جھکیں۔ میں بھی خوب باجی اماں پر چلائی اور کہیئے اپنی امیر سہیلی کی خوشامد۔ مگر تباشن بُوا خدا کی شان دیکھو اب مجھے خود بھکارن کی طرح قنبر میاں کے در پر آنا پڑا۔ اور وہ بھی بیکار۔ شاید اس بیلا لنکا نے انہیں بتلایا ہی نہ ہو کہ میں آئی ہوں ورنہ وہ کم از کم فون پر ہی خیریت دریافت کر لیتے۔"

نورن بولیں —— "بیوی کے غلام ہیں۔ ہم نے ایک روز الحمدو باجی کو فون کیا۔ عیدو نے کہا ان کو تو بیگم صاحب نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ صاحب نے چوں نہ کری۔"

"چوں کریں کیسے۔ وہ انہیں مارتی بھی تو ہیں۔ کچھ بولیں تو پٹیں۔ جگ ہنسائی الگ ——" سونا کلی نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

قنبر میاں کا موضوع بیحد تکلیف دہ تھا۔ چاندنی نے کہا —— "آتو جی اب تک اندر سے نہیں آئیں۔"

وزیرن باورچیخانے سے انگیٹھی اٹھا کر لائیں۔

"اندر استری کر رہی ہیں۔ کل دعوت ہے بڑی بھاری۔ پینی بٹیا پاکستان واپس جانے والی ہیں۔ اب روز ان کے لیے ڈنر پارٹی کا لگا لگا ——" سونا کلی نے جواب دیا۔

وزیرن کی بیٹی نورن اکڑوں بیٹھ کر زور زور سے کوئلے دہکانے لگی۔ چاندنی نے اڑتی چنگاریوں پر نظریں جمادیں۔

"تباشن بُوا۔ میں نے بچپن میں ایک انگریزی کہانی پڑھی۔ ایک چھوٹی لڑکی ہے۔ یتیم۔ بے گھری۔ کرسمس کی شام ہے اور وہ سڑک پر چلتے چلتے تھک کر ایک امیر آدمی کی دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اندر تہوار منایا جا رہا ہے۔ باہر برف گر رہی ہے۔ اور یہ لڑکی سردی سے بچنے کے لیے ایک دیا سلائی روشن کرتی ہے۔ پل بھر کی روشنی میں وہ خواب سا دیکھتی ہے کہ ایک خوبصورت گرم کمرے میں بیٹھی تہوار منا رہی ہے۔

— وہ ماچس بجھ جاتی ہے۔ دوسری جلاتی ہے پھر تصوّر کرتی ہے کہ بڑی نفیس مسہری پر بیٹھی ہے — اسی قسم کی کچھ کہانی تھی بُوا مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔"

بتاشن بُوا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

چاندنی لالٹین اٹھا کر بیت الخلا کی جانب چلی گئیں۔

نورن بڑبڑائیں: "دعوت ہے۔ کل سویرے سے چھینی بٹیا ایک ایک فوٹو صاف کروائیں گی ہر دیوار پر سینکڑوں تو فوٹو لگا رکھے ہیں۔ دادا۔ پردادا۔ فلا نے ڈھما کے۔"

"تو کیا تمہارے باپ دادا کی تصویریں لگائیں؟ وہ سقے تھے۔ کمر پہ لال پٹکا باندھے ساری عمر پانی بھرتے گذاری۔ کہلائے بہشتی۔ مرے تو گورِ غریباں میں دفن کیے گئے۔ بتاشن بُوا کے باوا، یہ باورچی تھے۔ وزیرن کے والد۔ زندگی پھکنی سے چولہا پھونکتے گذاری۔

"اور ان ہی کو دیکھو۔" وزیرن بڑی تلخی سے کہتی رہیں: "آج ان پر وخت پڑا ہے تو باندیوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ کل پھر سے بیوی بن گئیں تو آ کر کسی باندی کی چارپائی پر بیٹھیں گی؟ بیلا ذات کی ڈومنی ہیں۔ جب یہاں گانے آئی تھیں شادی میں۔ ان کے لیے کھانا کشتی میں لگا کر باہر بھیجا گیا تھا۔ ساتھ کسی نے کھلایا بھی نہیں۔ اب بیگم بن کر آئیں بَراتی ہوئی۔"

دعوت کے ہنگامے اور کام کی تکان کی وجہ سے اگلی رات محفل نہیں جمی۔ چاندنی اپنے بستر پر آنکھیں موندے لیٹی نیند کا انتظار کر رہی تھیں۔ بتاشن بُوا اور الائچی خانم کی کانا پھوسی سنائی دی۔ چونک اٹھیں مگر سوتی بنی رہیں۔

"اے بتاشن۔ کل رات ہم رانی صاحب کے سنگھار کمرے میں استری کر رہے تھے۔ ارے۔ دیکھو یہ جگ تو نہیں رہیں —"

"سو گئی ہیں بنجر۔ کہے جاؤ —"

"سرکار۔ رانی صاحب تینوں بٹیاں بُوبی بھیّا۔ سب جنے بڑے کمرے میں مسکوٹ کر رہے تھے۔ رانی صاحب کہن۔ ہر ڈاکٹر کی رائے ہے۔ شادی کر دو۔ ٹھیک ہو جاویں گے

یہ لڑکی تو جیسے اللہ نے بھیجدی۔ خاندانی۔ تعلیم یافتہ اور شکل و صورت بھی قاعدے کی۔ گوری بقا جیسے برف کا ٹکڑا۔"

چاندنی سے رہا نہ گیا فوراً اُٹھ بیٹھیں۔ "پوری بات بتلاؤ —"

الائچی خانم بوکھلا گئیں۔

"بٹیا سرکار تو چُپ رہے۔ بینی بٹیا اور بوبی بھیّا بہت بگڑے۔ بوبی میاں نے کہا آپ ماں ہیں اس لیے یہ کہہ رہی ہیں ہو کی کبھی تندرست نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹروں سے ہم بھی پُوچھ چکے ہیں۔ آپ اس غریب لڑکی کی زندگی کیوں تباہ کرتی ہیں۔ چندیا بات یہ ہے کہ رانی صاحب جانتی ہیں تمہارا کوئی حمایتی موجود نہیں۔ قمبر میاں نے ٹیلیفون تلک نہیں کیا۔ بیلا اپنے گھر میں گھُسنے نہ دیں گی۔ تم جاؤ گی کہاں؟ میم صاحب تو زنانوں کے ساتھ نکل بھاگیں۔ تم کیا کرو گی؟ وِکی تو تم کو بید سے پیٹیں گے۔ ان کے پاس ایک چمڑے کا ہنٹر بھی ہے۔ اس سے میم صاحب کو پیٹا کرتے تھے۔ ڈاکٹر لوگ کہتے تھے انکا مرض ہی یہی ہے۔

"بوبی میاں نے رانی صاحب کی بہت مخالفت کی۔ ہم سمجھ گئے۔ تم سے ہمدردی تو خیر انہیں کیا ہو گی اصل وجہ یہ ہے کہ اگر بڑے بھائی بال بچوں والے ہو گئے تو جائداد گئی۔"

بتاشن سوچتی رہیں۔ اب وہ بولیں —

"بٹیا ہر معاملے کے دو پہلو ہیں۔ ہو سکتا ہے اچھے ہو جائیں۔ اپنے عیش و آرام کا سوچو اس گھر کی بڑی بہو بنو گی۔ اور اگر پیدائشی بدنصیب ہو تو وہ تمہارے دُھرّے اُڑا دیں گے۔ اور تم یہاں سے نکل بھی نہ پاؤ گی — ایک بات تم کو اور بتلا دیں تم بُوبی میاں سے اس بارے میں کچھ نہ کہو۔ وہ ایک طرح سے تمہارے طرفدار ہیں اور ایک طرح سے مخالف۔ پوچھو کیوں؟ اور وہ ہمدردی کے بہانے تم پر ڈورے بھی ڈال سکتے ہیں۔ وہ ٹھیک آدمی نہیں ہیں۔ بیوی چالے کے لیے میکے گئیں آج تک لوٹی نہیں جب یہ بیلا بمبئی سے آئیں۔ ان کے چکر میں پڑ گئے۔ شیخ قمبر علی شیخ چلی تھے ان سے بیاہ ہی کر بیٹھے۔ وہ بُوبی بھیّا کی عادتوں سے واقف ہیں۔ اسی مارے وہ آج تک بیلا کو لیکر

یہاں نہیں آتے اس روز تو وہ تم کو پہنچانے یہاں آگئی تھیں۔ رہے بوبی میاں۔ ان کی لکڑبگھے کی خاصیت ہے۔ پہلا سا زمانہ تین کوڑی کا رہا ہوتا تو یہ گاؤں سے لڑکیاں اٹھواتے۔"

سوتے وقت چاندنی نے اللہ سے کہا اللہ میاں ہم بہت کنفیوز ہو رہے ہیں تو ہی کوئی راہ سجھا۔ جو میرے حق میں بہتر ہو وہ کر۔

صبح کو چاول صاف کرتے ہوئے سوناکلی چپکے سے بولی "اب سب کو معلوم ہو گیا ہے۔ تم الاچی خانم، بتاشن بُوا، نورن، وزیرن کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ تو ہرگز نہیں چاہیں گی تم پھر سے بیوی بن جاؤ۔ اور دوم یہ کہ الاچی خانم اونچی ذات کی پٹھانی ہیں ان کی جوان نواسی اپنے ماں باپ کے ساتھ گاؤں میں رہتی ہے۔ ایک بار پہلے یہ ذکر چھڑا تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق وکی میاں کا بیاہ کر دیا جائے تو رانی صاحب نے یہ عندیہ بھی ظاہر کیا تھا کہ الاچی خانم کی نواسی ہی سے دو بول پڑھوا دیں۔ بوبی میاں نے بڑی مخالفت کی۔ اتنے میں تم کہیں سے آن ٹپکیں۔"

چاندنی بیگم کا دماغ چکرا گیا۔ وہ بہت زیادہ گھبرا کر سلائی والے کمرے میں پہنچیں اور مشین کا غلاف اتارا۔

"جب اماں منشی کالی چرن کو نینی تال ٹرنک کال لگا دیں کہ ہمارے کمرے درست کروا دو سمجھو پروین کہ یہاں کسی نہ کسی کی بات طے ہو گئی"۔ بوبی میاں نے طنزیہ لہجے میں بہن کو مخاطب کیا۔ وہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی اپنے آخری بلاؤز کی آستین میں ترپائی کر رہی تھیں۔

"ہاں۔ وہ چاہتی ہیں کہ میرے کراچی واپس جانے سے قبل عقد ہو جائے۔"

"کمال ہے یہ بالکل ابھی تلک کوئن وکٹوریہ بنی ہوئی ہیں۔ مگر کوئن وکٹوریہ بھی پارلیمنٹ

کے حکم سے باہر نہیں تھیں۔ یہ خود ہی جج ہیں خود ہی جیوری۔ ایک بے زبان لڑکی کو قربانی کا بکرا بنائے دے رہی ہیں۔ سوری۔ قربانی کی بکری۔"

"لڑکی راضی ہے اور تم آفت مچائے دے رہے ہو۔"

"چاندنی راضی ہیں؟"

"ہوں گی کیوں نہیں۔ سوناکلی خوش قدم سب کو ان کا اشارہ معلوم ہو چکا ہے۔ ٹوٹے دالان سے اچانک ان کا ٹرانسفر کیا جا رہا ہے کوٹھی میں بطور بڑی بہو صاحب۔"

"پپنی ایسا غضب نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ نارمل کبھی نہیں ہو سکتے۔"

"تم کیسے بھائی ہو۔ خود غرض۔"

"خود غرض؟ ہم نہیں چاہتے کہ اس گھر میں دیوانوں کی ایک فوج پیدا ہو جائے۔ — اماں کو سمجھاؤ۔"

"ہم تو ان سے کبھی کچھ کہہ نہیں پاتے انہوں نے ہمارا بیاہ کون ہماری مرضی سے کیا تھا۔ مگر اب ہم اچھے خاصے خوش ہیں۔"

"تم لوگ اتنا پڑھ لکھ کر بھی گڑیاں بنی رہتی ہو۔ یہ چاندنی بھی تو ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہیں بیچاری۔"

"ہم دیکھتے ہیں کہ تم اس بے زبان گائے کے کچھ زیادہ ہی ہمدرد ہوتے جا رہے ہو۔"

"والدہ نے جن زبان دراز صاحبزادی کو ہمارے سر منڈھا ہے اس کے مقابلے میں ہم اس لڑکی کے نرم مزاج کے قائل نہ ہوں گے؟ تم لوگوں نے اسے شاگرد پیشے میں ڈال رکھا ہے اور وہ کتنے وقار اور تحمل کے ساتھ اس بے عزتی کو سہے جا رہی ہے۔"

زرینہ اور صفیہ بڑبڑاتی ہوئی آن کر پاس کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

بڑی زرینہ خاندانی معاملات میں اپنی والدہ کی مشیر اور ہمنوا تھیں۔ منجھلی پروین سچ مچ "پڑوسن داخل" تھیں کہ شادی کے بعد پڑوسی ملک اب ان کا وطن تھا۔ صفیہ سلطانہ ہمیشہ خاموش اور بے نیاز سی رہتی تھیں۔ قمر کی شادی کے بعد سے بہت تلخ مزاج بھی ہو گئی تھیں۔

سگریٹ دور گھاس پر پھینکتے ہوئے بُوبی نے اچانک پروین کو مخاطب کیا۔

"تم ایک کام کرو۔ چاندنی کو کراچی لے جاؤ۔"

"خواہ مخواہ کراچی لے جاؤں۔"

"تم بتلا رہی تھیں۔ دو ملازم تمہارے ساتھ باہر جا سکتے ہیں۔"

"ہاں —— ایک خانساماں ایک آیا —— بُوبی —— وَوٹ ڈی ہل ڈُو یُو مِین —— ؟"

پھر خاموشی چھا گئی۔

تینوں بہنیں اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبی گڑھل کے درختوں پر نظریں جمائے رہیں۔ نکھری ہوئی دھوپ میں سیمل کے پھول تیرتے پھر رہے تھے۔ کچھ دور جا کر فضا کی تیز سنہری نیلاہٹ میں اچانک معدوم ہو جاتے۔

ایک نرم و نازک بھولی غیر محفوظ لڑکی روئی کے اس ہوائی سے بھول کی طرح ہواؤں میں تیرتی یہاں آ گئی ہے۔ اور یہ سب مل کر اپنی اپنی غرض کے لیے طرح طرح کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ یا بڑی بہو —— یا آیا —— واہ۔ صفیہ سلطانہ نے نفرت کے ساتھ سوچا۔ اور خود بُوبی۔ اگر انکا بس چلے تو اسے اپنی مسٹریس بنا لیں۔

پروین نے آہ بھری۔

"سگے بھائی کے لیے اتنی بیحسی۔" صفیہ نے کہا۔

"تو بھئی کیا کریں۔ ان کا علاج سوچا ہے تو اسمیں بُوبی کھنڈت ڈال رہے ہیں۔" زرینہ نے تنک کر جواب دیا۔

"میکبتھ کی چڑیلیں تم تینوں سے ٹریننگ لے سکتی ہیں۔ اب ہماری جان نہ کھاؤ۔"

بُوبی کرسی سے اٹھے اور سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں چلے گئے۔ نُورن جھولے پر

بیٹھی مالن سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے بلایا۔ آہستہ سے کہا۔ "دیکھو جب بٹیا لوگ اندر قیلولے کے لیے چلی جاویں ذرا موقع محل دیکھ کر چاندنی بیگم کو ادھر بلا لانا۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" فوراً اپنے کمرے کی سمت روانہ ہوئے۔

چاندنی اندر صحن میں نماز ظہر کے لیے وضو کر رہی تھیں۔ ایک بھُٹکی چڑیا امرود کی ڈال پر آن بیٹھی اور زور زور سے گانے لگی۔

اری اُڑ جا کمبخت —— چاندنی بڑبڑائیں۔ امرود تلے رکھی سنگِ مرمر کی بڑی سی سِل پر چٹائی بچھائی۔

جُوں ہی سلام پھیرا استون کے پیچھے نُورن دکھلائی دی۔

"باجی آپ کو بُوبی میاں بلا رہے ہیں۔ چلیے جلدی۔"

تیز آنکھوں والے بُوبی میاں سے کبھی کبھار چلتے پھرتے بات ہو جاتی تھی۔ وہ خود ہی بڑے تپاک سے 'ہلو' کہتے اگر ماماؤں نے انکے متعلق نہ بتایا ہوتا تب بھی انکی رفتار و گفتار ہی سے ظاہر ہوتا تھا کہ شوقین مزاج، تند خو اور کینہ پرور آدمی ہیں۔ نہ انکی دوستی اچھی نہ دشمنی۔

—— سیمل کے نزدیک ایک فائل لیے کھڑے تھے۔

"ہلو —— ہلو چاندنی بیگم —— آؤ ——"

وہ ساتھ ساتھ چلتے کدم کے کنج میں جا بیٹھے۔ "گھبراؤ نہیں۔ ارے بھئی تم کیسی ڈبُولڑکی ہو۔"

"فرمایئے۔"

بہت مختصر بات کرنا ہے۔ تم کو دکی کے بارے میں تفصیلات کا علم ہے؟"

"کچھ کچھ۔"

"یہ ان کی میڈیکل رپورٹیں ہیں پڑھ لو۔"
وہ بنچ کے کونے پر ٹکیں اور فائل کے کاغذات پر سرسری نظر ڈالی۔

"شیزوفرنیا۔"
"ناچیز نے سائیکولوجی میں ایم اے کیا ہے جس میں ابنارمل نفسیات بھی شامل ہے۔"
"اس کے باوجود تم ——"
"اس کے باوجود کیا —— یہ سب تو آپ لوگوں نے خود ہی اس انداز سے طے کیا ہے گویا میں بھی آپ کے کسی کسان کی لڑکی ہوں۔ مجھ سے کسی نے ڈائریکٹ بات ہی نہیں کی۔"

"اپنے پچھلے برتاؤ کی وجہ سے سب لوگ تم سے جھینپتے ہیں۔ راست بات اب ہم کر رہے ہیں —— یہ جانتے ہوئے بھی کہ منی میم کی انہوں نے کھال ——"
"ان کی شادی تو بیلا سے ہونا چاہیئے تھی جو اباً وہ ان کی اتنی ٹھکائی کرتیں کہ دماغ بالکل درست ہو جاتا۔" چاندنی نے ہنس کر بات کاٹی۔
"تم کیسی عجیب لڑکی ہو۔ اتنا سیریس معاملہ ہے اور تم ہنس رہی ہو؟"
"ابتک جو ہمارے اوپر گذری ہے سہہ لی باقی بھی بھگت لیں گے۔"
"یعنی تمہیں بھی دولت کی تمنا ہے۔"
"آپ کو نہیں ہے؟ آپ کیوں وکی میاں کی شادی کے اس قدر مخالف ہیں؟"
"تم رٹارڈڈ اور ابنارمل بچوں کی ماں بننا چاہتی ہو۔ محض دولت اور عزت کی خاطر؟"
"آپ بتائیے ہم کہاں جائیں؟ کیا کریں؟"
"کوئی ملازمت نہیں مل سکتی؟"
"پہلے نوکری تلاش کروں۔ ملے تو ایک کمرہ کسی ہوسٹل میں ڈھونڈوں پھر اس کے بعد ——؟"
"ہاں بیشک۔ اس کے بعد تین کوڑی کے وکی میاں —— چاہے وہ نیم پاگل ہی

ہوں —— وہ تو نہ ملیں گے۔ سنو تمہاری بھلائی کے لیے کہتا ہوں۔ زرینہ، صفیہ اپنے اپنے حالات کی وجہ سے بیحد فرسٹریٹیڈ، چڑچڑی عورتیں ہیں تمہارا جینا دوبھر کر دینگی۔ امّاں نہایت بدمغ خاتون ہیں۔ زمینداری کی بو ابھی ان کے دماغ سے نہیں نکلی۔ اپنے آپ کو ملکہ عالم سمجھتی ہیں وکی بے چارے جو ہیں سو ہیں ——"

چاندنی سیمل کے اُڑتے پھولوں کو تک رہی تھیں۔ ایک ایک پھول اُڑ کر کتنی دور جاتا ہے اور کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ ظفر پور کے باغ میں جب سیمل کے لال لال کٹوری ایسے پھول کھلا کرتے تھے۔ رات بھر ان میں شبنم بھرتی رہتی تھی صبح سویرے لمبی چونچ والی خوبصورت چڑیاں شبنم ان کٹوریوں سے پینے آجاتیں۔

"تمہارا دھیان کدھر ہے چاندنی؟"
"جی ارشاد ——"
تم کس قسم کی زندگی اس قید میں گذاروگی۔ بات سنو۔ مائی وائف ڈزنٹ انڈر اسٹینڈ می ——"
"اوہ نو ——" چاندنی بنچ سے اٹھیں۔
"ہمارے جنگلات میں ایک بنگلہ خالی پڑا ہے۔ ہم وہاں تمہارا بندوبست کر دینگے۔ نوکر چاکر۔ سب چیز۔ یہاں سے گویا ظفر پور کے لیے روانہ ہونا ——"
"بوبی میاں۔ آپ لکڑ بگے ہیں۔"
"کیا ——؟"
"حریچا لکڑ بگے۔"
بوبی نے فائل ان کے ہاتھ سے جھپٹا۔
"گولڈ ڈگر —— ہم تمہیں بہت بھولی معصوم سمجھتے تھے —— تم میں اور بیلا میں کیا فرق ہے؟" وہ تیزی سے عمارت کی سمت چلے گئے۔

چاندنی خود اپنے آپ پر متعجب مسکرایا کیں۔ اللہ میاں سے ہر وقت دعا مانگتی تھیں اللہ مجھے پلیز ان خوفناک عجیب وغریب غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے کی ہمت دے۔ سو اللہ نے دیدی۔ یا ربّ کریم میں تیرا کس طرح شکر ادا کروں۔

راجستھانی تصویروں والے کدم کے درخت کتنے رومینٹک اور حسین لگتے ہیں۔ کدم کی چھاؤں میں بنواری مُرلی بجاتے تھے۔ وہ کنج میں سے گذرتی آگے بڑھیں۔ مرمریں چھتری کے نیچے ایک تلک دھاری پنڈت جی بیٹھے دکھلائی پڑے۔ وہ چند رجسٹر سامنے رکھے لکھا پڑھی میں مشغول تھے۔ ایک لال پنکھی طوطا عین ان کے سر پر جُھکی ڈالی پر بیٹھا گلشن کی ساری کارروائیاں ملاحظہ کر رہا تھا۔

ٹہلتی ہوئی آگے بڑھیں۔ بیرونی سبزے پر زرینہ سلطان کے بچے پنکی اور آمنہ، پروین کے نونہال ڈِنگی اور فیروزہ اور شیریں کاسل والوں کے نور نظر فلی اور مہناز سب مل کر راجہ نارائن بخش سنگھ کے فربہ سپتر بے بی کو "دھوپ چھاؤں" کھیلتے ہوئے بے تکان دوڑا رہے تھے۔ برساتی میں شیریں کاسل کی مختصر تمتم کھڑی تھی۔ اس کے شٹ لینڈ پونی کے کانوں کے پیچھے کسی بچے نے پھول اُڑس دیے تھے، وہ بھی بیحد مسرور دکھلائی دیتا تھا موسم کی مناسبت سے زرد ریشمیں ساری پہنے ہیرے کا بروچ لگاتے فلی اور مہناز کی والدہ مسز مانک بائی ڈھونڈی اندر جا چکی تھیں۔ پارسی اسٹائل ساری نفیس ترین لیس کے بلاؤز میں ملبوس، نازک اندام مسز ڈھونڈی ۱۹۱۶ء والے "جمالیاتی" اردو ناولوں کی "پارسی حسینہ" معلوم ہوتی تھیں —

وہ زرینہ سلطان کی سہیلی تھیں اور سوناکلی نے بتلایا تھا کہ یہاں جوں ہی کسی کی شادی طے ہوتی ہے بطور صلاح کار انکو فوراً بلایا جاتا ہے اور وہ آتے ہی نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ انتظامات میں ہاتھ بٹانے لگتی ہیں۔ چاندنی مسکرائیں۔ دل میں انبساط

تھا۔ سارے دُکھ، بیچینیاں اور رنج غائب ہو چکے تھے۔

مانک بائی کی آیا دل بہار ایک بید کے نیچے کھڑی سوناکلی سے باتیں کر رہی تھی۔ سوناکلی کے ہاتھ میں آفتابہ تھا۔ بید کی نازک ڈالیاں ہری پھواروں کی طرح ان دونوں کے اوپر گر رہی تھیں۔ دل بہار نے موٹی تنزیب کی کُرتی اور آڑی گوٹ کا گھُٹنا پہن رکھا تھا۔ سوناکلی نے ڈوریا کی قمیص اور زرد اور کاسنی دھاری دار گلبدن کا کھڑا پائینچہ۔ زرد ململ کے دوپٹے اوڑھے وہ دونوں لڑکیاں دکنی، مغل، راجپوت راگ مالاؤں کی تصویر "بسنت" کی ایسی نظر آ رہی تھیں۔ پھاگن کی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ فضا میں خنکی تھی۔ پھاگن کی رُت آئی رے ذرا باجے بانسری بال موہن ہرجائی رے۔ ذرا باجے — ستارہ کا ایک قدیم ریکارڈ باجی امّاں کو بہت پسند تھا۔ بہار ٹھنڈے درختوں کے پیچھے سے جھانک رہی ہے۔ آم کے پیڑوں میں بور آ چکا ہے۔

اب پنکی کی باری تھی۔ سارے بچے ہنستے غل مچاتے اسکے تعاقب میں دوسری سمت بھاگ گئے۔ نُورن پھر جھُولے پر جا بیٹھی۔

چاندنی پنڈت جی کی بنچ کے پاس سے گذریں۔

"اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے!"

چونک کر دیکھا۔ سامنے وِکی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

یہ کتنے سُوئیٹ، پیاری چیز ہیں۔ آجتک ہنٹر انکے ہاتھ میں نہ دیکھا۔ یہ تو لنگڑی چڑیوں اور بیمار طوطوں کی مزاج پرسی اور علاج کرتے پھرتے ہیں۔ یہ مینگی کو چابک سے مارتے تھے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے انکی دوہری شخصیت ہو۔ گھڑی میں بھوت گھڑی میں اولیا۔ خیر۔ ہر چہ بادا باد بلکہ اگر میری خوش فہمی نہیں ہے تو جب سے میں

یہاں آئی ہوں یہ روز بروز نارمل اور پرسکون ہوتے جا رہے ہیں۔ فینسی ڈریس پہن کر تقریریں بھی نہیں کرتے۔ گذشتہ ڈھائی ماہ کے عرصے میں ان سے باغ یا انگنائی ہی میں اکثر مڈبھیڑ ہوتی تھی جب چاندنی دھوپ میں بیٹھ کر سلائی کرتی تھیں۔ وہ پوچھتے تمہاری طرف نیلی دُم والی مینا ہوتی ہے نا؟ اور زرد چونچ والے پلیرے؟ نیپال کی ترائی اور کماؤں کے پرندوں کی باتیں کرتے۔ ایک بار کہنے لگے کادمبری[1]! تمہارے پاس طوطا تھا؟ ہونا چاہیئے۔"

"دادی اماں کے پاس تھا۔"

"پنجرے میں؟"

"جی نہیں۔ اسٹینڈ پر بیٹھا رہتا تھا۔ پہاڑوں کے باشندے کسی کو قید میں نہیں رکھتے۔ ہماری دادی رانی کھیت کی تھیں۔"

چاندنی نے مارے خودداری کے اپنا پس منظر وکی میاں کو کبھی نہ بتلایا۔ نہ باون پرنانا۔ نہ خان بہادر دادا۔ نہ کچھ۔ نہ کچھ۔ اگر پروین سلطانہ کی طرح یہ بھی طنزاً ہنس پڑتے تو؟ لیکن وہ ہمیشہ بیحد عزت و توقیر سے پیش آتے تھے۔

"کیا وہ طوطا تمہیں کہانیاں سناتا تھا؟"

"دادی اماں کو سناتا تھا۔ وہ اسکی گفتگو سمجھتی تھیں۔"

"کادمبری کا طوطا بھی بڑی دلچسپ کہانیاں سناتا تھا۔ وہ ایک چنڈال[2] لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی لیکن ——" انہوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا —— "دراصل تھی اپسرا!"

"اپسرا!"

"کادمبری! تم سورگ کی اپسرا کو بیشک جنت کی حور کہہ لو! سب الفاظ کا پھیر[3] ہے!

---

[1] سنسکرت کتھا کادمبری (تصنیف ۶۲۰ء) کی ہیروئن۔
[2] ہند قدیم کی ادنیٰ ترین پانچویں کاسٹ۔

اک چاندکا مضمون سَو رنگ سے باندھتے۔

"چاندنی! فی الحال تم قمر در عقرب ہو یا تیسری شب کا چاند جو لوٹے میں قید ہو جائے تو بڑی تکلیف میں رہتا ہے۔"

اسے کوئی شہزادہ آکر چھڑا بھی لیتا ہے! چاندنی نے مسکرا کر سوچا تھا۔

"چندراولی! چاند ہی چاند۔ چاندوں کی قطار۔ چکا چوند! —— چندراین[1]!"

"برو زن ڈیٹیا تن!" چاندنی نے بے ساختہ جواب دیا۔

خوب ہنسے۔ "ششی بالا۔ بنت مہتاب!"

وہ وکی میاں کی باتیں بڑے دھیان سے سنتیں اور سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ جبکہ انکے گھر والے ان سے کتراتے تھے۔ انہیں تنہا چھوڑ رکھا تھا۔

چاندنی کدم کے پیڑ کے پاس رُک گئیں وکی میاں نے ان کو غور سے دیکھا اور بچوں کی طرح مسکرائے۔ "ورکش کنیا ——!"

"جی ——؟"

"درخت کی پری —— روح —— آتما!"

کدم کے نیچے ٹھٹھک کے کہنا شروع کیا۔ " مانس ہوں تو وہے رس خان. بسوں برج گوکل گاؤں کے گوالن۔ جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چرونت نند کی دھین مجھارن —— پاہن ہوں تو وہے گری کو جو کر دکر چھتر پورندر دھان —— جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں نت کالندی کول کدمب کی ڈارن —— رس خان کہتے ہیں کہ اگر انسان ہوں تو گوکل کا گوالا۔ جانور ہوں تو نند کی گائے۔ پتھر ہوں تو اس پہاڑ کا جسے کرشن نے اٹھایا۔ پرند ہوں تو جمنا کنارے کدم کی ڈال پر کروں بسیرا ——

---

[1] پدماوت ملک محمد جائسی کی مثنوی۔

"وِکی میاں یہ پنڈت جی اتنے سوچ بچار سے کیا لکھ رہے ہیں؟"

"یہ شری درگا پرشاد مصر؟ بادی النظر میں ہمارے جنگلات کا حساب کتاب رکھتے ہیں۔ دراصل ایک شفاف روح ہیں۔ محض ہوا۔ ایک روز جنگل کی ہواؤں میں شامل ہو جائیں گے۔ ہم تم سب سرگرداں روحیں ہیں۔ آفاق کی جھیل میں ڈبکیاں لگاتی پن ڈبیاں — تم ایک کام کرو۔ اس وقفے کے لیے جو ہماری تمہاری حیات مستعار کہلاتی ہے۔ اپنا زائچہ بنوالو۔

"پنڈت جی۔ یہ چاندنی بیگم ہیں۔ ان کا ایک عدد زائچہ تو بنا دیجئے۔ یہ ایک حیران و پریشان اپنی جھیل سے نکلی ہوئی مرغابی ہیں۔ بلکہ پھُنگی چڑیا۔"

پنڈت درگا پرشاد نے چاندنی پر گہری نظر ڈالی۔ خاموش رہے۔

"کیوں پنڈت جی؟"

"بنا دیں گے بھیّا۔"

"نا ایسے مت پنڈت جی۔ خیر نہ بنائیے۔ زائچے وائچے سے بھی کیا فرق پڑتا ہے۔"

باغ میں بچّوں کے قہقہوں کا مدھم شور بلند ہوا۔

"وہ سنو۔ مستقبل کی آوازیں پتّوں سے چھنتی ہم تک پہنچ رہی ہیں!" وِکی نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طرح کہا۔

ایک کار آن کر رکی۔

"اوہو۔ نرائن بخش سنگھ — ہم نے ان سے ہمالیہ کے چند نایاب پودے منگوائے تھے — خدا حافظ چاندنی بیگم۔" روانہ ہوگئے۔

"پنڈت جی ہم بھی جائیں؟"

"جائیے بٹیا۔ خدا حافظ۔"

دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے صفیہ سلطانہ نے جھانکا۔ پہلے وِکی روش پر سے

گزرتے دکھلائی پڑے۔ پھر چاندنی۔ دھوپ درختوں پر سے اتر کر ندی کی طرف سرکتی جا رہی تھی۔ اس پار بہت دور ریڈ روز اپنے ہرے بھرے گھنے باغ میں چھپا ہوا تھا۔ گومتی کا پانی پگھلا سونا بن گیا۔ پھر تانبا۔ بہت جلد رات بھی ہو جائے گی۔ زندگی کا ایک بے مصرف لایعنی مایوس سنسان دن نبڑ گیا۔

"رات بوبی نے ہم سے بہت جھائیں جھائیں کی — آپ انتظامات میں مصروف ہو گئی ہیں۔ یہ تک نہ سوچا کہ جب بیلا ان کو لے کر آئیں تھیں۔ بار بار کہتی تھیں۔ حالات ایسے تھے کہ ان کو کالج سے استعفےٰ دینا پڑا۔ حالات ایسے تھے — آپ نے کبھی ظفر پور والوں سے ان کے متعلق کوئی انکوائری بھی نہ کروائی۔ کیا معاملہ تھا۔ اور وہ تو جیسے لگتا ہے ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ خدا چھپّر پھاڑ کر انہیں — سُن رہی ہیں؟ بوبی بہت ٹیڑھے آدمی ہیں۔ آپ کیوں خواہ مخواہ بھِڑوں کے چھتے کو ہاتھ لگاتی ہیں۔"

الائچی خانم جلے پاؤں کی بلّی کی طرح اندر آئیں۔ "بٹیا چاندنی بیگم کہہ رہی ہیں۔ آپ کے تمام کپڑے تیار ہیں آ کر دیکھ لیجیے۔"

پروین کرسی سے اٹھیں "— ساری عمر آپ نے من مانی کی۔ اب ذرا—"

"تو بھئی اب تم ان کو یہاں سے کہیں اور بھجواؤ۔ اس معاملے کے بعد وہ یہاں کیسے رہ سکتی ہیں۔"

کل رات بوبی نے جو اودھم مچائی تُورن رپورٹ پہنچا چکی تھی اسکے باوجود چاندنی اپنے ارادے پر قائم رہی تھیں۔ ایک بار عقد ہو جائے پھر یہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ راجہ صاحب تو سر پہ موجود ہیں۔ لیکن اسوقت وہ سوئنگ روم میں موجود تھیں۔ رانی صولت زمانی اور انکی صاحبزادی پروین سلطانہ کا مکالمہ کان میں پڑا اور فوری اور قطعی فیصلہ کر لیا۔

اس گروہ متکبرین میں صرف وہی ایک شخص ہیرا تھا۔ شاید سچا فقیر۔ مجذوب۔ یا اللہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔ اور اے اللہ میری تذلیل کا دُکھ جو میرے آن بان والے دادا اور میری خودداراں کی روحوں نے سہا اسکے لیے ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی چاہتی ہوں اور اے اللہ تو گواہ ہے کہ اس ابتلائے عظیم کے ذریعے جس میں تو نے مجھے اتنے عرصے مبتلا رکھا، میں نے اپنے بادّنی نانا پرنانا ؤں کی ساری نخوّت کا تھوڑا سا کفّارہ ادا کر دیا۔

وہ سوئینگ مشین کی طرف بڑھیں۔

پروین کمرے میں آئیں -چاندنی فرش پر کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں۔

رانی صاحب کو بتلا دیجئے میں اس پروگرام کیلئے تیار نہیں ہوں۔"

"لوَبی نے کہا ہوگا۔"

"جو بھی سمجھئے۔ میں بھی کچھ عقل رکھتی ہوں۔ اور اس انوکھی سچوئشن میں پھنس کر خاصی کنفیوز ہو گئی تھیں۔"

"امریکہ چلوگی؟"

"امریکہ ——؟"

"بطور ڈومسٹک ہیلپ۔ وہاں تو بڑی بڑی خاندانی لڑکیاں بے بی سٹنگ کرتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ معلوم ہے۔"

"پھر ٹائپنگ وغیرہ سیکھ لینا۔ ایک سے ایک پاکستانی ہندوستانی نوجوان تم سے شادی کیلئے دوڑے گا۔"

"آپ اچانک میری اتنی ہمدرد کیسے بن گئیں۔ آپ نے تو آج تک اپنی والدہ سے یہ تک نہ کہا تھا کہ میری چارپائی اس کمرے میں بچھوادیں جہاں سلائی کرتی ہوں۔"

"تم کو معلوم تو ہے امّاں کس مزاج کی آدمی ہیں۔ اور اب تو وہ تمہارے لیے نینی تال میں اور یہاں مارکمرے پہ کمرے سجوانے میں جُٹی ہوئی تھیں۔ اچھا خیر۔ تو سوچ لو۔ اپنے متعلق تفصیلات لکھ کر لادو۔ لوَبی جلد از جلد تمہارا پاسپورٹ ویزا بنوادیں گے۔"

"بہت اچھا۔ اس میں بھی تو کوئی چکّر نہیں ہے؟"

"کیا مطلب؟ تمہارے ساتھ ہم جال بٹّا کریں گے؟ اتنی نیکی کرنے جا رہے ہیں اور تم یہ کہتی ہو؟ جاؤ پاسپورٹ کے لیے درخواست لکھ لاؤ ——"

چاندنی بیگم کے پیروں میں اسپرنگ لگ گئے۔ وہ فوراً تیز تیز چلتی ماماؤں کے برآمدے میں پہنچیں۔ خیال آیا کاغذ قلم تو کوٹھی ہی میں ملے گا۔ پھر واپس گئیں۔ پروین "لاسٹ منٹ" شاپنگ کے لیے حضرت گنج جانے والی تھیں۔ زرینہ کے لڑکے پنکی سے کاغذ قلم لیکر ویزا پاسپورٹ کی درخواست لکھنے بیٹھیں۔

پنکّی نے جاکر اپنی نانی کو اطلاع دی —— "نتّو —— نتّو —— پینی خالہ چاندنی باجی کو اپنے ساتھ امریکہ لیے جا رہی ہیں بطور آیا ——"

"بلاؤ اپنی پینی خالہ کو فوراً ——"

پروین اور صفیہ باہر کار میں بیٹھ چکی تھیں۔ پنکی بھاگا گیا۔

پینی بُرا سامنہ بنا کر گاڑی سے اتریں۔ اندر گئیں۔ رانی صاحب گرجیں "گدھیا تو تم ہمیشہ کی ہو۔ اے پروین سلطانہ وکی کی طرح تم بھی کھسک گئیں۔ تم چاندنی کو اپنے ساتھ لے جاؤگی امریکہ۔ اپنے گھر میں رکھوگی۔ عمر میں تم سے چھوٹی۔ جوان لڑکی۔ قبول صورت۔ تم سے زیادہ ذہین۔ کائیاں۔ یہاں آتے ہی فوراً کس طرح وکی سے بیاہ کے لیے راضی ہوگئی۔ اور میاں تمہارے جیسے ہیں۔ تم ان کی شکایتیں کرتے کرتے نہیں تھکتیں۔ رنگین مزاج —— دل پھینک۔ آجکل کی لڑکیاں کتنی بیوقوف ہیں۔ بھئی پروین تم نے تو حد کر دی ——"

"اے ہے —— ہمیں تو اس بات کا خیال ہی نہ آیا۔ ہم خود چکرائے ہوئے ہیں۔ لوَبی

کی تجویز تھی کہ انہیں یہاں سے لے جائیں۔ آپ نے بھی ابھی ابھی کہا کہ ان کا کسی اور جگہ بندوبست ہونا چاہیئے ــــ واقعی ــــ ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ مگر وہ تو پاسپورٹ کے لیے درخواست لکھ رہی ہیں۔ بے چاری بے حد خوش ہیں۔ ان کی زندگی بن جائے گی ــــ"

"ــــ اُن کی بناؤ اپنی بگاڑو۔ شاباش ــــ"

"اب ان سے کہوں کیا؟"

"کہدو تمہارے شوہر کا خط کراچی سے آگیا ہے۔ وہاں آپا کا انتظام ہوگیا۔"

اگلی صبح ناشتے کے فوراً بعد چاندنی نے پروین کے ہاتھ میں درخواست تھمائی۔

"وہ ــــ ایسا ہے ــــ چاندنی ــــ" پینی نے ذرا خجالت کے ساتھ کہا۔ "کل صبح ہم نے تم سے بات کی اور شام کی ڈاک سے ہمارے صاحب بہادر کا خط آگیا۔ ہماری نند نے کراچی میں آپا کا بندوبست کرلیا ہے۔ اسمیں آسانی بھی ہے تمہارا تو قومیت بدلوانے کا جھمیلہ رہے گا۔ تم انڈین نیشنل ہو۔"

چاندنی نے لمحہ بھر تک ان کی صورت دیکھی اور کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر خود ہی اسکے ٹکڑے چن کر صحن کے کونے میں لے گئیں۔ جہاں انگوری جھاڑو دے رہی تھی۔

پروین کی پاکستان روانگی کے تیسرے دن وِکی میاں "برف کا نظارہ کرنے" نینی تال بھیجدیے گئے۔

صفیہ بات ہی نہیں کرتی تھیں۔ زرینہ کی بڑی لڑکی شہلا عرف شیلی خاصی بقراط تھی وہ ہروقت کالج کی پڑھائی میں مصروف آمنہ عرف ایمی بہت چھوٹی تھی۔ پنکی شرارتوں میں مگن رہتا۔ باپ کی سختی بہت ضروری ہے الائچی خانم کہتیں ــــ لڑکے کو نانا نانی کے لاڈنے بگاڑ رکھا ہے۔ باپ نے کبھی پلٹ کر پوچھا ہی نہیں ــــ نہ ایکو بار وہاں بلایا۔

انہیں اس خاندان کے مسائل سے اب کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک ایک پل یہاں دوبھر۔

الائچی خانم پہلے ان سے خار کھانے لگی تھیں۔ اب مطمئن تھیں۔ نواسی کے لیے پھر راستہ صاف۔

چاندنی دن بھر اپنی چارپائی پر بیٹھی رہتیں۔

پروین سلطانہ کی روانگی کے چند روز بعد انہوں نے پنکی اور ایمی کو اردو پڑھانے کی پیشکش کی۔ پنکی حد سے زیادہ شریر تھا۔ زرینہ نے جواب دیا۔ "ان کو توڑ پھوڑ ہلڑ بازی سے ہی فرصت نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے تم ان کو پڑھا دیا کرو از دو۔ مگر بچے بھی کیا کیا پڑھیں۔ انگریزی، ہندی فرنچ۔ اب اردو بھی پڑھاؤں۔ اے چاندنی تم تو ــــ"

"جی ہاں۔ آپ فکر نہ کیجیے میں جلد از جلد یہاں سے چلی جاؤں گی ــــ"

اپنے دالان میں گئیں ــــ الائچی خانم کی کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ جانماز بچھا کر سجدے میں گریں۔ یا اللہ کوئی راستہ سجھا دے۔ تاریک حجرے میں دیر تک بیٹھی سوچا کیں۔ واپس ظفرپور؟ بنّے چچا کے گھر؟ ان کے بدنظرے آوارہ بیٹے؟

مسز ڈھونڈی کے ہاں چلی جاؤں۔ وہ ضرور بالضرور مدد کریںگی۔ لیکن اب ان بالکل اجنبی پارسیوں کے ہاں جا پہنچوں؟ جس طرح ان لوگوں نے یہ رشتہ طے کیا اور جس بھونڈے پن اور بدتمیزی سے توڑا اسکی وجہ سے بقول سونا کلی ڈھونڈی میم صاحب بہت خفا تھیں۔ "وہ بڑے بھیا کی سچی ہمدرد ہیں۔ اور تمہاری انسلیٹ بھی وہ نہیں جھیل پائیں۔ بڑی بٹیا سے کہت رہیں لڑکی کتنی ہی گریب ہو اسکی ایسی بے اجتی نہیں کرے کا چاہی۔ جیسے اُو کی کو نو ہستی ہی نہیں۔" جوں ہی وِکی کو اس فیصلے کی خبر ملی انہیں چپ لگ گئی تھی۔ فوراً انہیں پہاڑ روانہ کر دیا گیا۔ یہ کیسے بیحس لوگ تھے۔ اب میں مسز ڈھونڈی کے گھر جاؤں تو اس کُنبے کے تعلقات ان سے مزید کشیدہ ہونگے۔

—— یہاں سے ایمپلائمنٹ ایکسچینج —— ورنہ سیدھی کرامت حسین گرلز کالج۔ اپنی شاگردوں نے ظفرپور سے آکر وہاں داخلہ لیا تھا۔ یا کوئی نہ کوئی آشنا سا تو نکل ہی آئیگی۔ ورنہ پھر ریل کا ٹکٹ خریدوں اور دلّی جاؤں۔ ماموں کا پتہ —— ماموں کا پرانا پتہ تو نوٹ بک میں تھا۔ اس پتے پر پہنچ کر معلوم کروں۔ ایک شاگرد کی بلیماروں میں شادی ہوئی تھی اسے تلاش کروں۔ یہ سب تو بہت مشکل کام ہے۔ ناممکن —— دلّی جاکر ٹھیروں گی کہاں؟ اشوکا ہوٹل میں؟ نہیں۔ اور اگر ماموں بھی نہ ملے تو؟ کیا پتہ مر مرا گئے ہوں۔ بھئی اللہ میاں کمال ہے۔ ایسا بھی کیا آپ نے ہمارے ساتھ گھپلا کیا ہے —— توبہ توبہ اللہ توبہ معاف کر اللہ —— میرے ——

قنبر اور ربیلا کو فون کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ آنسوؤں سے تربتر تھا۔

باہر جاکر حوض کے کنارے اکڑوں بیٹھیں امرود کی شاخ سے صابن دانی اٹھائی۔ منہ دھونے سے پہلے عینک اتار کر منڈیر پر رکھی۔ چند منٹ بعد ہاتھ سے ٹٹولی تو غائب۔ شاید نیچے گر گئی ہو۔ دھندلا سا نظر آیا کہ زرینہ کا شیطان بچہ ان کی عینک مٹھی میں پکڑے دالان میں کھڑا ہے۔

"ارے پنکی میاں ہمارا چشمہ ——"

وہ ہنستا ہوا دور بھاگا۔ چاندنی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑیں۔

"وعدہ کیجیے ہمیں اردو نہیں پڑھائیں گی۔"

"اللہ میری توبہ۔ میری سات پشت کی توبہ —— نہیں پڑھاؤں گی۔ لاؤ۔"

وہ پھر بھاگا۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا چھینا جھپٹی میں عینک پٹ سے فرش پر گری دونوں شیشے ٹوٹ گئے۔

دوپٹے سے چہرہ پونچھتی چاندنی کوٹھری میں واپس آئیں۔ نوٹ بک جس میں بینائی کا نمبر درج تھا سوٹ کیس میں مقفل تھی۔ ایک شکستہ طاق میں گردآلود خالی بوتلوں کے

پیچھے کنجیاں چھپا رکھی تھی بکس کھولا۔ نوٹ بک تلاش کرنے کے لیے سارے کپڑے الٹ ڈالے۔ خیال آیا شاید ظفرپور سے چلتے وقت زیوروں کے ڈبے میں رکھدی ہو۔

وہ صندوقچہ غائب تھا۔

تین مہینے تین کٹوری ہاؤس میں جس طور پر انہوں نے گذارے تھے ان کے اعصاب ہار مان چکے تھے۔ کوٹھری سے باہر آکر اپنی چارپائی پر گریں۔ ہَل ہَلا کر بخار چڑھا۔ تین دن تک پڑی رہیں۔ اٹھیں تو زبان گنگ —— بدقت تمام خوش قدم سے کہا میرے گہنے چوری گئے۔

الائچی خانم نے جاکر رانی صاحبہ کو مطلع کیا۔ "چاندنی بیگم کو جانے کیا ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں۔ اب گہنے چوری گئے۔ جب سے آئی ہیں۔ روز ایک نہ ایک نئی مصیبت ان کی وجہ سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ آجتک تو کبھی کہا نہیں کہ گہنے پاتے بھی ساتھ لائی تھیں۔ یہاں آپ کے پاس سیف میں رکھوا دیتیں۔"

مامائیں مہریاں دالان میں جمع ہو کر اظہارِ خیال کرتی رہیں۔ "ٹوٹی کوٹھری میں گہنے رکھے ہی کیوں تھے۔ اور اب ہم پر چوری کا الزام لگا رہی ہیں۔" الائچی خانم نے فریاد کی "بھئی اب ان سے کہو جائیں کہیں اور ——"

سر سے کمبل اوڑھے چاندنی یہ آوازیں سُنا کیں۔ کمبل کے باریک سوراخوں سے دھوپ چھن کر اندر آتی تو بند پپوٹوں کے اندر بالکل سرخ سا رنگ دکھلائی پڑتا۔
کچھ دیر بعد ہمت کر کے اٹھیں۔ خواصیں مطبخ کی جانب جا چکی تھیں ایک تنہا کوا در

میں بیٹھا تھا عادتاً پلنگ کی پٹی کے نیچے ہاتھ گھمایا جہاں وہ ہمیشہ سونے سے پہلے عینک اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ یاد آیا عینک تو زرینہ سلطان کے آفت بچے نے توڑ ڈالی۔

بہت آہستہ آہستہ چلتی صحن عبور کر کے گیلری میں پہنچیں۔ ٹیلی فون کے پاس گئیں۔ قنبر کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ ڈائریکٹری اٹھا کر دروازے کے پاس اجالے میں لے گئیں۔ بغیر چشمے کے پڑھنا مشکل تھا۔ آنکھوں کے بہت قریب لیجا کر نمبر تلاش کیا۔

فون پر عیدو بولا۔ جی ہاں۔ صاحب ہیں ٹھہریے بلاتے ہیں۔

"ہلو۔ میں چاندنی بیگم ہوں — تین کٹوری ہاؤس سے۔"

"چا— چاندنی —" قنبر علی کی آواز آئی۔ "آداب عرض۔ ہاں ہاں بیلا نے ذکر کیا تھا ہم وہاں آنہ سکے مگر آپ کے جوب کے لیے برابر کوشش میں لگے ہیں آپ خیریت سے ہیں؟"

"جی نہیں — میں بالکل خیریت سے نہیں ہوں۔"

"ارے۔ آئی ایم سوری۔ کیا ہوا؟"

"ان لوگوں نے مجھے اپنے شاگرد پیشے میں رکھا۔

"شادی طے کی۔ پھر منسوخ۔

"پھر میری عینک ٹوٹی۔ پھر میرے زیور چوری گئے۔ پھر مجھے بخار آیا۔ اور اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں سے چلی جاؤ۔"

"گھبرایئے نہیں۔"

"اتنا کچھ ہو گیا اور آپ کہتے ہیں گھبرایئے نہیں۔ باجی اناں کے پاس جو بچے کھچے زیور رہ گئے تھے۔ وہی میرا آخری آسرا تھے۔"

"ہم ابھی آرہے ہیں۔ فوراً"

چاندنی نے دروازے کے اوپر لگے گھڑیال پر نظر ڈالی۔ اس وقت سہ پہر کا تین بجا تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر اپنے دالان میں واپس آگئیں۔ کمبل تان کر پھر لیٹ رہیں۔

قنبر علی نے کار زناٹے سے لا کر برساتی میں روکی۔ اندر پہنچے۔ وہ تین کٹوری ہاؤس عرصہ دراز کے بعد آئے تھے۔ اس سے قبل بُوبی کی دعوتِ ولیمہ میں شرکت کی تھی تو باہر شامیانے ہی میں بیٹھے رہے تھے۔ گیلری میں جا کر یاد آیا رانی صاحبہ کا کمرہ اس طرف ہے۔ آگے بڑھ کر جھانکا۔ رانی صاحب مسہری پر لیٹی تھیں۔ نورن پیر دبا رہی تھی۔ کون ہے۔ انہوں نے پوچھا۔

"پھچی آداب۔ ہم ہیں۔ قنبر علی۔"

"اے ہے ماشاء اللہ سے — آؤ آؤ۔"

"ہم چاندنی کو لیجانے آئے ہیں۔"

"شاباش۔ بڑی جلدی چاندنی کا خیال آیا۔ بیٹھو۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"ادھر چلے جاؤ۔ وہیں ہوں گی۔ پرسوں سے اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے پڑی ہیں۔ پوچھو کمبخت شاگرد پیشے میں کیوں رکھے تھے؟"

"آپ نے انہیں شاگرد پیشے میں کیوں رکھا؟"

"اس طرف جگہ نہیں تھی۔"

قنبر بپھرے ہوئے کمرے سے باہر نکلے۔ چاروں طرف دیکھا۔ صحن کے اس پار شکستہ دالان نظر آیا۔ جس کے آگے دو مامائیں دھوپ سینک رہی تھیں۔ پو قدمے وہاں پہنچے۔ "چاندنی —!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھیں۔ ایک مدّھم سا پستہ قد اجنبی سرہانے کھڑا نظر آیا۔ فوراً بال سمیٹے۔ چپلیں پہنیں۔

"سامان کہاں ہے؟" کوٹھری میں جھانکا۔ اندر گئے۔ سوٹ کیس اٹھایا۔ ہولڈال ایک کونے میں لپٹا رکھا تھا۔ اسمیں سے ایک چوہا کود کر باہر آیا۔ چاندنی نے وزیرن کو پکارا۔ بستر باندھا۔

"چلو کسی کو بلاؤ۔ اسباب کار میں رکھے۔" قنبر نے اصیل کو حکم دیا۔

"میرا لوٹا اور صابن دانی —" چاندنی کو یاد آیا۔

"بھئی وہ بھی لے آؤ۔" قنبر نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

"میری عینک ٹوٹ گئی۔"

"ارے یار کل صبح بنوا دیں گے۔ اس وقت تک ساری دوکانیں بند ہو جاتی ہیں۔"

چاندنی نے برقعہ اوڑھا۔ چلتے چلتے امرود کی شاخ سے صابن دانی اتاری۔ منڈیر پر سے لوٹا اٹھایا۔ خادمائیں دھوپ میں کھڑی رہیں۔ الائچی خانم اس وقت وہاں موجود نہ تھیں۔ ایک ملازم بستر بکس اٹھا کر باہر لے گیا۔ چاندنی قنبر کے ساتھ صحن میں سے گذریں۔ اسٹوپڈ گرل۔ وہ بڑبڑاتے۔ کیا عجیب بات تھی کہ دونوں میں چھوٹتے ہی اتنی بیساختہ بے تکلفی اور دوستی سی ہوگئی جیسے بچپن کے ساتھ کھیلے ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے چاندنی نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا کہ ہمیشہ ان کی رتی رتی بات بٹو خالہ بتلایا کرتی تھیں۔ تمہارے کزن کرکٹ کے شوقین ہیں۔ تمہارے کزن بوائے اسکاؤٹ ہیں۔ حالانکہ یہ میرے سچ مچ کے کزن بھی نہیں تھے۔ اور اب ایسی اپنائیت سگے رشتے داروں جیسی۔ لیکن بیکار۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے اللہ۔

وہ گیلری میں پہنچے۔ "رانی صاحب کو خدا حافظ کہتے چلیں۔" قنبر نے اندر نظر ڈالی۔

نورن نے اشارے سے جواب دیا۔ سو رہی ہیں۔

اس وقت ساڑھے پانچ کا عمل تھا۔ کوٹھی کا بیرونی حصہ سنسان پڑا تھا۔ نوکر نے سامان ڈکی میں رکھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے قنبر نے کہا۔ "معاف کرنا ہم فوراً نہ آسکے۔ دفتر کے کام میں دیر لگ گئی۔"

صفیہ سلطانہ نے دوسری منزل کی شہ نشین سے جھانکا۔

سنگی بالکنی پر سے "سینٹ جانز کانونٹ" کا بورڈ اتر چکا تھا۔

"ان کا اسکول بند ہوگیا؟"

"اسی نام کا ایک اور اسکول تخاس میں چل رہا ہے اب یہ دوسرا نام سوچ رہی ہیں۔"

قنبر ہنس پڑے۔ چاندنی نے ہاتھ ہلا کر صفیہ سلطانہ کو خدا حافظ کہا کار پھاٹک سے نکلی۔

ندی کے پُل پر ٹریفک کی بھیڑ تھی۔

"ارے سورج اچانک پانی میں ڈوب گیا۔ جیسے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔" چاندنی نے کہا۔

"ان سب نے تمہارے ساتھ بڑا عجیب سلوک کیا۔ تعجب ہے یہ تو بڑے مہذب لوگ ہیں۔"

"لوگ از خود کچھ نہیں کرتے۔ زمانہ اچھا برا سلوک کرواتا ہے۔ آپ نے ایک بار ٹیلی فون تک نہیں کیا۔ میں کسی بوتے پر ان سے اکڑتی۔ آپ شاید اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔"

"تم وہ گہنے میرے ہاں ہی رکھوا جاتیں۔"

چاندنی نے نقاب درست کی۔

"اب یہ برقعہ تہہ کر کے رکھو۔ یہ ظفر پور نہیں ہے۔"

نقاب کی کیپ اتار لی۔ تازہ ہوا چہرہ پر لگی۔ جان میں جان آئی۔ شوق سے باہر کا نظارہ کرنے لگیں۔

"تم نے یہاں کچھ سیر ویر کی؟"

"تین کٹوری ہاؤس سے قدم نہیں نکالا۔"

"ہم رانی صاحب کو کھری کھری سنا کر آرہے ہیں۔"

"خیر۔ تین مہینے پناہ تو مجھے انہیں نے دی۔"

قنبر میاں نے شادی کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ بخار کی وجہ سے چاندنی کی آواز میں اتنی نقاہت تھی کہ ٹیلی فون پر انکی پوری بات سمجھ ہی نہ سکے تھے۔ وہ بھی خاموش رہیں۔

"وِکی نظر نہیں آتے۔"

"نینی تال ——"

"ابھی سے ؟ اچھا ۔ برف دیکھنے ۔ وہ اس قسم کے کام بہت کرتے ہیں ۔ طلوعِ ماہ کا مطالعہ ۔ دورِ خزاں کا مشاہدہ ۔ پھولوں سے بیوہار ۔ باغ و بہار آدمی ہیں۔"

"تھوڑے سے کریک نہیں ہیں ؟"

"ارے نہیں بھئی ۔ محض بے انتہا حساس اور شاعر مزاج ۔ تقسیم کے زمانے میں اس سب کونٹینٹ میں جو خونریزی ہوئی تھی اس نے انکا دماغ ہلا دیا تھا ، رفتہ رفتہ ٹھیک ہوتے ۔ ہمارے دماغ کا بھی یہی حشر ہوتا مگر ہم موٹی کھال والے سپاہی آدمی حالات سدھارنے کا عزم لیکر میدانِ عمل میں کود پڑے ۔ تن من دھن سے ڈٹ گئے ۔ اور ڈٹے رہیں گے ۔ وِکی بھی دراصل انقلابی ذہن رکھتے تھے ۔ مگر تم نے ان کے ہاں کا ماحول دیکھا ۔ اس میں وہ مِس فِٹ تھے ۔ ہم نے اپنے گھر کی فضا اپنے خیالات کے مطابق بنالی ۔ وِکی ایسا نہ کر سکے ۔ نینی تال اکیلے گئے ہیں ؟"

"مع بوبی۔"

"ارے ۔ خدا خیر کرے۔"

"انکے دوست —— کوئی ٹھاکر ہیں ——"

"نارائن بخش سنگھ۔"

"جی ہاں ۔ وہی ۔ وہ بھی مع اپنی فیملی وِکی میاں کے ہمراہ گئے ہیں۔"

"تب ، تو ٹھیک ہے ۔ وہاں لالہ کالی چرن بھی تو ہوں گے ۔ قدیم وفادار —— ٹھاکر نارائن بخش سنگھ کے بہنوئی رگھبیر پرشاد سنگھ ہمارے یار جانی ہیں ۔ یہ فیوڈل نٹ ورک پشتینی وفاداریوں پر قائم تھا ۔ ہماری جنریشن تلک ہی باقی ہے۔"

وہ گھر جانے کے بجائے یونیورسٹی روڈ پر اُتر گئے ۔ اور کار کی رفتار آہستہ کر دی ۔ "ذرا ہوا خوری کرلیں ، گھر پہ تو کوتوال بیٹھا ہوگا۔" پھر وِکی کا تذکرہ کرنے لگے ۔ "وِکی

ہمارے ہمسن ہیں لیکن دوستی ہماری بڑے بھائی ہی سے ہے ۔ وہ بہت ہی غیر معمولی قسم کے آدمی ہیں چاندنی ۔ اور ایک سچّے ہیومنسٹ ۔ ہمیں انکی طرف سے بڑی فکر رہتی ہے ۔ کسطرح انکی زندگی رائیگاں جا رہی ہے ۔ تم نے انکا گھرانہ دیکھا ۔ سب فضول ، جعلی قسم کے انسان ۔ سوائے انکے والد کے جو بیحد نفیس آدمی ہیں لیکن بے اثر۔"

"اور صفیہ ؟"

"بوگس رومان پرست۔"

"وہ تو آپکے لیے بیراگن بن گئیں۔"

"واقعی ؟ عیش و آرام وافر ہے ۔ کریں کیا ۔ ایک رومینٹک کرب ہی سہی ۔ یہ جو غریب لڑکیاں دن بھر اسکولوں میں جان کھپاتی ہیں ۔ دفتروں میں کلرکی کرتی ہیں ۔ انکے پاس ایسی رومان پرستی کی فرصت نہیں ۔ لیکن چاندنی میرے ہاں تو افسوس یہ ہے کہ الٹا حساب ہوگیا۔"

"کیا — ؟"

"ہماری بی بی انہی جدوجہد کرنے والی بے نوا لڑکیوں میں سے تھیں ، ہمارا خیال ہماری کامریڈ ثابت ہونگی ۔ مگر نجانے کیوں وہ صفیہ سلطانہ ٹائپ بن بیٹھیں ۔ غالباً گذشتہ محرومیوں کی تلافی کرنا چاہتی ہیں۔"

عرصے کے بعد انہیں ایک ہم سخن ملا تھا ۔ ایک ایسی ہستی جو انکی مرحومہ ماں کی نام لیوا تھی ۔ وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے تھے۔

"تم بڑی ہوشمند لڑکی ہو۔"

"آپ نے ذرا سی دیر میں کیسے اندازہ لگایا ؟"

قمر میاں نے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا "بُدھی ! اور جرنلسٹ کا تجربہ ! —— تین مہینے تم نے ان لوگوں کے ہاں مصیبتیں جھیلیں مگر ہمیں فون نہ کیا ۔ مجبوری درجے ہی آج بلایا ۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہماری مدد کی حقدار پریشان حال لڑکی ہوتی تو ہماری جان کو آجاتی —— ہم اُڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں ۔ بس ایک بار ہی

دھوکہ کھا گئے۔ اچھا۔ اب تم ہمارے ہاں رہوگی۔ ذرا قرینے سے بیلا کو سمجھاتی رہنا۔ انکی شاپنگ کا جُنون ہمارے لئے ایک پروبلم بن گیا ہے۔"

"ممکن ہے آپ انکو زیادہ وقت نہ دیتے ہوں۔"

"فالتو وقت ہمارے پاس ہے کہاں؟ تین تین ہفتہ وار رسالے چھاپ رہے ہیں ہم۔ ان سے کہا تا پینگ ہی سیکھ لیں وہ لیٹی بلز اینڈ بُون پڑھتی رہیں۔ پھر —— دراصل —— چند مہینے پیشتر انکو ایک بھاری صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ اسوجہ سے ہم بھی طرح دے گئے۔ اب تم ہی ذرا انہیں سمجھانا۔ امّی جنیاں نے بتلایا تھا کہ تم سائیکولوجی پڑھاتی تھیں۔ بیلا بے چاری کی تعلیم معمولی ہے البتہ SLUM WISDOM بہت رکھتی ہیں —— ہم یہی تجزیہ کرکے خاموش رہتے ہیں۔ ہمیں بیحد خوشی ہے کہ تم ہمارے گھر چلی رہی ہو ——"

چاندنی گھبرا گئیں۔ فوراً بات کا رُخ تبدیل کیا۔

"جسطرح آپ نے بیلا کے متعلق تجزیہ کیا ہے۔ صفیہ کے بارے میں بھی معروضیت برتیے۔ ممکن ہے یہ محض رومینٹک کرب نہ ہو۔ سچ مچ کا عشق ہو! آپ ذرا انکے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں!!"

"عشق —— ؟ ہاہا —— بیلا سے شادی کا فیصلہ کرتے وقت ہم نے بھی اپنے اور انکے، دونوں کے متعلق یہی سمجھا تھا، علاوہ ازیں صفیہ بیگم کا عشق کلاس کا پابند ہے۔ ہم ایک تو رئیس زادے۔ اور انقلابی۔ لہٰذا بہت ہی رومینٹک۔ بقول پطرس ایک تو کُتّا۔ اور بکری کی جسامت کا کُتّا۔ گویا بہت ہی کُتّا!"

چاندنی کِھلکِھلا کر ہنس پڑیں۔

"اگر ہم ایک معمولی، سڑک چھاپ، سائیکل سوار کامریڈ ہوتے تو —— ؟ خرد ماغ! چاندنی —— ہمارے چیف رپورٹر ہیں معراج میاں انکے ایک بیچلر کزن تھے، نہایت بڑھیا آدمی۔ کامیاب ایڈووکیٹ، لیکن مڈل کلاس۔ ہم نے انکے لیے پیغام بھجوایا۔ صفیہ کے خاندان والے بھی جز بز ہوتے اور وہ تو بہت ہی بُرا مانیں۔

ہم شہنشاہ ایران کے لیے کوشش کرتے لیکن وہ تیسری بار دُولہن لے آتے۔"

چاندنی نے قہقہہ لگایا۔

گاڑی اب ماہ نگر کے راستے پر آچکی تھی۔

"آؤ تمہیں تھوڑی سی سیر اور کرادیں۔" قنبر نے رفتار تیز کی اور کچھ دور جاکر سڑک کے کنارے رک گئے۔ سامنے ایک سفید رنگ کی شکستہ کوٹھی جھاڑ جھنکاڑ میں چھپی کھڑی تھی۔

"وہ کھنڈر دیکھتی ہو۔ اسمیں ایک زمانے میں مرزا ہادی رسؔوا رہتے تھے۔ انہیں ایک یوریشین حسینہ سے عشق ہوگیا تھا۔ وہ شاید ان سے ریاضی پڑھنے آیا کرتی تھی اور وہ روزانہ شام کو اسی مہتابی پر بیٹھ کر اسکا انتظار کرتے تھے۔"

صحرائے مہتاب جیسا سنسان چبوترہ شفق کی روشنی میں جھلملایا۔

"پھر کیا ہوا؟ نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔" قنبر نے کہا۔

چاندنی نے سر باہر نکال کر غور سے دیکھا مگر عینک نہ ہونے کی وجہ سے منظر بہت ہی دھندلا معلوم ہوا۔

"سنو جانِ عالم پیا کا ایک شعر سُنو چاندنی ——

وہیں جنگل ہے اب پر اس سے آگے
چمن تھا، گُل تھے، ہم تھے، باغباں تھا"

گاڑی موڑی اور ریڈ روز کی سمت تیزی سے روانہ ہوگئے۔

چند منٹ بعد کہا "تم زیور رانی صاحب کے سیف ہی میں رکھوا دیتیں۔"

"دراصل مجھے ان کا خیال ہی نہ رہا۔ وہاں پہنچتے ہی سلائی وِلائی اور دوسری الجھنوں میں ایسی پھنسی کہ بالکل یاد نہ آئے۔ پرسوں جب نوٹ بُک ڈھونڈنے کے لیے سوٹ کیس کی تہہ پر نظر پڑی۔"

"تم کو ایک بات بتلائیں چاندنی بیگم۔" قنبر علی کار ریڈ روز گارڈن کے اندر لیجاتے ہوتے بولے۔ "ہم بھی تین چار سال اپنے کام میں ایسے الجھے رہے کہ اس معاملے کا خیال ہی ذہن سے اتر گیا جس کا تذکرہ امی جنیاں نے تمہاری والدہ سے کیا تھا۔ ہم بھی ایک قیمتی چیز تہہ میں رکھ کر بھول گئے۔"

منشی بھوانی شنکر سوختہ برآمدے میں کھڑے تھے۔ ایک بار پھر چاندنی کا اسباب اٹھا کر اندر لے گئے۔ قنبر نے عیدُو کو آواز دی ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے۔ "آؤ بھئی چائے وائے پی لو۔ بیلا تو بیوٹی پارلر گئی ہوئی ہیں۔ کل ہمارے کے ہاں ڈنر ہے۔ کچھ فارن جرنلسٹ دلّی سے آتے ہیں۔ لندن ٹائمز وائمز کے۔ اور لوگ بھی ہوں۔ تم یہاں چار آدمیوں سے ملوگی۔ اچھی ملازمت کی راہ بھی نکل آئے گی۔"

عیدُو چائے کی ٹرے لیکر حاضر ہوتے۔ کوٹھی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ کھانے کے کمرے میں رمضانی سائیڈ بورڈ سے برتن نکال رہے تھے۔ زیتون چاندی کی کٹلری صاف کرنے میں مشغول تھیں۔ بھگوان دین اور پھُٹکو گلدان دھو مانجھ رہے تھے۔

"بیگم صاحب کے آنے تلک سب کام ختم ہو جانا چاہیئے ورنہ کسی کی خیر نہیں۔" زیتون کی آواز آئی۔ چاندنی کی نظر بیرسٹر اظہر علی اور بٹّو بیگم کی تصاویر پر پڑی۔ آتشدان کی عنابی مخملیں جھالر پر بڑا نفیس موتیوں کا کام بنا ہوا تھا۔ قنبر نے کہا۔ "ہمیں یاد ہے امی جنیاں نے تبلایا تھا کہ——"

"جی ہاں۔ یہ جھالر باجی امّاں نے بنا کر بٹّو خالہ کو دی تھی۔"

چائے کی پیالی رکھ کر چاندنی نے پھر فریاد کی۔ "ہماری عینک ہی ٹوٹ گئی۔"

عجیب لیچڑ لڑکی ہے۔ وہی ایک رٹ۔ "ارے بھئی کہہ تو رہے ہیں کل صبح بنوا دینگے۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ بخار کیسا ہے؟"

منشی جی چند کاغذات لیکر اندر آئے۔

"بھوانی چچا۔ بٹیا کو ان کے کمرے کا راستہ تبلا دیجئے۔ شکر ہے بیلا نے اب تک اسے بریکفاسٹ روم میں کنورٹ نہیں کیا ورنہ تم کو اس سامنے والی بُرجی میں رہنا پڑتا!"

وہ صوفے سے اٹھیں۔ منشی جی کے ساتھ اندر گئیں۔ گیلری کے دروازے پر پہنچ کر سوختہ نے کہا۔ "وہ برآمدے کا آخری دروازہ مہمان کمرہ ہے سیدھی چلی جائیے۔ آپ کا سامان وہاں رکھوا دیا ہے۔ کوئی کام ہو تو زیتون کو بلا لیجئے گا۔"

"شکریہ منشی جی۔"

آگے بڑھیں۔ کوئی چیز بالکل صاف نہیں سُجھائی دے رہی تھی برآمدے میں تین دروازے کھُلتے تھے۔ سب پر ایک ہی وضع کے دبیز ریشم کے پھولدار پردے آویزاں آخری دروازہ سمجھ کر ایک پردہ سرکایا اور اندر گئیں۔ سامنے ایک مسہری نظر آئی تین دن کے بخار کی وجہ سے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ اندر جاتے ہی بستر پر گر گئیں۔ یہ کمرہ بھی کتنا دلکش اور سہانا تھا۔ سرہانے بلوریں گلدان میں گلاب مہک رہے تھے۔ آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد قنبر اندر آئے دیکھا۔ صاجزادی ان کی مسہری پر آرام کر رہی ہیں۔ سمجھ گئے یہ سب، عینک، ٹوٹنے کا فساد ہے۔ ہنسی آئی۔ واپس جانے والے تھے کہ دروازے میں بیلا سے ٹکرا گئے۔

یہ بھی بڑی پٹکل سچوئشن تھی۔ شوقیہ ڈرامہ اسٹیج والی۔ کھسیانی سی ہنسی ہنسے۔ بیلا نے اپنا بیگ مسہری پر زور سے پھینکا۔ قنبر نے سہم کر سوچا یہ اعلانِ جنگ ہے۔

چاندنی گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ پھر عادت کے مطابق پلنگ کے نیچے ہاتھ بڑھا کر عینک ٹٹولی۔ دفعتاً صورتِ حال ان پر روشن ہوئی۔ "اللہ رحم کرے۔" انہوں نے زور سے کہا۔

"آمین۔" بیلا نے زہر خند کیا۔

وہ آہستہ سے اٹھیں۔ ضعف بصارت کی وجہ سے ربر کے گلابی چپل گلابی قالین پر دکھلائی نہ پڑے۔ ٹٹول ٹٹول کر ڈھونڈا۔ "گیسٹ روم کدھر ہے؟"

بیلا خاموش رہیں۔ قنبر جان بچا کر رفو چکر ہو چکے تھے۔ چاندنی برآمدے میں نکل کر ساتھ والے دروازے میں داخل ہوئیں۔ پلنگ پر لیٹ رہیں۔

کچھ دیر بعد اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ہر چیز کو قریب جا کر دیکھنے لگیں۔ بیش قیمت سامان آرائش سنہری دھاریوں والا پرانا فرانسیسی فرنیچر۔ بڑھیا پردے۔

ٹھو خالہ اتنی امیر تھیں۔

صاف شفاف باتھ روم۔ کھڑکی میں شفاف سفید جھالردار پردے۔ طاق میں گلدان۔ اس میں گلاب کا ایک پھول بڑے آرٹسٹک انداز سے سجا ہوا تھا۔ بیلا کے سگھڑاپے کی قائل ہوئیں۔ اور وہ اس گھر کی مالکن بھی تو ہے۔ خاتون خانہ۔

آنسو بہنے لگے۔ منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ واش بیسن کے آئینے کے بہت قریب چہرہ لیجا کر اپنی شکل دیکھی۔ اچھی خاصی تو تھی۔ اگر بیلا کی طرح گھنٹوں بیوٹی پارلر میں بیٹھی رہتی تو میں بھی —— خیر۔ زندگی کسی طرح کٹ ہی جائیگی۔

مگر کیسے کٹے گی۔ کنگلی اور بے گھری۔ واپس آکر مسہری پر بیٹھ گئیں۔ نفیس پلنگ پوش پر ہاتھ پھیرا کیں۔ ساڑھے آٹھ بجے عیدو نے برآمدے میں آکر آواز دی۔

"بٹیا آیئے۔ کھانا لگ گیا۔"

تین ماہ تک باورچیخانے کی پیڑھی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے کھاتے میز کرسی بھول ہی گئی تھیں۔ خیر ظفر پور میں دادا میاں کے مرنے کے بعد کون سے ڈائننگ ٹیبل سجتے تھے۔ ابا

کے فرار کے بعد تو باجی اماں نے جیسے تیسے کرکے دو وقت کی روٹی مہیا کی۔ پلنگ کے پاس ایک کھُردری میز پر رکابیاں رکھ کر ماں بیٹی کھانا کھاتیں۔ اسی میز پر کتابیں رکھی تھیں۔ اسی پر کپڑے استری کیے۔

ڈنر ٹیبل پہ خاموشی طاری رہی۔ بیلا بالکل چُپ تھیں۔ چاندنی نے سوچا۔ آج اس عورت نے اپنا اصل رنگ دکھایا۔ قنبر بیوی کے اس گھٹیا برتاؤ کی وجہ سے بے طرح خفت محسوس کر رہے تھے اب وہ کس منہ سے تین کوڑی ہاؤس والوں کی بداخلاقی کی شکایت کر سکتے تھے۔ انہوں نے گفتگو کی سعی کی۔ "ظفر پور میں کیسا موسم رہتا ہے؟"

"ایسا ہی رہتا ہے۔ گرمیوں میں گرمی۔ سردیوں میں سردی۔"

"پہاڑ بہت نزدیک ہیں۔ سردی تو زیادہ پڑتی ہوگی۔"

"جی ہاں۔"

"ہم تو بس ایک دو بار ہی گئے۔ بچپن میں امی جنیاں کے ساتھ۔ ہمارے ماموؤں کے متعلق کچھ اطلاع ہے؟"

"جی نہیں۔ اگر وہ لوگ ظفر پور میں موجود ہوتے تو میں کالج پرنسپل کے گھر سے انہی کے ہاں چلی گئی ہوتی۔ میں بالکل انتہائی مجبوری کے عالم میں یہاں آئی۔ اور مجھے افسوس ہے کہ اس وقت آپ لوگوں کو زحمت دے رہی ہوں۔ اگر میرے زیور چوری نہ ہوئے ہوتے تو میں ——"

"ارے بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ زحمت کیسی۔ تمہارے لیے بہت جلد کوئی اچھا انتظام ہو جائیگا۔" قنبر نے جواب دیا۔ "یہاں آرام سے رہو۔ تمہاری خالہ کا گھر ہے۔" وہ پھر ہنسے۔ "اچھا بھئی یہ عجیب بات ہے۔ یہ جو ہماری کہاوتیں ہیں خالہ کا گھر —— نانی مر گئی۔ پھوپھی کا گھر اور دادی مر گئی کیوں نہیں کہا جاتا؟"

زیتون گرم چپاتی لیکر اندر آئی تھیں۔ بولیں "بھیا پا تنچے کے رشتے دار پگڑی کے رشتے داروں سے زیادہ محبت والے ہوتے ہیں۔"

"ہا ہا۔ پانچ کے رشتے دار ہمارے جو تھے وہ تو اپنی اکلوتی بہن ہی کو چھوڑ کر چلے گئے! چاندنی کافی پیو گی؟"

"جی نہیں۔"

"چائے وائے؟"

"جی نہیں۔ شکریہ۔"

"اچھا تو اب سویا جائے۔ کل صبح سے بیلا کو بہت کام کرنا ہے۔ پچاس آدمیوں کا ڈنر۔ مہمانوں کی فہرست بڑھتی ہی چلی گئی۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسے۔

"آپ مجھے بتلا دیجئے گا۔ میں مدد کر دوں گی۔ جو بھی خاص ڈش آپ چاہیں میں پکا دوں گی۔" چاندنی نے بیلا کو مخاطب کیا۔

"ضرور۔ ضرور۔ اچھا گڈ نائٹ۔" بیلا نے رکھائی سے جواب دیا۔

چاندنی اپنے کمرے میں واپس آئیں۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا۔ ہلکی ہلکی خنکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بستر پر بیٹھیں۔ بھاری چینی پلنگ پوش ہٹایا۔ اطلسی لحاف کے گل بوٹے ملاحظہ کیے۔ برف ایسی چادر۔ ملایم اونچے اونچے ولایتی تکیے۔ ایسے پلنگ پر زندگی بھر نہ سوئی تھیں۔

دادا میاں خوشحال تھے مگر یہ ولایتی ساز و سامان ان کے ہاں نہیں تھا — اے ہے ٹوتھ پیسٹ اور برش تو وہیں رہ گیا کوٹھری کے طاق میں۔ اب جا کر بیلا سے ٹوتھ پیسٹ مانگوں؟ ہرگز نہیں۔ ان کا بیڈ روم نزدیک ہی تھا۔ جہاں شامتِ اعمال پہلے جا گھسی تھی اللہ کل ہی نئی عینک بن جائے۔

باتھ روم سے واپس آ کر لباس تبدیل کیا۔ پلنگ پر بیٹھیں۔ کیسا ملائم آرام دہ بچھونا۔ اللہ شکر تو نے مجھے اس ٹوٹے دالان کی کھٹیا کے بعد ایسا بڑھیا بستر عنایت کیا۔ اب باقی دعائیں شروع کیں۔ یا اللہ میرے ابا جہاں کہیں ہوں خوش اور زندہ سلامت رہیں۔ یا خداوند کریم رب العالمین میری باجی اماں کو جنت میں جگہ دے۔ ان کی روح

کو میری طرف سے سکون پہنچا اور دادا میاں اور دادی اماں کو بھی۔ اور میرا کہیں بہترین بندوبست کر دے تاکہ میں مزید دربدر نہ بھٹکوں۔ ہر جگہ بن بلائی مہمان — یا اللہ —

ماسٹر بیڈ روم سے تکرار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ بقیہ دعائیں ملتوی کر کے ادھر کان لگائے۔

"اس فتنی کو کیوں لے آئے۔"

"اس غریب نے کیا فتنہ و شورش برپا کی ہے؟"

"الائچی خانم کوئی ان لوگوں کی مغلانی ہیں وہ زیتون کو فون کیا کرتی تھیں۔ اس نے ان کے خبطی بیٹے پر ڈورے ڈالے۔ اب یہاں جانے کیا گل کھلائے گی۔ ظفر پور سے کیوں نکالی گئی یہ تو معلوم ہی نہیں۔"

"بیلا۔ آہستہ۔ سب آواز ادھر جاتی ہے۔ اچھا کل رات کا مینو سوچ لیا؟"

"تمہارا بھیجہ۔ میرا کلیجہ اور اس چڑیل کا قیمہ۔"

"ایک بے سہارا لڑکی کے لیے ایسی بکواس کرتے تم کو شرم نہیں آتی۔"

"تم نے یتیم خانہ کھولا ہے؟"

"ریسکیو ہوم تو ضرور کھولا ہے۔ فون پر فون آتے تھے۔ مدد کرو۔ ظالم ماں باپ کی قید سے نکالو۔ تم نے بھی خوب نوٹنکی کھیلی۔"

"مجھے معلوم ہے یہ منشی کو فتہ —"

"سوختہ —"

"وہ میرے خلاف تمہارے کان بھرتا ہے۔"

"وہ اردو فارسی سنسکرت کے عالم ہیں کم از کم ان ہی کی عزت کرنا سیکھو۔"

"تمہارے ہاں سب ہی عالم فاضل ہیں۔ یہ بڈھا تو تمہارا گھر لوٹ کر اپنا گھر بھر رہا ہے۔ ہر ہفتے بورے میں بھر کر جانے کیا باہر لے جاتا ہے۔"

"شروع سے میاں جان نے ان کو اجازت دے رکھی تھی کہ دفتر کی ردّی بیچ لیا کریں۔ وہ بہت غریب آدمی ہیں۔ گاؤں میں اپنا اتنا بڑا ٹبر پال رہے ہیں۔ ایماندار اور وفادار ——"

"تمہارے امیر کبیر میاں جان نے ان کی تنخواہ کیوں نہ بڑھائی۔"

"بڑھائی کیوں نہیں۔ لیکن مہنگائی تو —— ڈیم اِٹ بیلا۔ شٹ اپ۔ بھوانی چچا کے ایسے سنت آدمی کے لیے آئندہ بدزبانی نہ کرنا۔"

"تمہارے یہاں سب فرشتے اور سنت ہیں۔ صبح سے شام تک تمہارے میاں جان امّی جنیاں اور بھوانی چچا کی تعریفیں سنتے سنتے کان پک گئے۔ اس بڈھے نے تمہیں میرے خلاف خوب بھڑکایا ہے۔ کیا میں اچھّی بیوی ثابت نہیں ہوئی؟"

"فضول خرچ۔ ٹرّی اور نیوروٹِک۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ کنویں میں کود پڑیں۔ ارے تم نے تو میری جان عذاب میں ڈال رکھی ہے۔ دوکانوں کے بِل آنے ختم نہیں ہوتے۔ زیادہ اودھیاؤ نہیں۔"

"اس گھر کی ہر چیز دقیانوسی ہے۔ میں اسے الٹراموڈرن بنانا چاہتی ہوں۔ سویڈش اسٹائل۔"

"بمبئی میں تو تم محل میں رہتی تھیں۔ بیلا تعجب ہے لوگ اپنا پرانا وقت کتنی جلدی بھول جاتے ہیں۔ اور آج کھانے کی میز پر مجھے کتنا نادم کیا۔ گھر آئے مہمان کی بے عزتی۔"

"میں اس گھر کی مالک ہوں اور میری اجازت کے بغیر یہاں کوئی مہمان وہمان نہیں آسکتا۔"

"بیلا تم بمبئی جاؤ کچھ ہمیں سکون ملے۔"

"میں کیوں جاؤں۔ گھر میرا ہے۔ میں تم کو نکال سکتی ہوں۔ مع اس پھولا لگی مرغی کے۔"

"ہم باغ میں خیمہ لگالیں گے!"

"باغ بھی تم بھولتے ہو میرے نام کر چکے ہو۔ امّاں ابّا نے دنیا دیکھی ہے انہوں

نے کہا تھا۔ یہ امیر زادے ہیں۔ جب جی چاہا کوئی دوسری تمہارے سر پر لا بٹھائیں گے۔ اس کی پیش بندی میں نے کی۔"

"ہم نے اسے —— اس بے چاری کو —— تمہارے سر پر لا بٹھالا ہے؟ بیلا تم گھاس کھا گئی ہو۔ میاں جان امّی جنیاں کے زمانے میں یہ مکان مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ طرح طرح کے حاجتمند آکر ہفتوں یہاں ٹھہرتے۔ وہ دونوں ان سب کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ ناخواندہ مہمانوں کی بھی خاطریں کرتے۔ تم ہو کہ ایک بے ضرر اندھی دُھندی لڑکی کی وجہ سے چند گھنٹوں میں بوکھلا گئیں۔ چُپ ہو جاؤ ورنہ اب ہمیں تاؤ آجائے گا۔"

"تم نے ابھی مجھ پر فراڈ کا الزام لگایا کہ میں نے نوٹنکی کھیلی۔"

"ثابت کرو کہ یہ غلط ہے۔"

"یقین جانو۔ قسم کھاتی ہوں۔ میں نے تمہارے پیسے سے شادی نہیں کی۔"

"نہیں تم نے تو بطور قومی خدمت میرا گھر بسایا ہے۔"

بجلی گُل ہو گئی۔

"لوڈشیڈنگ نے بھی ناک میں دم کر دیا ہے۔"

"تم بھی کر دو لوڈشیڈنگ۔ اس منحوس عورت کو کل صبح یہاں سے چلتا کرو۔"

"کسی ورکنگ ویمنز ہوسٹل میں انتظام کر دیں گے۔ ایک آدھ ہفتے میں۔"

"اور اس کا خرچہ تم بھروگے ہوسٹل کا؟"

"تو کیا انہیں سڑک پر نکال دیں؟ کل شام ہم کینتھ ہارڈی سے ان کے امی گریشن کی بات ڈِس کس کریں گے۔ وہ برٹش ہائی کمیشن والا۔ آجکل لوگ دھڑا دھڑ برٹین جا رہے ہیں۔ میں نے کاغذات منگواتے ہیں۔"

"اوہو ——"

"اسی مارے ہم نے چاندنی کو تین کٹوری ہاؤس کونٹیکٹ نہیں کیا تھا۔ پہلے سب بات پکّی ہو جاتے۔"

"یہ لندن جاکر بھاڑ جھونکے گی؟"

"وہاں بھاڑ نہیں ہوتے۔"

"اس کے زیور تو کہتی ہے چوری ہوگئے۔ وہاں جانے کا کرایہ کون دے گا۔ سب اُٹھائی گیرے یہی رونا روتے ہیں۔ بٹوہ چوری گیا۔ بستر اچوری گیا۔ اگر تھے بھی زیور تو کیا پتہ اسی کے تھے۔ وہاں ظفر پور میں کسی کے گھر سے چُراکر بھاگی۔ آئی بڑی زیوروں والی فقیرنیوں کا سا تو حلیہ ہے۔"

"بیلامت بھولو تم کس حلیے میں پہلی بار ریڈروز میں آئی تھیں۔"

"تو یہ لندن کا ٹکٹ تم خریدو گے؟"

"کیوں نہیں۔ سمندری جہاز کا کرایہ ہی کتنا ہے۔ کیا میں اپنی خالہ کی لڑکی کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتا؟"

"اوتے ہوتے —— خالہ کی لڑکی تو دیکھو۔"

"لندن پہنچتے ہی کسی کاؤنٹی کونسل اسکول میں سپلائی ٹیچر ہوجائیں گی۔۔"

چاندنی بیگم یہ تذکرہ سن کر بیحد مضطرب ہوئیں پہلے امریکہ بھیجی جارہی تھیں اب لندن۔

بڑو بیگم مرحومہ کا ڈریسنگ روم خوابگاہ اور مہمان کمرے کے بیچ میں پڑتا تھا۔ اس کے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے۔ بجلی غائب ہونے کے سبب سارے میں گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چاندنی بستر سے نکلیں۔ ڈریسنگ روم میں پہنچیں۔ ایک کونے میں رکھے لحاف توشکوں کے اونچے انبار سے جا ٹکرائیں۔ وہیں بیٹھ کر دروازے سے کان لگا دیے۔

"اللہ کی شان اس چڑقنات کو تم انگلینڈ بھیجو اور ہم یہاں جوتیاں چٹخائیں۔"

"بیلا تم بالکل دیوانی ہوگئی ہو۔"

"اس سے نکاح کیوں نہیں کرلیتے۔"

"ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ امی جنیاں کی روح خوش ہوجائیگی۔ میاں جان امی جنیاں دونوں کی روحوں کو ہم نے لوٹن کبوتر اور پریزادہ گلاب کی منڈلی سے ناتہ جوڑ کر کتنی تکلیف پہنچائی۔"

"یہ کارل مارکس کا بھگت بول رہا ہے۔ زندہ باد۔"

"زیادہ نہ ٹرّاؤ۔ منہ لگائی ڈومنی گاوے تال بے تال۔"

بیلا پلنگ سے کودیں۔ ایک ایش ٹرے اٹھائی قنبر کے منہ پر نشانہ باندھا۔ اندھیرے میں وہ دور جا گری۔ "مجھے ابھی طلاق دو اور صبح اس گھر سے نکلو۔"

قنبر چہرے پر ہاتھ پھیر کر پھر ہنس پڑے۔ "ارے ڈنر تو ہوجانے دو۔ ہم سویرے سویرے ہی چلے گئے تو مہمان کیا کریں گے ——"

"نکاح نامہ نکالو۔"

"نکاح نامہ —— ؟ ارے ہاں بھئی وہ ہے کہاں۔ ہم تو اسے رگھبیر پرشاد کے ہاں بھول گئے تھے۔ انہوں نے ہم سے کہا وہ الحمد و خالہ کو دے گئے اور امدو خالہ کو بی بی تم نے نکال دیا۔ تو اب تم ہی بتلاؤ کہ ہم کہاں سے لادیں نکاح نامہ؟ اب ہم جاکر ذرا ووڈکا سے شغل کرتے ہیں تم نے ہمیں بہت اشتعال دلایا۔ نہایت نامناسب گفتگو کی۔"

"تم تو اب بھی پیے ہوئے ہو۔ نکاح نامہ کی نقل مل جائے گی شہر قاضی کے پاس۔ ہمارے بمبئی میں تو چیف قاضی مورگھے۔ کے ہاں تمام ——"

"بھئی لاجواب نام ہے قاضی مرغے —— !"

"گارڈن والا کاغذ بھی مجھے صبح کو چاہیے۔"

"اس کا کیا کرو گی؟ وہ تمہارے لیے بالکل بیکار ہے۔"

"کیوں؟"

"اس پر جو ہم نے دستخط کیے تھے۔ ہم نے قنبر علی کے بجائے قمر علی لکھا تھا اور اسے رجسٹر بھی نہیں کرایا تھا۔"

بیلا نے ٹائم پیس اور دو تین ایش ٹرے زور زور سے قنبر کی طرف پھینکے۔ لائٹ جلائی۔ ایک کونے میں دھرا سویڈش کرسٹل کا گلدان کھینچ کر قنبر کے چہرے پر دے مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر چُور چُور ہو گیا۔

قنبر نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "تم نے یہ بھی توڑ ڈالا۔ بیلا رانی شوخ۔ یہ میری امّی جنیاں کا فیورٹ واز تھا——"

"جہنم میں جائیں تمہاری امّی جنیاں——" وہ دانت پیس کر چلّائیں۔

"کیا بکا تم نے——؟" قنبر نے پوری قوّت سے ان کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ دوسرا پھر تیسرا۔ بیلا کا منہ خون سے بھر گیا۔ قنبر نے سرد آواز میں کہا: "اتنے دنوں تم کو ایک نفسیاتی کیس سمجھ کر تمہاری مار پیٹ برداشت کر لی تھی۔ جاؤ۔ ڈیٹول سے کلّی کر لو——"

بیلا باتھ روم سے واپس آ کر پلنگ پر اوندھی گر گئیں۔ سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ قنبر نے ٹارچ کی روشنی میں گلدان کی کرچیں چُنیں اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

چاندنی بیگم لحاف کے ڈھیر پر سُن سی بیٹھی رہیں۔ بیلا کی طرف سے بہت متفکر ہوئیں۔ نجانے بیچاری کے کتنے دانت ٹوٹے۔ انسان کے پاس عینک نہ ہو یا دانت نہ ہوں تو بڑی پریشانی ہو جاتی ہے۔ یہ تو واقعی چار چوٹ کی لڑائی تھی —— کل صبح یہ دنداں ساز کے پاس جائیں گی۔ عینک ساز کی دوکان پر مجھے ڈراپ کر دیں۔

دبے پاؤں اٹھیں۔ ٹٹولتی ٹٹولتی اپنے کمرے میں واپس آئیں۔

پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

آدھ گھنٹہ گذر گیا۔

آہٹ ہوئی۔ گھُپ اندھیرے میں کچھ دکھلائی نہ دیا۔ دروازے میں قنبر کھڑے تھے۔

انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا——"آئی ایم ویری سوری —— ویری سوری فور الیوری تھنگ۔ ہمیں معاف کر دو مگر اس حرامزادی کو ہرگز معاف نہ کرنا۔ اس نے ہماری امّی جنیاں —— ان معظّمہ مرحومہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔"

لڑکھڑاتے ہوتے واپس گئے۔ بیڈ روم میں جا کر اپنے بستر پر گر گئے۔

چاندنی چاند کی منتظر رہیں تاکہ اس کے اجالے میں اٹھ کر کواڑ اندر سے بند کر لیں۔ مگر چاند تھا کہ فاسفورس سے روشن گوئے چوگان کی طرح سارے آسمان پر لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اس کھڑکی کے سامنے آ کر ہی نہ دیتا تھا۔ لحاف اوڑھ کر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو گئیں۔ سورج ڈھلنے کے بعد یہاں پہنچی تھیں۔ اس وقت شاید رات کا ایک بجا تھا۔ کیسی ہیبتناک یہ شام گذری۔ تین کوڑی ہاؤس میں کیا کم ہیبتناک شامیں گذری تھیں۔ ہلکان سی، لیٹے لیٹے، سُستی کے ساتھ چاندنی نے پوری زندگی کا ریویو کرنا چاہا۔ کبھی کبھی اچھّے دن بھی آئے تھے۔ ہمیشہ ایسی بھیانک زندگی تھوڑا ہی تھی۔ دادا کی کوٹھی۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ نیلی چٹانیں کاسنی بجری۔ ہری دُوب۔ سرمئی دیواریں۔ گُل چین اور گُل مخمل کے گچھے۔ چچا زاد بہن بھائیوں کے ساتھ کھیل کود۔ دادا دادی کے لاڈ پیار۔ اپنی جیپ گاڑیوں میں بیٹھ کر روز پہاڑ پر جایا کرتے تھے۔ بہت اچھّی زندگی تھی وہ۔ اور اس کے علاوہ پھر—— نہیں اس کے علاوہ تکلیفیں۔ البتہ امتحانات پاس کرنے کی خوشی تو بہت ہوتی تھی۔ اور اس کے علاوہ—— اور کیا—— اور کوئی سنہرے دن تھے؟ نیند کی جھپکی آئی۔ دادا میاں کی آواز سُنائی دی۔ میاں نُور پوش تمہیں سلام کرنے آگئے۔ چاندنی بیٹے۔ جاگو۔ نماز پڑھو۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھیں—— دادا ابّا—— دادا ابّا—— آداب—— جواب میں خاموشی اور اندھیرا—— ماسٹر بیڈ روم سے قنبر

کے خراٹوں کی آواز آئی۔ سوگئے بے چارے۔ کیسے نیک آدمی ہیں اور کیا قہرناک بیوی ملی۔

بجلی اب تک نہیں لوٹی۔ اور چاندنی اندر کیسے آئیگی کھڑکی پر تو پردے پڑے ہیں۔ ان کی ڈوریاں جانے کیسے کھینچتے ہیں۔ کوئی طریقہ ہے۔ ایک انگلش پکچر میں دیکھا تھا۔ سیاہ فراک سفید ایپرن سفید ٹوپی پہنے میڈ نے آکر پردوں کی سنہری ڈوریاں سر سر کھینچیں۔ اجالا ہوگیا۔ اندھیرے میں ڈوری بھی نظر نہیں آئیگی۔ باتھ روم کیسے جاؤں۔ انگلینڈ کے مکانوں میں بھی کمرے ایسے ہی سجے ہوتے ہیں جیسے ٹنو خالہ نے یہ کمرہ سجایا تھا۔ سارا ریڈ روز کسی پرانے انگریز کا سا گھر معلوم ہوتا ہے۔ چارلس ڈکنز کے ناولوں کی تصویروں جیسا۔ اللہ قنبر کو اجر دے۔ مجھے لندن بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ کیوں کیا میں نہیں جاسکتی؟ جو لوگ وہاں جا رہے ہیں کیا ان میں سرخاب کے پر لگے ہیں؟ کل ــــ نہیں ــــ آج ــــ اب تو آج لگ گیا۔ آج شام قنبر کا انگریز دوست انہیں بتائے گا۔ کاغذات لیکر آئے گا۔ اللہ قنبر کو جزا دے۔ پھر انگلینڈ میں کام کرکے پیسہ جمع کرکے سیدھی ظفر پور واپس جاؤں گی۔ مکان کی مرمت کرواؤنگی۔ انشاء اللہ۔ دادی جنیاں کے مرنے کے بعد ان کے زیورات میں اپنا حصہ لینے چھوٹی چچی فوراً آن پہنچی تھیں پاکستان سے ــــ اے ہے بھابھی آپ ابتک اسی کھنڈر میں بیٹھی ہیں ــــ باجی اماں نے کہا دلہن تمہیں میرے حالات کا علم تو ہے ــــ اور ان کی نخرے پیٹی لڑکیاں ــــ اے ہے چاندنی آپا کس طرح آپ ایسی سٹریل جگہ رہتی ہیں بھئی۔ باجی اماں نے کہا تھا تم بھی اسی مکان میں پیدا ہوئی تھیں۔

اپنے پہنے ہوئے چمکیلے جاپانی ریشم کے کپڑے سوٹ کیس بھر کر میرے لیے لائی تھیں۔ آپا یہ نئی رسٹ واچ بھی لے لو۔ یہ سینڈل بھی لے لو۔ ہم تو اور چیزیں بھی لے آتے مگر کسٹم کا پرابلم تھا ــــ پھر شنو بھائی کہنے لگے۔ ہم تو بس پر سفر کرتے نہیں۔ دلی ایرپورٹ ہی سے ظفر پور آنے کے لیے ٹیکسی کرلی۔ راستے میں کتنی جگہ چار خانوں پر رکے۔ گلاسوں میں چا پی۔ اتنی مکھیاں۔ ایسے اناپ شناپ لوگ اور چار خانوں

کے سامنے وہ بچھی تھیں ــــ وہ ــــ انہیں کیا کہتے ہیں وہ رسیاں سی بٹ کر ــــ اسٹرنگ ــــ اسٹرنگ ــــ باجی اماں نے کہا ــــ اسٹرنگ کوٹ ــــ جی ہاں دہی ــــ باجی اماں نے کہا بیٹے تم نے یہ کھاٹ پہلے کبھی نہیں دیکھے؟ تم تو یہاں سے اچھے خاصے پندرہ سولہ سال کے گئے تھے ہائی اسکول کرکے۔ اور بیٹے تمہارے ہاں گاؤں قصبوں کے راستوں میں ایسے چار خانے نہیں ہوتے؟

اللہ کیسی چھچھوری باتیں کرنے لگے تھے وہ سب۔ پھر شنو میاں نہانے کے لیے اٹھے۔ خیر وہ تو یہاں سے چھوٹے سے گئے تھے نل کھول کر بولے بڑی اماں آپ کے ہاں رننگ ہوٹ اینڈ کولڈ واٹر بھی نہیں ہے؟ باجی اماں نے پھر نرمی سے کہا تھا بیٹے حمام میں بالٹی مگے رکھے ہیں جاکر نہالو۔ تو وہ بولے ــــ اچھا بالٹی ــــ بالٹی۔ مگے۔

باجی اماں نے چپکے سے کہا تھا ــــ چاندنی ــــ ان لوگوں کو کیا ہوگیا؟

چچی نے یہ بھی تو فرمایا تھا۔ اے ہے بھابھی جان آپ تو لالو کھیتوں کی طرح رہنے لگیں۔ اور ہمارے ہاں سے تو اب لالو کھیتی بھی انگلینڈ امریکہ جاکر وڈیرے ہوگئے۔ باجی اماں نے پوچھا تھا ــــ لالو کھیتی کون ہیں۔

جمائی لی۔ یا اللہ اب نیند آجائے کچھ دیر میں سویرا ہوجائے گا۔ دادی کے گہنوں میں سے آدھے سے زیادہ چچی بٹورے گئیں ــــ میری تین تین لڑکیاں ہیں۔ یہ بھی دیدیجے۔ علی بند کی جوڑی بھی دیدیجے۔ آجکل پہنچوں کے زیور کون پہنتا ہے یہ بیچاری چاندنی علی بند کہاں پہنیں گی۔ میں انہیں تڑوا کر دو عدد چھلے بنوالوں گی۔ باجی اماں چپ بعد میں کہنے لگیں تو کیا ان سے جاہل عورتوں کی طرح کائیں کائیں لڑتی؟

باجی اماں مریں۔ تعزیت تک کا خط نہ لکھا۔ اور جو بچ گئے تھے زیور ــــ اللہ تونے میرے گہنے کیوں چوری ہونے دیے؟

آنسو پھر رواں ہوئے۔ یا اللہ تو کائنات کو از سرِ نو بنا۔ سارے معاملات دنیا کے جو بگڑ گئے ہیں اللہ تو بالکل شروع سے شروع کردے۔ تاکہ ایک بار پھر سے آدمی ٹھیک ہوجائے۔

سارے انسان سر بمہر لفافے ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ بند پارسل۔ دم پخت ہانڈیاں۔ کچھ پارسلوں کے اندر ٹائم بم رکھے ہیں۔

ہتھیلی سے آنسو پونچھے۔ گلے میں پڑی کہربا کی ہول دِلی کو چھوا۔
نہ قنبر۔ نہ وِکی۔

خیر۔ اللہ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لیے کرتا ہے۔ اس کی مصلحت وہی جانے۔ خداوند کریم تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے میرا انگلینڈ جانے کا یقیناً بندوبست کر دیا۔ اور تو نے مجھے ایسا نرم نفیس بستر سونے کو عنایت کیا۔ وہ لحاف کو سر سے اوڑھ کر اس طرح بیٹھ گئیں جیسے چڑیا گھونسلے میں بیٹھ جاتی ہے۔ سکون۔ احساسِ تحفظ۔ اطمینان۔ قناعت۔ تشکّر۔

باتھ رُوم ہو آؤں۔ میز کو ٹٹولا۔ شمعدان پر ہاتھ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ماچس رکھی تھی۔ شام یہ نقرئی شمعدان دیکھا تھا مع موم بتی۔ چاندی کے کیس میں چھپی ماچس۔ بجلی بار بار غائب ہونے کی وجہ سے ہر کمرے میں موم بتّی کا انتظام تھا۔ بیلا کی سلیقہ شعاری کی قائل ہوتیں۔ ماچس اٹھائی۔ ایسی کم قیمت حقیر چیز چاندی کے مُنڈھے سے کیس میں رکھی تھی۔ جیسے بیلا سی عورت اس کوٹھی میں بحیثیت بیگم قنبر علی — سب اللہ کی قدرت کے کھیل ہیں۔
انگوٹھے سے کھسکا کر ڈبیا نکالی ایک دیا سلائی رگڑی۔ وہ فوراً بجھ گئی۔ اس کرسمس اسٹوری کا خیال آیا وہ غریب بچی جو محل کی دیوار کے باہر گرتی برف میں دیا سلائی روشن کر کر کے راحت اور سکون کا تصور کرتی تھی۔
اٹکل سے شمعدان اٹھا کر دوسری ماچس جلائی وہ بھی بجھ گئی۔ چشمہ ٹوٹنے کے بعد دن کی روشنی ہی میں کم سجھائی دیتا تھا۔ اب تو بالکل BLIND AS A BAT

— خدا نہ کرے جو میں بلائنڈ ایز اے بیٹ ہوں — تیسری رگڑی — وہ جلتی ہوئی ہاتھ سے چھٹ کر لحاف پر گری۔ شعلے بھڑکے۔ سفید تکیے پر سفید موم بتی گر پڑی تھی۔ جو ان کو سجھائی نہ دی۔ وہ بھی جل اٹھی۔ آگ سرعت سے پھیلتی چلی گئی۔

لحاف کا "آشیاں" بھڑک اٹھا۔ ہوا کے زور سے دروازے اور کھڑکی کے پٹ وا ہوتے۔ کمرہ آگ سے بھر گیا۔ مشتعل اژدہوں کے مانند سرسراتے پھنکارتے شعلے پل کی پل میں بڑو بیگم کے ڈریسنگ رُوم میں جا گھسے جہاں بیلا نے تین ماہ قبل اسقدر تحکم سے اور احمد و کی مخالفت کے باوجود گبّے تو شک وغیرہ رکھوائے تھے۔ منوں روئی کے انبار نے فوراً آگ پکڑ لی — مختصر کچن میں رکھے گیس کے سلنڈر پھٹے۔ ماسٹر بیڈ روم دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ گیس کا دھماکہ چاندنی، بیلا، اور قنبر کی چیخوں پر غالب آیا۔

آگ کی مہیب کنڈلیوں نے ساری کوٹھی کو لپیٹ لیا۔ دفتر کے کمروں میں آگ کھُل کھیلی۔ قانون کی کتابوں سے اٹا اٹوٹ بھری الماریاں، تینوں رسالوں کے انبار۔ میگزین اخبارات۔ نیوز پرنٹ کے گٹھے۔ فائل سب کو آتشیں جھاڑو سے سمیٹتی منشی جی کی بُرجی میں پہنچی۔ وہ ردّی کاغذات کے ڈھیر کے درمیان بیٹھے چھان بین کر رہے تھے۔ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اردو فارسی کتابوں سے لدی شعلہ جوالہ الماری انکے اوپر گری اور وہ اسکے نیچے دب کر رہ گئے۔ نولکشور پریس کی نایاب اردو کتابیں اور اردو رسم الخط میں چھپی دھارمک مطبوعات۔ شیخ اظہر علی مرحوم کی خاندانی دستاویزوں کا بستہ جو منشی جی کی تحویل میں رہتا تھا، سب کا سب نذرِ آتش ہوا۔ خود لالہ بھوانی شنکر سوختہ اس کاغذی چتا میں بھسم ہو گئے۔

اس وقت صبح کے تین بجے الحمدو شمالی ضلع بہرائچ کے موضع امام گنج میں اپنے چھپّر تلے خوابیدہ تھیں۔ ان کے یکّہ بان لڑکے بھتیجے۔ بہوئیں اور بچے گدڑیوں اور چھینٹ کے لحافوں میں دبکے گہری نیند سو رہے تھے۔ باہر چوڑے کچّے راستے کے دونوں طرف استادہ چوبی کھمبوں کے برآمدوں والے خام اور پختہ مکانوں میں خوابیدہ لوگ اپنے اپنے سپنے دیکھ رہے تھے۔ چند دروازوں کے سامنے گھوڑے بندھے تھے۔ چاروں طرف ہرے کھیتوں پر کہرہ منڈلا رہا تھا۔

الحمدو نے سوتے میں دیکھا جیسے سرکار اور بڑی بیگم صاحب کہرے میں سے نکل کر آتے ہیں۔ ان کے سرہانے کھڑے زور زور سے چلّا رہے ہیں۔ امدو— امدو— میرے بچّے کو بچاؤ— میرے بچّے کو بچاؤ— بھوانی شنکر کو بچاؤ۔

وہ بوکھلا کر اٹھ بیٹھیں۔ ترائی کی بڑی سرد رات تھی۔ بڑے لڑکے کو جگا کر چلّائیں۔ مجھے اسیوقت بس اڈے پہنچا دو۔

"امّاں تم تو بالکل بولا گئی ہو۔" اس نے بڑبڑا کر کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔ اٹھ کر بھتیجے کے پاس گئیں۔ اسے جھنجھوڑا۔ "بس اڈے —— بڑا برا خواب ——"

وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ "پھپھو تمہارے خوابوں نے تو نتھنوں میں دم کر رکھا ہے۔ آدھی رات کو کہاں چلیں؟"

خواب بتلایا۔ التجا کی۔ میرے بھیا میرے چندا——

"پھپھو۔ بس صبح پانچ بجے سے چلیں گی۔ پڑ کر سو رہو——"

اس جاڑے میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں لالٹین جلا کر کوٹھری میں گئیں۔ ٹرنک میں کچھ کپڑے ٹھونسے۔ اپلوں کا چولھا سلگا کر گڑ کی چاء بنائی۔ وضو کیا۔ نفلیں پڑھیں۔ بھیّا کی خیریت اور سرکار بیگم صاحب کی مغفرت کے لیے گڑگڑائیں۔

ایک گلاس چاء بھتیجے کو پلائی۔ لوئی اوڑھی۔ اس نے ٹرنک اٹھایا۔

گرتی پڑتی باہر نکلیں۔ لڑکے نے یکّے میں گھوڑا جوتا وہ جناور اتنے زور سے ہنہنایا کہ الحمدو دہل گئیں۔

گھوڑا کچّے راستے سے نکل کر ڈامر کی سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ الحمدو ڈنڈے پکڑے بکس سنبھالے یا علیؑ یا علیؑ کرتی رہیں۔ حیوان میں بھی شیطان گھُس گیا ہے۔

یا الٰہی کوٹھی پر امن چین ہو۔ غازیؒ میاں کے مزار پر چادر چڑھانے کی منّت مانی۔ نانپارہ کی بس تیار ملی۔ اللہ اللہ کرتی سوار ہوئیں۔ پھپھو خیریت کا کارڈ ڈال دینا۔ بھتیجے نے کھڑکی میں سر ڈال کر کہا۔ اللہ حافظ۔

راستے میں انجن بگڑ گیا۔ دوپہر کے وقت نانپارہ پہنچیں۔ چاء کی طلب میں بس سے اتریں۔

حاجی کلّو کے ڈھابے پر ریڈیو کے گرد بڑی بھیڑ جمع تھی۔ سب منہ کھولے خبر سُن رہے تھے۔ الحمدو نے بھی سُنا۔ وہیں غش کھا کر گر پڑیں۔

مسافروں کو چاء خانوں سے واپس بلانے کے لیے ہارن بجا بجا کر بس آگے جا چکی تھی۔ الحمدو کا بکس بھی اسی میں رکھا چلا گیا۔ ایک مفلس عورت کے زادِ راہ میں کسی کو کیا ملا ہوگا۔ تہہ میں بچھے پرانے اخبار کے نیچے قنبر علی اور بیلا کا نکاح نامہ البتہ موجود تھا جو راجہ رگھبیر پرشاد گذشتہ برس الحمدو کے حوالے کر گئے تھے۔

مستی بھولا ناتھ بھی ایک بیحد غریب چور تھا۔ کپڑے اپنی بیوی کے لیے نکال لیے۔ نکاح نامے کا لفافہ دیکھا بہت خوش ہوا کہ اس میں نوٹ ہوں گے۔ نکلا اسمیں سے ہرے رنگ کا پتلا سا کاغذ۔ ستیاناس۔ پھاڑ کر پھینکدیا۔

⑤ جھانکڑ باغ

لال گلال ریڈ روز۔ لال گلال ندی۔ لال گلال آسمان۔ شدید تپش اور تیز روشنی —— ہوا کے زور سے آگ درختوں تک پھیلی۔ شاگرد پیشہ آدھا جھلس گیا۔ اس کے مکین سب زندہ سلامت باہر نکل آئے۔ رمضانی عیدو علاء الدین چیخ پکار مچاتے کوٹھی کی طرف دوڑے۔ نتھا دھوبی اور ان کے لڑکے بالٹیاں اٹھا کر ندی میں کود گئے۔ بھگوان دین اور پھٹکو نے آب رسانی کے پائپ نکالے۔ بھینسیں اور نیل گائے اور ہرن رسیاں تڑا کر بھاگے۔ درختوں پر بسیرا لینے والے خوفزدہ پرندوں نے قیامت کا شور مچایا۔ بہت سے بھُن بھُن کر پٹ پٹ گر گئے۔

کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ خوفناک حادثے کیوں ہوتے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں آج تک بھلا آیا ہے۔

فائر بریگیڈ کے آتے آتے آگ اپنا کام تمام کر چکی تھی۔

مرحومین کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جلا ہوا باغ اور احاطہ لوگوں سے بھر گیا۔ سڑک تک مجمع تھا۔ پردھان منتری، چیف منسٹر، عمائدین شہر، اخبار نویسوں سیاسی پارٹیوں اور عام پبلک کے نمائندوں اور احباب کی جانب سے چوڑے سیاہ فیتوں سے بندھے بڑے بڑے ریتھ لا کر ملبے پر رکھے گئے۔ ——

"قنبر علی کی یادیں" قسم کے مضامین کا سلسلہ پریس میں شروع ہوا۔ اردو انجمنوں نے سوختہ کے لیے تعزیتی جلسہ کیے۔

پریس والوں کی بھیڑ لگی۔ پولس نے ملازموں کے بیانات قلمبند کیے۔ عدالت نے انکوائری کمیشن بٹھایا۔ فیصلہ تھا کہ اتفاقیہ آگ لگی۔

"عجیب اتفاقات ہیں:" معراج احمد نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ وہ سب راکھ اور اینٹوں کے ڈھیر پر اس جگہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ جہاں ریڈ روز گل سُرخ اور لال گلاب کا دفتر تھا۔ "اچھے اتفاقات ہیں بھئی۔ اتفاقیہ دنیا ظہور میں آئی۔ اتفاقیہ آبی پودوں میں جان پڑی۔ اتفاقیہ دنیا کا خاتمہ ہوگا۔"

"صاحب اس تصور سے بڑا سکون سا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم فانی ہیں تو باقی دنیا کون ابدالآباد تک رہنے والی ہے۔ لیکن یہ احساس کہ آئندہ لاکھوں برس تک یہ جہان رنگ و بو اسی طرح قائم رہیگا۔ اور زیادہ ترقی ہوگی۔ انسان موجود رہیں گے سوائے ہمارے —— یہ خیال بہت —— بہت ——" مدیر گل سُرخ نے بات ادھوری چھوڑ کر حسب عادت سگریٹ پھینکنے کے لیے ہاتھ بُلند کیا۔ معراج احمد بھی عادتاً کہنا چاہتے تھے یار ایش ٹرے ہیں۔ بھاڑ۔ کیا آگ واگ لگانے کا ارادہ ہے۔ چُپ رہے۔

بڑی چھوٹے لال سیاہ ماتمی پٹی بازو پر باندھے نمودار ہوئیں۔ سائیکل اسی مقام پر کھڑی کی جو اس کے لیے مخصوص تھی۔ سُرخ گلابوں کا گُچھا سنبھالے ملبے پر چڑھیں۔ سیاہ ربن سے بندھے گلدستے پر انہوں نے ایک کارڈ ٹائپ کر کے لگایا تھا۔

MR. & MRS QAMBER ALI

REST IN PEACE

خاکستر کے ڈھیر پر گلدستہ رکھ کر سر جھکائے اٹینشن کھڑی رہیں۔ صحافی بھی اٹھے۔ حسب ضابطہ دو منٹ کی خاموشی کے بعد وہ سب بیٹھ گئے۔ بڑی لال

نے چاروں طرف نظر ڈال کر اپنا سرمئی اسکارف، بڑی نفاست سے ایک شہتیر پر بچھایا اور اس پر فروکش ہوئیں ننھا سا رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔ پھر نیچی آواز میں بولیں "لوگ مسز قنبر علی کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ سب اور ان کا ڈومسٹک اسٹاف۔ خود ان کے ہزبینڈ۔ مگر میں جانتی ہوں وہ کتنی گڈ ہارٹڈ تھیں۔ ان کی کمزوری محض یہ تھی کہ حد سے زیادہ منہ پھٹ تھیں۔ ان کو برابر غلط سمجھا گیا۔"

ہم سب کو دنیا سے یہی شکایت رہتی ہے کہ ہمیں غلط سمجھا جاتا ہے۔ معراج احمد نے سوچا۔ انہیں یاد آرہا تھا کسطرح وہ قنبر علی کے کہنے پر استاد موگرے کی ٹولی کے متعلق سُن گُن لینے رکاب گنج گئے تھے واپس آکر رپورٹ دی تھی۔ فوٹو فیچر کا انتظام کیا تھا وہ راجہ رگھبیر پرشاد سنگھ کی کوٹھی پر اس پر اسرار شام آلیا اور دل سننے باہر آگئی تھیں اور ان سے سیاست پر گفتگو کی تھی۔ وہ بیحد ذہین تھیں۔ قنبر میاں ان سے دفتر کا کچھ کام کرواسکتے تھے۔ پروف ریڈنگ ہی سکھلا دیتے۔ وہ مصروف رہتیں اور گھریلو دنگے فساد اور فضولیات میں نہ پڑتیں۔

وہ سب آبدیدہ تھے اور اپنے اپنے طور پر مسٹر و مسز قنبر علی کے متعلق سوچ رہے تھے۔

چاندنی پہلی بار اتوار کے دن آئی تھیں اور دوسری اور آخری مرتبہ شام کے ساڑھے پانچ بجے دفتر بند ہونے کے بعد یہاں پہنچی تھیں۔ ان کو ادارتی اسٹاف میں سے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ کوئی ان سے واقف نہیں تھا ان کا نام تک نہ سنا تھا۔ اخباروں میں بھی بار بار مسٹر و مسز قنبر علی منشی بھوانی شنکر سوختہ اور "ایک مہمان خاتون" ہی شائع ہو رہا تھا۔

منشی جی کی ودھوا، بھاوجیں اور لڑکیاں گاؤں سے آئیں۔ کھنڈر میں بیٹھ کر دلدوز بین کرتی رہیں۔ تیسرے روز پسماندگان شمشان گھاٹ جاکر مرنے

والے کی ہڈیاں یا "پھول" چنتے ہیں انہیں گنگا میں بہا دیا جاتا ہے۔ راکھ کے ڈھیر میں سوختہ کی ایک بیٹی کو بڑی سی سوختہ ہڈی ملی۔ کیا پتہ پتا جی کی ہے یا قنبر بھیا کی۔ اس نے سوچا۔ ہڈیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں اس نے دوبارہ راکھ کے نیچے دبا دی اور ہاتھ جھاڑ کر اٹھی۔

روتے پیٹتے علاء الدین، رمضانی، عیدو، بھگوان دین، پھنکو، ننھا، ہفتوں بھیا، بہو صاحب، منشی جی اور مہمان بٹیا کے استخواں تلاش کرنے میں جٹے رہے شہتیروں اور اینٹوں کے ٹنوں ڈھیر کے نیچے دبے پنجر تلاش کرنا کوئی آسان بات تھی؟

پورٹیکو میں موجود کار کے تپے ہوئے سُرخ ڈھانچے کے اندر چڑیوں نے گھونسلے بنائے۔ برساتی کی چھت پر پھیلی مدھو مالتی بھی جل چکی تھی۔

وہیں جنگل ہے اب، پر اس سے آگے
چمن تھا گل تھے ہم تھے باغباں تھا
(واجد علی شاہ اختر)

بہت جلد آسیب اور ارواح کے قصے مشہور ہوگئے۔ ریڈ روز بھوتہا کہلانے لگا۔ اس کی پرائیوٹ روڈ پر سے راہگیروں نے گذرنا چھوڑ دیا۔

پولس نے چھولداری لگائی۔ بیش قیمت اشیا کی کھوج میں چور رات کے وقت دریائی جنگل سے نکلتے۔ ادھ جلے شاگرد پیشے کے مکین سہمے ہوئے لیٹے رہتے۔ دور سے گذرتا کوئی راہرو ٹارچ چمکاتے اُچکوں کو اگیا بیتال سمجھ کر چیخیں مارتا ہوا بھاگتا۔ پولس نے پھنکو پر بھی چوری کا شبہ کیا۔ وہ دھاڑیں مار مار کر

رویا اور اس الزام کے غم میں اسے بخار آ گیا۔ رمضانی علاء الدین اور عیدُو نے داڑھیاں بڑھالیں۔ دن بھر وہ احاطہ کی مسجد میں بیٹھے نمازیں پڑھتے۔ ننّھا کو نماز نہیں آتی تھی وہ بیٹھا بیٹھا کلمہ رٹا کرتا۔ کچھ عرصے تک وہ سب کچن گارڈن کی ترکاریوں پر گذارا کرتے رہے۔ امرائی کا بور جھلس چکا تھا۔ پھاٹک کے نزدیک شکرگوتی آم کے درختوں میں (جو بڑّو بیگم مرحومہ نے شاگرد پیشے کے بچّوں کے لیے مخصوص کردیے تھے) چند پھل آتے۔ سب نے روٹی سے لگا لگا کر ان سے پیٹ بھرا۔

یہ خبر ملتے ہی دِکی میاں نینی تال سے واپس آ گئے تھے۔

ایک شام تین کٹوری ہاؤس کی بیُوک پھاٹک پر آن کر رکی۔ کالی عینک، سولا ہیٹ لگائے بید ہاتھ میں لیے برآمد ہوتے۔

جُوں کی چال چلتے کھنڈر تک پہنچے۔ اوپر چڑھ کر چاروں طرف دیکھا گویا آخری انسان کرۂ ارض کے ملبے پر کھڑا ہو۔

ہاتھوں کا چونگا بنا کر سر پیچھے ڈالا اور زور سے چلّائے ——— اُو ہُو ——— اُو ہُو

جسطرح لڑکپن میں قنبر علی، نارائن بخش سنگھ، اور رگھبیر پرشاد سنگھ کے ساتھ شکار پر جاتے تھے تو جنگل میں بھٹک کر ایکدوسرے کو پکارتے تھے۔

——— قنبر ——— قنبر میاں ——— ارے بھئی کہاں غائب ہو گئے اچانک۔ عجیب بے تُکے آدمی ہو یار۔ جو کام کیا نرالا۔ ہماری کا دمبری کو بھی لے بھاگے۔

خدمتگار جو انکے ساتھ آیا تھا رمضانی سے بولا "بھیّا ٹھیک ہو چلے تھے۔ اب کے سے جو یہ دھکّا انکے دماغ کو لگا۔ پھر کھسک گئے۔"

جُھک جُھک کر بید کی نوک سے کچھ تلاش کرنے لگے۔

رمضانی دوڑے آئے۔ "سلام میاں۔ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟"

بھگوان دین لپکے ——— "سلام حجور۔"

"بن مالی! ورکش کنیا ———"

"حجور ——— ؟"

"چاندنی ———"

"حجور چاندنی کا بروا تو آپے آپ مرجھا گوا ——— بہُت جمانا ہوا۔"

اینٹوں کے ڈھیر سے اترے۔ ٹھوکر لگی۔ ملازم نے فوراً سنبھالا۔ گاڑی میں بیٹھ کر واپس گئے۔

حادثے کے چالیسویں دن تین کٹوری ہاؤس کی لموزین پھر وارد ہوئی۔ صفیہ سلطانہ اسمیں سے اتریں سُوں سُوں کرتی نُورن ان کے ساتھ تھی۔ وہ چاندنی کو یاد کرکے پھکو پھکو روئی۔ صفیہ سلطانہ چُپ کھڑی رہیں۔ مرحومین کی فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ پائنچے سنبھال کر ڈھیری پر سے اتریں۔

خانساماں رمضانی کی بی بی زیتون کو کہربا کی ہول دِلی راکھ میں پڑی ملی۔ صاف کرکے خود پہن لی کہ اللہ کا کلام اس پر منقش تھا۔

اب وہ سب تلاش روزگار میں نکل جاتے اور مایوس لوٹتے۔ رمضانی خوش قسمت تھے۔ انہیں دریا پار ایک انگلش اسٹائل ہوٹل میں کام مل گیا۔ باقی سب کو نحوست مارے سمجھ کر ہر دروازے سے واپس کیا گیا۔ وہ سب اپنی پوٹلیاں باندھ کر دوسرے شہروں کو نکل گئے۔

شاگرد پیشے میں بنجاروں نے پڑاؤ ڈالا۔

ندی میں بڑا زبردست سیلاب آیا۔ ریڈ روز کا ملبہ بہالے گیا۔ ساتھ ہی متوفین کی ہڈیاں بھی ندی میں پہنچ گئیں۔ بینڈک کے کزن پانی سے نکلے۔ پانی میں واپس گئے۔

باڑھ اترنے کے بعد مہیب مشینوں کے ذریعے شہر کے نشیبی علاقوں کو سُکھایا گیا۔ ریڈ روز کی آگ فائر بریگیڈ نے بجھائی تھی۔ شہر کا پانی مشینوں نے اُلیچا۔ مگر آگ اور پانی کے انجنوں کے باوجود آگ اور پانی موقع پاتے ہی اپنا اپنا کام کر جاتے ہیں۔

قرب وجوار کے دیہاتی باغ کے درخت کاٹ کاٹ کرلے گئے۔ شہتیر اور کڑیاں اٹھالیں۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ دبی ہوئی چیزیں اوپر آگئی تھیں۔ سنگی گلدان، ایک عدد گوشوارہ، برتن، قلم، کتابوں کی جلدیں۔

ہر سال گومتی کی باڑھ باقیماندہ ملبہ سمیٹ لیجاتی۔ رفتہ رفتہ زمین ہموار ہوگئی۔ سرسبز اور زرخیز۔ اس پر رنگ برنگے پھول اُگ آتے۔ پرانے بیج جو بھگوان دین نے بوئے تھے، نئے بیج جو چڑیاں چونچ میں لیکر جانے کہاں کہاں سے آتیں۔ جھاڑ جھنکاڑ خوب پھلا پھولا اور جھڑبیری گرّھل۔ رس بھری۔ جھاڑیوں میں بن مُرغیاں آبسیں۔ بیلا، گل عبّاس اور چاندنی کے پودے پھر لہلہا اُٹھے۔

اندھے کنویں کے چوگرد بھنگ دوبارہ پیدا ہوئی۔ اس کے آس پاس گورے ہپّی منڈلانے لگے۔ انہوں نے ادھ جلے کوارٹروں میں ڈیرے ڈالے۔ کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر بھنگ گھونٹتے۔ گانجے کے دم لگاتے۔ پیپل کے نیچے جاکر مہادیوجی کو پرنام کرتے۔ تنے سے ٹیک لگا کر گٹار بجاتے۔ ایک گوری بھنگیرن بھی بچہ گود میں اٹھائے وہاں آن پہنچی۔ وہ تن تنہا استنبول، کابل، کٹھمنڈو سے بہتی ہوئی یہاں آنکلی تھی۔

باؤلی کی ہری سطح پر آبی پودے پھیل گئے۔

”ہمارے جدّامجد——!“ ایک ہپّی نے منڈیر پر بیٹھی ہپّن کو ان پودوں کی طرف اشارہ کرکے اطلاع دی۔

وہ نم پتھر پر جمی ہری کائی پر ہاتھ پھیرتا۔ ”ہماری جدّہ!“

دوسرا ہپّی چلم میں کوئلہ بھر کر آنکھیں نیم وا کرتا: ”یہ کوئلہ پندرہ کروڑ برس پہلے فرن کا سو فیٹ اونچا درخت تھا۔ اس کا دم لگا کر میں وہی فرن بنتا ہوں۔“

پھر وہ زمین پر رینگتے کیڑوں کو مخاطب کرتا: ”ہلو کینچوے۔ ہائی مکڑی۔ ہلو بچھو۔ گڈ مارننگ چھپکلی۔ پندرہ کروڑ برس پہلے ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تو بڑی مصیبتوں میں پھنسے مگر تم اتنے وفادار کہ ہمیں یاد رکھتے ہو۔ قبریں ہمارا ساتھ دینے آجاتے ہو۔ ہے—— فریڈ—— دیکھو یہ قدیم کچھوا ندی سے نکل کر تم سے ملنے آیا ہے۔ ہلو کزن کچھوے۔ تمہارا دماغ اتنا چھوٹا رہ گیا۔ آرام سے ہو۔ ہمارا بڑا ہوگیا۔ ہم بڑی آفتوں میں پڑے۔“ وہ حلقہ باندھ کر چلم پیتے اور کہتے ہم اوّلیں اسپنج ہیں۔ ہم اوّلیں کائی ہیں۔

کندھوں پر بال بکھرے احساس سے عاری اسپنج کے ایسے چہرے والی ہپّن اپنے مریل بچے کو منڈیر پر بٹھا کر کنویں پر جھکی اپنی شکل ملاحظہ کرتی اُسنے جنگلی انجیر کے پتے توڑ کر ان کی اسکرٹ بنائی تھی۔

کوئی گورا خرابا تی کاہلی کے ساتھ بیر کُترتا رہتا۔

”چلو اب یہاں سے آگے چلیں۔“ ہپّن فرمائش کرتی۔

”ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ لاکھوں کروڑوں برس۔“ وہ آرام سے جواب دیتا۔

ان پوستیوں کے باپ مغرب کے ارب پتی تاجر تھے۔ ہپّن فرانس کے ایک دانشور کی بیٹی تھی۔

”آؤ اس کنویں میں چھلانگ لگائیں بم بھولا۔ بم بھولا۔“ ایک ہپّی نعرہ لگاتا۔

اس نے ہرن کی کھال اور گلے میں شیر کے ناخنوں کا تعویز پہن رکھا تھا۔ یہ بہی کافی عرصہ رشی کیش کے خودروحشیش زاروں میں گذار کر آرہے تھے۔ گھنٹوں خاموش بیٹھے رہتے۔ کچھ عرصے بعد پولس نے ان کو ہنکال دیا۔

اب وہ زمین ایک قسم کی کیمپنگ گراؤنڈ بن گئی۔ خانہ بدوش آتے اور گئے۔ چند روز کے لیے زنانوں کی ایک ٹولی نے خیمہ لگایا۔ سلوچنا کی موت کے بعد اس کا تبنہ بیٹا مدھوبالا ان کا چودھری تھا۔ ایک طویل القامت سفید بالوں والی مخبوط الحواس میم ان کے ساتھ تھی۔ پوچھنے پر وہ اپنا نام "جنت سے ٹوٹا ستارہ سفید الزمانی گلبچہ بیگم"، بتاتی تھی اور اپنی ٹولی کا پکانا رندھنا اس کے ذمّے تھا۔

اگلی برسات کے بعد ننھّا دھوبی کے بھانجے جُمّا نے وہاں ارہر کی کاشت شروع کردی۔ لاوارث زمین تھی۔ سات سال کے اندر کوئی دعویدار سامنے نہ آیا تو حکومت کی ملکیت ہوجائے گی۔

ایک روشن صبح کو چھ گردگوتوں کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا۔

چاروں طرف دیکھا دور شاگرد پیشہ کا کھنڈر نظر آیا۔ رکشا والا سائیکل سے اترا۔ ٹیلوں اور پگڈنڈیوں پر سے ہانپتے کانپتے گذر کر مسافروں کو وہاں پہنچایا۔ رکشا پر ایک بڑے میاں اور بڑی بی سوار تھے۔ ایک تیکھی مونچھوں لمبی زلفوں والے جوان رعنا پیچھے ہڈ کی جگہ ٹنگے ہوئے تھے اسباب سامنے رکھا تھا۔

کوارٹر کے برآمدے میں ایک مریل کتّا بیخبر سو رہا تھا۔ جاگ اٹھا اور زور زور سے بھونکنے لگا کہ اس نے اپنے تئیں اس ویرانے کا محافظ مقرّر کر رکھا تھا۔

چنبیلی بیگم رکشا سے اتریں۔ زمین پر دھم سے بیٹھ کر اونچی آواز میں بین کرنے لگیں۔ فریاد ہے مولاؑ ——— فریاد ہے مولاؑ۔

اری چُپ ہو جا نیک بخت۔ استاد موگرے نے نحیف آواز میں ڈانٹا۔ آنسو پوچھ کر چنبیلی بیگم نے بیٹے سے کہا۔ بازار سے بتاشے لے آؤ۔ سرکنڈے چُن کر جھاڑو بنائی۔ برآمدے کا فرش خوب اچھّی طرح جھاڑا۔ بسترا کھول کر دری بچھائی۔ گلاب کی واپسی پر بیٹھ کر مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد تینوں کھڑے ہوگئے۔ نوحہ خوانی کی۔ بن بن روتے کاگنی جل جل روئے ماچھلی — مورا شیام کہاں چھپا یو مورا حسینؑ — درُود وسلام فاتحہ پڑھی۔ پھر بیٹھ گئے۔ بیٹی داماد کے ایصالِ ثواب کی مجلس کرلی — "بہت پرانا نوحہ نکالا!" ماسٹر جی نے بیڑی سُلگائی۔

"سکندر دھاڑن کی ماں پڑھا کرتی تھیں۔ کنکر کے کنوئیں والی۔ بیلا کو بھی سکھلایا تھا۔" چنبیلی بیگم نے چھوٹی سی بوری کھولی۔ سنسنانے والا اسٹوو اور برتن بھانڈے نکالے بازار سے دال چاول منگوائے۔ کھانا پکا۔ کڑک چاء بنائی گئی۔ وہ تینوں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے پھر سو گئے۔

جُمّا دھوبی ہل بیل لیے پہنچا۔ ان لوگوں کو بوڑھے سمجھ کر توجہ نہ دی۔

گلاب کی آنکھ کھلی۔ جُمّا پر نظر پڑی۔ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تہمد پر چرمی پیٹی باندھ رکھی تھی۔ اسمیں رامپوری چاقو پوشیدہ تھا۔ اینڈتے ہوئے قریب پہنچے ——— فلمی غنڈوں کے انداز میں پیچھے سے جاکر کندھا دبوچا۔ ڈپٹ کر دریافت کیا۔ "اے۔ یہاں کس کی اجازت سے کھیتی کرتے ہو؟"

"اللہ میاں کی اجازت سے ——" جُمّا نے ہنس کر جواب دیا۔ "آپ کون ہیں؟"

"اس زمین کے مالک ——"

"جمین کے مالک تو اللہ میاں ہیں"۔ بیل کو چابک مار کر ہل آگے بڑھایا۔

سوموار کا دن تھا۔ پیپل کے نیچے دیہاتی عورتیں جمع تھیں۔ وہاں اب منشی بھوانی شنکر سوختہ کے مہادیو جی کے گرد دیوار اٹھا کر مُنّا سا مندر بنایا جا چکا تھا۔

نمازِ عصر کے لیے آس پاس کے گھوسی مسجد میں گئے۔ جُمّا پگڑی لپیٹتے ادھر لپکے۔ موگرا گلاب بھی سروں پر ٹوپیاں جماکر جا پہنچے صف میں کھڑے ہوکر نیت باندھی۔ ہاتھ کُھلے چھوڑ دیے۔

ایک مُلّاجی جو وہاں امامت کرنے لگے تھے نماز کے بعد کھنکار کر اعلان کرنے والی آواز میں پکارے "برائے مہربانی شیعہ حضرات اپنی مسجد میں تشریف لے جائیں" گھوسیوں نے نووارد باپ بیٹے کو غور سے دیکھا۔ جُمّا نے بتلایا۔ "امی کہت ہیں اس کمپاؤنڈ کے مالک ہوں۔"

سب نے قہقہہ لگایا۔ یہاں پر چند زنخوں کے ساتھ گاتی بجاتی ایک دیوانی میم بھی تو آئی تھی جو خود کو کسی لارڈ کی بیٹی بتلاتی تھی۔ اور وہ عجیب الخلقت گورے ہپی۔ بھانت بھانت کے لوگ یہاں پہنچ کر ڈیرا ڈالتے تھے۔ یہ دو پاگل اور آن پہنچے۔ چلے جائیں گے۔ کسی نے اس کنبے سے باز پرس نہ کی۔

چاندنی راتوں میں وہ تینوں احاطے کی ڈھیریوں پر جا بیٹھتے۔ موگرا اور چنبیلی چمٹے سے مٹی کھودتے رہتے۔ شاید بیلا کی کوئی نشانی پڑی مل جائے۔ انگلیوں میں کینچوے لپٹ جاتے۔

الحمدو نے یہ منظر خواب میں دیکھا تھا۔

گلاب کہتے ہم کو یقین ہے بیرسٹر اظہر علی نے اپنے باپ دادا کا خزانہ بھی یہیں دفن کر رکھا ہوگا۔ کوٹھی نیو تک کُھدے تب معلوم ہو۔

ایک روز بولے "یہ سالے ہمیں یہاں نماز نہیں پڑھنے دیتے۔ حالانکہ یہ مسجد بھی ہماری ملکیت ہے۔"

"ارے چپتے بیٹھے رہو۔" چنبیلی بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"کب تلک؟ ناواں ختم ہو رہا ہے کھائیں گے کہاں سے؟ دعویٰ تو کرنا ہی ہے۔ لکھا پڑھی ہو جائے تو یہ زمین آدھی بیچ کر اس کی قیمت سے ایک

ہزار گز پر کوٹھی بنائیں۔ باقی روپئے سے بیچر شروع کریں۔ جُمّا کہہ رہا تھا اس زمین کی قیمت اب دس لاکھ ہے۔"

دوسرے دن جمعہ تھا۔ گھوسی جمع ہوئے گلاب بّراتے ہوتے پہنچے۔ قبلے کی محراب کے نیچے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ "بھائیو۔ ریڈ روز کمپاؤنڈ کے قانونی وارث ہم لوگ ہیں۔ یہ نجی مسجد بھی ہماری جائداد میں شامل ہے۔ ہم تو یہیں عبادت کریں گے۔ آپ اہلِسنّت حضرات البتّہ کہیں اور جا سکتے ہیں۔"

مُلّاجی ہنس پڑے۔ گھوسی تو بیحد محظوظ ہوئے۔ گلاب ان کو گھورا کیے۔ جُمّا نے نرمی سے کہا۔ "جاؤ میاں۔ ٹنٹا نہ کھڑا کرو یہاں شیعہ سُنّی جھگڑوں سے ویسن آفت مچی رہت ہے۔ جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ—"

— خاموشی سے باہر آگئے۔ کوارٹر میں آکر باپ کو مخاطب کیا۔ "ابا وہ کاغذ نکالیے جو بیلا نے بھیجا تھا۔ ابھی سالوں کا دماغ درست کرتا ہوں۔ کل ہی کورٹ فیس پوچھ کر آتا ہوں—"

"کورٹ کچہری کی کیا بات، ہے بھائی۔" جُمّا مسجد سے آگئے تھے۔ انہوں نے کان کھڑے کیے۔ اب استاد موگرا نے اپنا تعارف کرایا۔

"ارے باپ رے۔ تو اتنے برسوں تم لوگ سوتے رہے؟"

"خبر سُنکر ہم دونوں کھاٹ سے لگ گئے تھے۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی۔ ہسپتال اور گھر۔ ہسپتال اور گھر اور انہی دنوں — انہی دنوں — گلاب میاں اپنے کام کے سلسلے میں باہر چلے گئے۔ ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا کہ وکیل کرتے —"

"یہ کیا کام کرتے ہیں؟"

"بزنس —"

گلاب بمبئی کے ایک چھوٹے اسمگلر کے گُرگے بن گئے تھے۔ اس سلسلے میں چھ سال کی جیل کاٹ کر ابھی باہر آئے تھے۔

جُماتیوری پر بل ڈال کر کے بیڑی پھونکنے لگے۔ عدالت نے زمین ان لوگن کا دیدی تو فری کھیتی باڑی بھی گئی۔ خیر جو اللہ کو منظور۔" جب آپ لوگ یہاں کوٹھی بنوا کر رہیے تو کپڑے ہم ہی سے دھلوایئے گا۔ ہمارے چچا نتھا نے تو برسوں یہاں کام کیا۔ اب وہ جدّہ چلے گئے۔ اب وہ دھوتے ہیں عربوں کے جُبّے۔"

دوسرے روز صبح سویرے پریزادہ گلاب نے اپنی بہترین بُش شرٹ اور پتلون ڈانٹ کر زلفیں سنواریں۔ مرحومہ بہن کا بھیجا ہوا باغ کا ہبہ نامہ پلاسٹک کے تھیلے میں رکھا اور روشن الدولہ کی کچہری روانہ ہوئے۔

"ابا یہ تو بہت لفڑا ہے۔ پھاٹک ہی پر ایک لکھنوٴ چھیلا ٹکرا گئے۔ بادشاہ جانی!
—— میں بولا غلام کو شہزادہ جانی کہتے ہیں۔ بہت خوش ہوتے کہنے لگے۔ ایک وکیلن کر لیجیے۔ نئی نئی پریکٹس شروع کی ہے۔ بہت قابل ہیں۔ فارن میں پڑھ کر آئی ہیں۔ راجہ صاحب تین کوڑی کی نواسی۔ بڑی بٹیا زرینہ سلطان کی صاحبزادی ہیں بولا۔ بادشاہ جانی بھائی کیا ہے کہ عورت ذات ناقص العقل ہے یہ مردوں کے کام ہیں۔ کوئی اچھا وکیل بتایئے۔ میں نے ان کو پورا کیس سمجھایا۔
"انہوں نے ایک صاحب سے ملوایا۔ وہ بھی بانکے نوجوان نکلے۔ جوں ہی بادشاہ جانی نے ریڈ روز کا نام لیا بولے شیخ صاحب اور ان کے والدین کسے یاد نہیں۔ قنبر علی کی زندگی ہی میں لوگوں کو ان سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ کیونکہ عام طور پر یہ مشہور تھا کہ انہوں نے اس ٹریجڈی سے ایک ڈیڑھ سال قبل بمبئی کی ایک معمولی گمنام ایکٹرس کو گھر ڈال لیا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اسے بہت چھپا کر رکھا تھا۔ کسی سے ملواتے ہی نہیں تھے۔ باپ بیٹی ماسٹر تھے۔ بھائی بمبئی میں دادا گیری کرتے تھے۔ بڑی لڑاکا تھیں۔ "انگارے" تکیہ کلام تھا۔ کسی بگڑے دل

نے یہ بھی کہا کہ اسی نے تیلی دکھائی ہوگی جو سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ اس خاندان کا نام و نشان مٹ گیا۔ غرض یہ کہ صاحب جتنے منہ اتنی باتیں۔ خیر آپ فرمایئے۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ جب یہ سانحہ ہوا ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے آج بھی جب سوچتے ہیں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بد عورت سے خدا بچائے۔
"بادشاہ جانی جھینپ کر بولے۔ وکیل صاحب یہ بیگم قنبر علی مرحومہ کے بھائی ہیں۔ وکیل صاحب پسینہ پسینہ ہو گئے۔ بولے معاف کیجیے گا۔ ہم تو محض سُنی سنائی دہرا رہے تھے۔ اب آپ کا فرض ہے کہ ان افواہوں کی تردید کریں۔ بادشاہ جانی بولے۔ شیخ قنبر علی نے بیوی کے نام کوٹھی مہروں میں لکھدی تھی فروٹ گارڈن ہبہ کر دیا تھا۔ آپ دونوں چیزیں عدالت سے ان کو دلوا دیجیے۔ افواہوں کی تردید خود بخود ہو جائے گی۔
"بولے ایک مسئلہ اور ہے جائداد کے دعویداروں کی اطلاع کے لیے قانونی نوٹس اخباروں میں نکلے تھے اس وقت آپ کہاں تھے؟
"ابا میں بولتا اس وقت تو بوبے پولس نے مجھے تڑی پار کر رکھا تھا؟
"پھر بولے اب آپ اتنے برسوں بعد نمودار ہوتے ابتک کہاں رہے؟
"کیا بولتا جیل میں رہا؟ گارڈن کا اشٹام پیپر نکالا۔ بولے گفٹ ٹیکس ادا کیا گیا تھا؟ آپکی ہمشیرہ فصل کی آمدنی خود اپنے ذاتی اکاوٴنٹ میں ڈالتی تھیں؟ میں بولا صاحب یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ اشٹام پیپر دیکھ کر بولے ارے اس کی تو رجسٹری ہی نہیں ہوئی۔ اب نکاح نامہ لایئے۔
"بادشاہ جانی بولے۔ وکیل صاحب ریڈ روز میں کاغذ پتر کا ایک ایک پُرزہ راکھ ہو گیا۔ وہ بولے آپ قاضی شہر کے دفتر میں جایئے۔ ان کے ہاں اوریجنل موجود ہو گا رجسٹری بھی ہوئی ہوگی۔ معلوم کیجیے۔ پھر وہی بات پوچھی آپ اتنے عرصے کہاں غائب تھے۔ میں بولا کیا ہے کہ پکچروں کی شوٹنگ کے سلسلے میں برابر ادھر اُدھر جاتا رہا۔ ٹائم نہیں ملا۔

"پلپچروں کا نام سنتے ہی وکیل صاحب کھِل اٹھے بولے آپ ایکٹر ہیں؟ میں بولا اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔ مگر وکیل صاحب، میں بولا، آجکل ذرا کڑکی چل رہی ہے آپ کی فیس کتنی ہے؟

"بولے ہم تو کالج کے زمانے میں بہت ڈرامے وغیرہ کرتے تھے —

پھر فلموں کی بات چھِڑی چاء منگوائی۔ رویہ ہی بدل گیا۔ بولے ہم بمبئی آ دیں تو آپ سادھنا اور سائرہ بانو سے ملوا دیں گے؟

"میں بولا وکیل صاحب آپ یہ جائداد ہمیں دلوا دیجئے تو ہم فوراً اپنی پکچر شروع کرکے آپ کو اسمیں ایک دھانسو رول بھی دیدیں گے۔ بالکل جیسے افتخار اور رحمٰن وکیل بنتے ہیں عدالت کا سین ڈال دیں گے۔

"بولے وکیل ہی کیوں ہم تو اپنے کالج کے ناٹکوں میں ہمیشہ ہیرو بنتے تھے۔ بولے۔ غرضیکہ ابا وکیل صاحب سے یارانہ ہوگیا۔ ہم نے بادشاہ جانی سے بھی وعدہ کرلیا ان کو پکچر میں رول دیں گے۔ یہ کسی مفلس وثیقہ دار کے صاحبزادے ہیں۔ قطع اور شکل صورت سے بس اپنے مرحوم پرنس گلفام کو چھپا دا نہیں نکالو۔ عمر ڈھل گئی ہے ورنہ انہی کو ہیرو بنا لیتے وکیل صاحب بولے آپ اگر فیس نہیں دے پائیں گے تو ہم آپ سے شرح طے کریں گے۔ جائداد آپ کو مل جائے تو اسمیں سے اتنا حصہ ہمارا۔"

چنبیلی بیگم دری پر لیٹی سو رہی تھیں۔ باتوں کی آواز پر جاگیں۔ کروٹ بدل کر کنمنائیں۔ کیسے بجس بےرحم باپ اور بھائی تھے۔ بیٹی کی جلی ہوئی ہڈیوں پر بیٹھے پھر سے خیالی پلاؤ پکا رہے تھے۔ انہوں نے ملگجی ساری کا آنچل چہرے پر ڈال کر آنکھیں بند کرلیں۔

---

⑥ کجلی بَن

شمالی ہند میں فلمسازی کے نئے دور کا آغاز
جن شائقین کو آئیڈیل فلم کمپنی لکھنؤ کی آدرش مہیلا
نذرانہ، رشید دلہن اور بسمل کی آرزو کی تیاریوں
کا زمانہ اور رِلوچنا، تارا، اختری بائی اور شہناز گل کا
رومان پرور عہد یاد ہے ان کے لیے نئی اندر سبھا کا مژدہ!
صنوبر پکچرز کا اوّلین شاہکار

گلزارِ محبت

جس کا اعلان چند سال قبل کیا گیا تھا مگر بوجوہ ملتوی
ہوئی۔ نئی ہیروئن۔ سحر آفریں موسیقی۔
ڈائریکٹر: پریزادہ گلاب
پروڈیوسر: ماسٹر آئی۔ بی موگرے
آف ریڈ روز گارڈن ایسٹیٹ۔ لکھنؤ۔

مسٹر ٹی۔ اے شیخ نے کلکتے کے ایک اردو اخبار کا تراشہ جیب سے نکال کر دوبارہ پڑھا۔ وہ گولف کھیلنے کے بعد ٹالی گنج کلب کی ٹیپو سلطان بار میں واپس آچکے تھے اور متفکر و متحیر نظر آتے تھے۔ یہ روزنامہ وہ صبح گھر سے

چلتے وقت ساتھ لیتے آتے تھے تاکہ کلب پہنچ کر اطمنان سے قانونی کارروائی کے متعلق سوچیں۔ دوآرز کا ایک ٹی پلانٹر شناسا شیئنس چکرورتی انکے پاس آن بیٹھا۔
"آج کی صبح ہم مع اپنے ہاتھیوں کے بخریت ہیں؟"

شیخ طاہر علی ایک زمانے میں سروش تخلص کرتے تھے جواب ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ کلکتے کے اردو داں حلقے میں شیخ سروش فیل فروش کہلاتے تھے — پہلے آسام میں کھیدا کرواتے تھے اب دوآرز میں چار، اور ٹمبر کا کام پھیلا رکھا تھا — انکی بیوی نوانن بیگم جل پائی گوڑی کے ایک زمیندار کی دختر نیک اختر تھیں۔ میکے کے قرب کی وجہ سے زیادہ تر دارجلنگ میں رہتی تھیں۔ طاہر علی کے چھوٹے بھائی منظر علی مشرقی پاکستان جا چکے تھے جہاں ہاتھیوں اور ٹھیکوں کا خاندانی کاروبار انہوں نے چاٹگام اور سلہٹ میں جما لیا تھا۔ سال میں ایک دو بار بھائی سے ملنے مغربی بنگال کا چکر لگا جاتے تھے اور چاٹگام اور ڈھاکہ کی فیشن ایبل سوسائیٹی کے ایک مقبول فرد تھے۔

شیخ صاحب کا ایک خوبصورت بنگلہ دارجلنگ میں تھا۔ ایک بینا گوڑی میں۔ نیو علی پور کلکتہ میں نئی کوٹھی بنوا رکھی تھی کلکتہ اور دارجلنگ کی نمایاں شخصیتوں میں انکا شمار کیا جاتا تھا۔ اکثر روٹری اور لائنز کی طرف سے منعقد ہونے والے فیشن ایبل فلاحی مشاعروں کی صدارت بھی کرتے۔ براؤن صاحبوں والی باضابطہ زندگی گذارتے۔ شروع سے جنگلات سے واسطہ رہا اسوجہ سے آوٹ ڈور لائف کے شوقین تھے۔ کسی زمانے میں میسور کے ایک مہاوت شیخ صابو نے ہاتھی دوڑا کر نام پیدا کیا تھا۔ جوانی میں طاہر علی بھی ہاتھیوں کی نسبت سے کلب میں ایلیفنٹ بوائے پکارے گئے۔ اب انکی کمسن لڑکی لیلٰے دارجلنگ کے اسکول میں ایلیفنٹ گرل کہلاتی تھی۔

"ڈیری اسٹرینج —" انہوں نے اخبار میز پر رکھ کر عینک اتاری۔ "ہم یہاں کجلی بن میں بیٹھے رہے۔ پرواہ نہ کی اور بمبئی کے کسی جعلساز نے ہمارے بے چارے کزن قنبر علی کی جائداد ہتھیالی۔"
"ارے۔"
"عجیب معاملہ ہے ہمیں خبر بھی نہیں وہاں کیا سے کیا ہو گیا۔"
"ہر جگہ کیا سے کیا ہو رہا ہے۔"

"ہمارے ایک اظہر علی چچا تھے —" بات شروع کرتے کرتے شیخ صاحب نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ خواتین حضرات گولف کے میدان سے واپس آرہے تھے۔ ایک بار وہ لکھنؤ گئے تھے تو اظہر علی چچا انکو اپنے ساتھ دلکشا کلب لے گئے تھے وہاں بھی عین بین اسی قسم کے لوگ دکھلائی دیے تھے یہی مجمع۔ جب سے ابتک اس کولونیل ماحول میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا تھا۔ "شیخ اظہر علی۔ بیرسٹر۔ ہمارے والد کے فرسٹ کزن۔ انکے دونوں بھائی تقسیم کے فوراً بعد ہجرت کر گئے ایک اپنی جائیداد فروخت کر کے روانہ ہوئے دوسرے نے سنا تھا وہاں پہنچ کر صوبہ سندھ میں زمین الاٹ کروائی پھر معلوم ہوا بڑی چچی، اظہر علی کی بیگم — انکے بھائی بھی پاکستان چلے گئے۔ یہاں ہندوستان میں بے چارے قنبر علی کا کوئی سگا رشتے دار موجود نہ رہا۔"
"قنبر علی کون —؟" ٹی پلانٹر چکرورتی نے پوچھا۔
"وہی اظہر چچا کے صاحبزادے ہم ان لوگوں سے برسوں سے نہیں ملے۔ نہ خط و کتابت۔ ہمارے والد زمانہ ہوا کلکتہ آن بسے تھے۔ پھر وہ جو بڑی بھاری آگ لگی —"
"یس۔ ڈریڈفل۔ میں نے بھی اخبار میں پڑھا تھا" ٹی پلانٹر نے کہا۔
"ہم تو اسٹیمر میں جا رہے تھے ریڈیو پر سنا۔ سناٹے میں آگئے۔ تعزیت کا خط کسکو لکھتے۔ اس خبر ہی سے معلوم ہوا کہ بیوی بھی جل کر مر گئیں ہم کو تو یہ بھی پتہ نہ تھا

کہ قنبر نے شادی کرلی تھی وہ کچھ لوہمین سے آدمی تھے۔ ریڈیو کی خبریں بچوں کا کوئی ذکر نہ تھا"

"ممکن ورثاء کی اطلاع کے لئے اخباروں میں سرکاری نوٹس تو چھپا ہوگا۔" ڈی پلانٹر چکرورتی نے کہا۔

"یوپی کے اخبار آسام اور بنگال کے جنگلوں میں کہاں پہنچتے ہیں بھئی اور اب قنبر مرحوم کی جلی ہوئی زمین پر صنوبر فلم کمپنی کیسے بن گئی؟ ماسٹر موگرا اور پریزادہ گلاب ——چہ خوب!"

کلب سے گھر پہنچتے ہی مسٹر سروش نے اپنے قانونی مشیر کو ٹیلی فون کیا۔ استاد موگرا اینڈ کمپنی اور انکے وراثت کے دعوے کے متعلق مکمل جانکاری انہیں چند روز میں لکھنؤ سے موصول ہوگئی۔ شیخ فیل فروش کلکتہ سے روانہ ہوئے۔ انکے ایڈووکیٹ نے لکھنؤ کی عدالت میں شیخ قنبر علی مرحوم کے یک جدی عزیز کی حیثیت سے بطور ثبوت انکا شجرہ نسب پیش کیا۔ متعدد معتمدین شہر نے اس دعوے کی تصدیق کی۔

مقدمے نے طول کھینچا۔ استاد موگرا کے پیش کردہ ہبہ نامہ کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ قمر علی بجائے قنبر علی نام ہی غلط تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اپنی خفقانی اور سرسام زدہ بیوی کا دل رکھنے کے لیے انہوں نے اسٹامپ پیپر بنوا کر جعلی دستخط کردیے تھے۔ اور یہ جعلی نکاح نامہ چنسٹ کے مولوی صاحب نے قاضی شہر تک نہیں پہنچایا تھا۔ گاؤں کھیڑے کے لوگ نکاح رجسٹر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اسکے بعد مولوی صاحب بے چارے بھی رحلت کرگئے۔ بوڑھے آدمی تھے۔

نکاح نامے کی دو نقلیں جو راجہ رگھبیر پرشاد خود آن کر الحمدو کو دے گئے تھے وہ

بھولاناتھ چور نے پھاڑ کر پھینکدیں نانپارہ کے چاء خانے میں الحمدو کو ہوش آیا تو حاجی کلو خود انہیں امام گنج پہنچا کر آئے۔ چند ماہ بعد وہ بھی چل بسیں۔

نکاح نامہ تو یوں غتر بود ہوا اب مستند گواہوں کی فراہمی۔

"کیا ہے ابا۔ ایسا لگتا ہے آدھے گواہ تو سالے لڑھک گئے باقی غائب غلا۔ سالوں کے پاؤں میں بلی بندھی ہے دیس دیس گھوم رہے ہیں"۔ پریزادہ گلاب اپنے باپ سے کہتے۔ سال بھر اس سرونٹ کوارٹر میں لشٹم پشٹم گذار کر یہ کنبہ بمبئی ناگپاڑہ کی چال میں لوٹ آیا تھا لیکن اس اُمید پر کہ جائداد مل جائے گی فلم کمپنی بنے گی ایمیں وہ اداکاری کے جوہر دکھائیں گے وکیل صاحب بڑی تندہی سے مقدمہ لڑے جارہے تھے۔ بادشاہ جانی گواہوں کی تلاش میں جٹے ہوتے تھے۔ ریڈ روز کا سارا اڈیٹوریل اسٹاف کب کا تتر بتر ہوچکا۔ گاؤں والے مولوی صاحب مرگئے روپا دھری مرگئی۔ کالے خاں اکرام احمد اشفاق علی لاپتہ۔ جواں سال راجہ رگھبیر پرشاد سنگھ ہارٹ کا آپریشن کروانے امریکہ گئے وہیں پران تج دیے۔ بڑی چھوٹے لال بھی کافور ہیں۔ مع خاندان کینیڈا جابسیں۔ گورے سے شادی کرلی تو نام بھی بدل گیا۔ اب سات سمندر پار ان کو کون تلاش کرے۔

عام طور پر مشہور یہی تھا کہ قنبر علی نے بیلا رانی سے باضابطہ شادی نہیں کی تھی۔ تین کٹوری ہاؤس والوں نے مکمل لاعلمی ظاہر کی وہ واقعی نہیں جانتے تھے نہ اس جھنجھٹ میں پڑنا چاہتے تھے انکے منیجر کالی چرن رستوگی زندہ تھے مگر جس مشتبہ انداز میں برقعہ اوڑھے رات کے بارہ بجے بیلا ہوٹل تین کٹوری نینی تال پہنچی تھیں قطعی بیاہتا نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

مقدمہ سولہ سترہ سال تک چلا۔ موگرا چنبیلی اور گلاب کی حالت بدسے

بدتر ہو گئی۔ بار بار انکو پیشی کے لئے لکھنؤ جانا پڑتا۔ بہار صاحب انکی مالی امداد کرتے رہے ــــ ہٹ سونگ رائیٹر بن چکے تھے اور مقبول مترنم شاعر ـــ

"وہ گنپتی سیٹھ نے ہم لنگڑے ہاتھیوں کا بھی کھیدا کر ڈالا۔ جانی بھائی تمہاری عدالتیں بھی تو جنگل بن ہیں۔ جادو کی جنگل آدمی پھنسے تو نکل نہ پاتے۔" گلاب نے بادشاہ جانی سے فریاد کی جو انہیں خدا حافظ کہنے گلاب باڑی آتے تھے۔

سابق ریڈ روز حالیہ گلاب باڑی پریزادے کی کارلٹن تھی وہ کورٹ کی پیشی کے لیے جب بمبئی سے آتے وہیں سر و تے نواڑی کی جھونپڑی میں قیام کرتے۔ بستی والوں سے وعدہ کر چکے تھے کہ کیس جیتنے کے بعد زمین ان سے خالی نہ کروائیں گے۔ (وہ کمپاؤنڈ کے کنارے کنارے ہی تو آباد تھے) بلکہ اپنی پکچر میں انکو کام بھی دینگے اور چند ایک کو روزگار دلوانے بمبئی بھی لے جائیں گے۔ لہٰذا پریزادہ یہاں خاصے مقبول تھے۔ نو عمر مُلّاجی سے بھی انکی دوستی ہو چکی تھی جنکے والد مرحوم سے اٹھارہ برس قبل پہلے روز بسلسلہ اعتقادات اہل تسنن و اہل تشیع انکا جھگڑا ہوا تھا ـــ وہ مُلّاجی خود بخود یہاں امامت کرنے لگے تھے۔ پہلے مسجد میں رہے پھر ایک حجرہ تعمیر کر لیا۔ انکی دیکھا دیکھی دودھ والے، رکشا والے، مزدور، ٹھیلے والے وہاں آن بسے۔

مُلّاجی فیض آباد سے آتے تھے۔ مقبرہ بہو بیگم صاحبہ والدہ نواب آصف الدولہ وزیر ہند کا علاقہ گلاب باڑی کہلاتا تھا۔ بستی کو اسی نام سے پکارا ــــ اب تو ڈاکیہ بھی گلاب باڑی کے پتے پر خط لانے لگا تھا۔ وسطی میدان میں گائیں چرتیں۔ بچے پتنگ اڑاتے دھوبی کپڑے پھیلاتے کبھی رات کو میلاد شریف ہوتا۔ کبھی پیپل کے نیچے ستیہ نرائن کی کتھا۔ بیشتر سلمز کی طرح یہ ایک مخلوط آبادی والی بستی تھی۔

گلاب کی ماہم جھونپڑ پٹی سے مختلف نہ تھی۔ وہ یہاں بہت ایٹ ہوم رہتے تھے۔

بہار صاحب نے پالی ہل پر فلیٹ خرید لیا تھا۔ اہلیہ بڑے ایکٹروں کی بیویوں کی طرح گھر پہ کٹی پارٹیاں کرتی تھیں بچے پنچ گنی میں پڑھتے تھے۔ بہار صاحب فلم پریمیر کے مواقع پر چمکیلے سوٹ پہنتے۔ انکی سالگرہ منائی جاتی تھی جسکے متعلق اردو کے فلمی رسالوں میں انکا خط چھپتا تھا: "لاکھوں پروانوں کی دعاؤں کا شکریہ۔ اس مرتبہ جنم دن گھر پہ ہی چند دوستوں کی موجودگی میں سادگی سے منایا۔"
موصوف بشرط فرصت اپنے پرانے بدنصیب دوستوں کے کام آنے کی کوشش کرتے ـــ گلاب بدنام اور ناخواندہ تھے اور جیل کاٹ چکے تھے ورنہ بہار صاحب انکو اپنے اسٹاف میں شامل کر لیتے۔ خود بہار صاحب بطور گواہ پیش کیے جا سکتے تھے کیونکہ اس شام چنبہٹ کی کوٹھی میں موجود تھے مگر اس وقت ان کو بھی علم نہ تھا کہ بالائی منزل پر بیلا شادی رچا رہی ہیں وہ بڑے دیندار آدمی تھے جھوٹی قسم نہ کھا سکتے تھے اب صرف ایک شخص رہ گیا تھا چکوترا گڑھوالی جو اس شام کسی بہانے رُوپا مہری کے پیچھے پیچھے اوپر چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں عقد ہوتے بچشم خود دیکھا یا نہیں اس کا اس نے کبھی ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ دوسرے روز ہی اپنے گھر والوں سے ملنے گڑھوال روانہ ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ سال بعد آتشزدگی کی خبر سُن کر وہ بیلا کے ماں باپ کے پاس تعزیت کے لیے ناگپاڑہ آیا۔ دیوار کے سہارے چپ چاپ بیٹھا رہا ـــ پھر اٹھ کر ان دونوں کے پاؤں چھوئے تھے اور نمسکار کر کے نیچے اتر گیا تھا۔ تب سے وہ بھی لاپتہ تھا۔

---

۷ ماؤنٹین گوڈ

حضرت بہارؔ پھولپوری کہ زیادہ تر فارن مشاعرہ سرکٹ پر رہتے تھے، اس مرتبہ تقریباً ڈیڑھ سال بعد وطن لوٹے۔ بمبئی پہنچنے کے دوسرے روز ہی استاد موگرا سے ملنے ناگپاڑہ گئے۔ کار چال کے نیچے رکی۔ مضطرب و مسرور اور ماسٹرجی کو ایک خوشخبری سنانے کے لیے بیتاب۔ پہلے انہوں نے استاد کو مغل کے ہوٹل میں جھانکا۔ لدھڑ ایرانی کا بیٹا اب کاؤنٹر پر بیٹھتا تھا۔ دیوار پر شہنشاہ محمّد رضا پہلوی آریہ مہر کے پورٹریٹ کی جگہ اب عرصے سے آیت اللہ روح اللہ خمینی کی رنگین تصویر آویزاں تھی یہودی کب کے غایب ہو چکے محلّہ اسیطرح آباد اور پر رونق تھا۔ بہار صاحب چال کے دروازے پر پہنچے جو اب اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ لگتا تھا اگلی برسات میں بیٹھ جائے گی بہار صاحب پہلے موگرا خاندان سے ملنے کے لیے بس یا لوکل ٹرین کے ذریعے آتے تھے۔ اب نت نئی کاروں پر۔ انہوں نے بھی استاد موگرا کے مانند بہت پاپڑ بیلے۔ تب جا کر کامیابی ملی۔ اپنی لائن یعنی موسیقی میں استاد بھی ماہرِ فن تھے۔ مگر مسلسل جدّوجہد کے باوجود پیٹی ماسٹر ہی رہے۔ انکو حنہ یہودن یاد آتی تھی جو اسی چال کے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی سوء الحظ سوء الحظ رٹا کرتی تھی۔ بیڈ لک۔ جندگی میں کسی کا بیڈ لک ہے کسی کا گڈ لک۔ بمبئی میں ایک لطیفہ مشہور تھا۔ مفلوک الحال پارسی چوپاٹی پر سمندر میں ناریل اور پھول بہا کر خدا سے فریاد کرتے ہیں پروردگار! تو نے ٹاٹا کو اتنا دیا مجھے کچھ نہیں۔ حنہ بائی بھی اللہ میاں کو سرڈیوڈ سسون کا حوالہ دیا کرتی تھیں۔

لیکن موگرا کی لڑکی تو اتنے امیر آدمی کی بیگم بن گئی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ ڈیم بیڈ لک۔

بہار صاحب قدیم زینے کی سیڑھیاں چڑھتے پانچویں مالے پر پہنچے۔ طویل برآمدے میں کچر بچر بچے کھیل رہے تھے۔ الگنیوں پر کپڑے ٹنگے تھے۔ عورتیں چاول بین رہی تھیں۔ تتا کی جاریک سُوئی ایسی آواز ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی کنستروں اور ڈالڈا کے ٹینوں میں پھول پودے لہلہا رہے تھے۔ نیچے اندھی باؤلی میں پڑا کوڑا ایک ٹیلے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

بہار پھولپوری موگرا کی کھولی پر پہنچے۔ پیازی رنگ کے لمبے فراک اور جارجٹ کے دوپٹے میں ملبوس ایک گوری چٹی کچھی میمن عورت برآمد ہوئی۔ اندر فریجڈیر رکھا تھا۔ ٹیلی ویژن سیٹ۔ فرش پر پھولدار لینولیم بچھا تھا۔

"موگرا بھائی؟ ماہم گیا۔ سال بھر پچھو۔"

"آپ نے انکو پگڑی دے کر یہ کمرہ لیا؟"

"پگڑی تو۔ سمجھے۔"

"سمجھے" بمبئی کے محاورے میں ایک بحرِ معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔

"بولو بھائی کیا بات؟" سیٹھ نمودار ہوا۔ "اوہو۔ بہار صاحب اسلام علیکم۔" مشہور آدمی تھے۔ برابر ٹیلی ویژن پر آیا کرتے تھے۔ سب انکو پہچانتے تھے۔

"ہاں ہم نے بروبر انکو پگڑی دیا۔ وہ ان کا مُلک میں کیس چالو ہے — اس میں لگ گیا۔ باقی انکا موالی چھوکرا اڑا دیا۔ انہوں نے ماہم میں ایک جھگّی خریدا۔ گلاب بھائی ادھر آیا تھا بولا وہ جھگّی بیچ کر بھی کیس میں لگا دیا۔ اب استاد مہالکشمی کے فٹ پاتھ پر اپنا بزنس جمایا ہے۔ اچھا معاف کرنا بہار صاحب۔ میرے کو دوکان پر جانا ہے۔ سلام علیکم۔"

بہار صاحب مہالکشمی پہنچے۔ ریس کورس کے پھاٹک پر موگرا نیم تلے فروکش تھے۔ پیچھے آہنی جنگلے میں فراست الید والے ہاتھ کا خاکہ اٹکا رکھا تھا۔ سامنے میلی دری پر چندلال ایک پنجرے میں مقید تھے مقدّر بتانے والے کارڈ

انکے سامنے رکھے تھے۔ ایک غریب آدمی اکڑوں بیٹھا استاد سے اپنی قسمت کا حال دریافت کر رہا تھا۔

بہار صاحب کی آنکھیں بھر آئیں موگرا نے انکو دیکھا اطمنان سے بولے "جیتے رہو۔ میاں۔ کہاں غائب تھے" ۔ وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ بالکل لقات۔

"اگر ریس کھیلتے ہو تو ہمارے پاس نہ آنا۔ کیونکہ ہم گھوڑوں کے نمبر بھی بتلاتے ہیں۔"

استاد نخاس کے بھانڈ تھے۔ اس المناک حالت میں بھی ہنسی مذاق سے باز نہ آتے

"چنبیلی خالہ کہاں ہیں۔ اور گلاب ؟"

"چنبیلی بیگم پڑوس میں بزنس کر رہی ہیں۔"

"کہاں ؟"

"حاجی علی کی درگاہ۔ کباب پراٹھے کا خوانچہ گلاب اپنے پراسرار دھندوں میں مشغول ہیں۔ کبھی کبھار آجاتے ہیں خرچے پانی کے لیے ہم سے ہی پیسے لے جاتے ہیں۔ البتہ مقدمے کی پیشی کے لیے لکھنؤ پابندی سے جاتے رہتے ہیں۔ مگر اب تو ہمیں جیتنے کی امید بہت کم ہے۔"

"استاد ہم آپکے لیے ایک خوشخبری لائے ہیں اس کیس کا واحد گواہ جو دستیاب ہو سکتا تھا مگر پچیس سال سے روپوش تھا وہ مل گیا۔"

"کون ؟ چکوترا گڑھوالی ؟"

"جناب عالی! دراصل ہمیں اوسلو کے مشاعرے میں ایک شاعر باندرہ کے ملے انہوں نے ذکر کیا کہ آپکے مقدمے کا ابتک فیصلہ نہیں ہوا۔ اور آپ حد سے زیادہ پریشان ہیں!!"

"اور میرے بھائی یہ اوسلو کہاں ہے ؟"

"ناروے۔"

"نوح ناروی کا وطن ؟"

بہار صاحب نے قہقہہ لگایا: "ایک مرتبہ پھولپور میں ایک صاحب نے نوح ناروی کا نام سن کر پوچھا تھا کہ اوہو اب ناروے میں بھی اردو شاعری ہونے لگی ؟ تو یہ قدرت کا کھیل دیکھئے کہ واقعی ناروے میں اردو شاعری ہونے لگی۔ تو ماشٹرجی ایسا ہوا کہ ہمیں اوسلو سے سیدھے ٹورانٹو جانا پڑا۔ کینیڈا اور امریکہ کے پچیس شہروں میں مشاعرے تھے۔ شرکت ضروری تھی۔ ورنہ پہلے آجاتے۔ پھر لاس اینجلز گئے۔"

"بیٹھو بہار میاں"، موگرا نے بات کاٹی۔ اوسلو۔ ٹورانٹو۔ لاس اینجلز یہ سارے نام انکے لیے اجنبی تھے۔ بہار صاحب انکا تذکرہ اب اسطرح کرتے تھے جیسے سرسی سنبھل۔ صفی پور۔ لہرپور۔ انکا ہاتھ دیکھ کر ایک بار فلم اسٹوڈیو کے برگد تلے موگرا نے کہا تھا۔ "بہار میاں پیسہ تو بہت ملے گا۔ مگر سمندر پار کا سفر تو کبھی تمہاری تقدیر میں ہے ہی نہیں۔"

خیر۔ قسمت کی لکیریں بدلتی رہتی ہیں۔ ہماری لکیریں بھی شاید بدل رہی ہیں کہ چکوترا گڑھوالی بطور مستند گواہ مل گئے۔ استاد نے اپنے ہاتھ کی مٹھی بھینچی۔

بہار صاحب وہاں فٹ پاتھ پر کہاں بیٹھتے۔ کہنے لگے آئیے کسی ہوٹل میں چلکر چائے پیتیں۔

موگرا نے انجم شناس چڑیوں کا پنجرہ درخت کی شاخ میں لٹکایا۔ جادوئی کارڈ صندوقچے میں بند کر کے قریب بیٹھے موچی کو آواز دی کہ سامان پر نظر رکھے۔

بہار صاحب ناریمان پوائنٹ پر شیرٹن کے سامنے جا کر رکے۔

"یہ فقیروں کا حلیہ دیکھو۔ دربان ہمیں اندر جانے دینگے ؟"

"ہمارے مہمان کو مجال ہے کوئی روکے۔"

"آدھ گھنٹے کے لیے ہم اپنی اوقات کیوں بھولیں۔ ایرانی کے ہوٹل چلو۔"
بہار صاحب اپنی موجودہ انٹرنیشنل شہرت کے انوسار معمولی چائے خانے میں نہ جا سکتے تھے۔ ساحل سمندر تجویز کیا۔ دونوں مرین ڈرائیو کے کنارے ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ لال انگارہ سورج نیلے پانی میں اترنے والا تھا ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ موگرا نے اس سہانے وقت کے لیے خدا کا شکر ادا کیا۔ بھیل پوری والا سامنے سے گذرا۔
اجازت طلب نظروں سے بہار کو دیکھا۔ "اپنی بین الاقوامی حیثیت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مسٹر پھولپوری بھیل پوری نوش کر سکتے ہیں؟" کھنکار کر دریافت کیا۔

بہار صاحب نادم ہوئے۔ خونچے والے کو پکارا۔ پھر کہا "استاد ایسا ہے کہ ہم لاس اینجلز ہلٹن میں مشاعرہ پڑھ رہے تھے۔ ادھر ہم نے ہندوستانیوں پاکستانیوں کا مجمع لگا رکھا تھا ادھر برابر کے ہال میں ایک سادھو جی نے گوروں کی بھیڑ اکٹھی کر لی تھی۔ ہم نے انکی جھلک دیکھی۔ چکوترا گڑھوالی سے معلوم ہوئے۔ ان تک پہنچنا دشوار تھا۔ دروازے پر انکے گورے بوڈی گارڈ کھڑے تھے۔ ہم کو اپنی غزل پڑھتے ہی فوراً ایرپورٹ بھاگنا تھا۔ ورنہ فلاڈلفیا کی فلایٹ مس ہو جاتی ـــ
"اچھا ـــــ خیر بہر حال تو ہم نے وہیں پر فوراً سے پیشتر امی جی کے بارے میں پتہ لگا لیا۔ مادھنیشن گوڈ کہلاتے ہیں بہت نیکنام آدمی ہیں۔ مگر سدا مون برت رکھے ہوئے ہیں۔ بذریعہ تحریر بات کرتے ہیں۔ وہ بھی شاذ و نادر۔ اسوقت بھی جو کچھ وہ لکھ کر دیتے تھے انکی گوری سکریٹری گورے بھگتوں کو سنا دیتی تھی۔ ہم مشاعرے سے بھاگ کر انکے سکریٹریٹ میں پہنچے۔ اور کہا ہم انکے بڑے پرانے بھگت ہیں۔ انڈیا میں ہم دونوں برسوں ایک ساتھ ریاضتیں کر چکے ہیں۔ دس روز بعد بمبئی واپس جا رہے ہیں۔ اسوقت انکے درشن چاہتے ہیں۔ ایک سکرٹری نے کمپیوٹر دیکھ کر اپوائنٹمنٹ دیا" دو ہفتے بعد ـــ بمبئی۔ تاریخ۔ وقت جائے قیام کا پتہ۔ ہم پرسوں امریکہ سے واپس آئے آج آپکو تلاش کیا۔ اب مادھنیشن گوڈ سے ملاقات کے

بعد آپکو بتلائیں گے یا آپ بھی ساتھ چلے چلیے۔"
"نہیں تم ہی پہلے ہو آؤ۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔"
"استاد ہم تو اسی تیل کی دھار پر بہتے بہتے ساری دنیا گھوم رہے ہیں!"

ایک پارسی پارسن اپنا کتا زنجیر سے ہلگاتے سامنے سے گذرے۔ چند قدم کے فاصلے پر شیرٹن میں کسی ہندی پکچر کا افتتاحی جشن منایا جا رہا تھا۔
"صنوبر فلم کمپنی!" موگرے نے ایک سرد آہ بھری۔
بہار صاحب نے بھیل پوری کا پتر بنچ کے نیچے ڈالتے ہوئے کہا۔ "کراچی جم خانہ کے مشاعرے میں ایک شعر ہم نے سنا ہے

ایک ہی داستان شب ایک ہی سلسلہ تو ہے
ایک دیا جلا ہوا ایک دیا بجھا ہوا

"ـــ یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا۔ اوسلو میں ہم ایک روز بغرض تفریح ایک پہاڑی ٹرین پر سوار ہوئے۔ ٹہلتے ہوئے انجن تک چلے گئے ڈرائیور ایک پاکستانی تارک وطن نکلا۔ سیالکوٹ کا۔ ٹرین صنوبروں میں سے نکال کر چوٹی کی سمت لیے جا رہا تھا۔ چپ چاپ۔ اُداس۔ ہم آکر اپنی کھڑکی میں بیٹھ گئے ڈبہ خالی پڑا تھا۔ ٹرین ہری بھری پہاڑیوں پر سے گذر رہی تھی۔ تو اچانک ہمیں وہ برکھا رت اور وہ ریل گاڑی یاد آئی جس میں ہم آپ لوگوں سے پہلی بار ملے تھے۔ ہم الٰہ آباد سے چلے تھے آپ لکھنؤ سے۔ ناروے کی اس سنسان اجنبی پہاڑی پر اس سیالکوٹی ڈرائیور کو دیکھ کر ہمیں خیال آیا کہ پیٹ کی خاطر انسان کہاں کہاں جا پہنچا ہے۔ ہم آپ تو محض پھولپور اور نخاس سے بمبئی ہی گئے تھے۔ اور ہم بھوکے تھے اور چنبیلی خالہ نے ہمیں کباب پراٹھے ـــ
ارے۔ استاد" بہار صاحب نے چٹکی بجائی۔ "یہ مقدمہ تو اب انشاءاللہ جیتا ہی سمجھیے۔ لاس انجلز میں ہم آپکے لیے ایک ریسٹوران کھلوا دینگے۔ چنبیلی خالہ کے کباب پراٹھے۔ نئی دنیا میں طباخی کے نئے دور کا آغاز۔ یقین جانیے جسطرح آجکل لندن کا

انگریز طبیعت سے سموسے تکّے کھا رہا ہے۔ امریکہ میں گھر گھر کباب پراٹھے رائج ہو جائیں گے اور نارتھ امریکہ میں اللہ کے کرم سے ہمارے بے شمار اردو دان قدردان گویا بجمان بیحد ماشاء اللہ دولتمند موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک آپکا بزنس پارٹنر بن جائے گا اور آج سے دو سال بعد انشاء اللہ ہم آپ اسی مہینے تاریخ اور وقت بحرالکاہل کے ساحل پر بیٹھے ہوں گے۔ ہمارے عقب میں اس اوبرائے شیرٹن کی طرح آپکا موگرائے بیلٹن جگمگاتا ہوگا اور اس کا ریسٹوراں —

AUNT JASMINE'S COTTAGE KEBABS

ہنسئے نہیں۔ کوئی عجوبہ بات نہیں۔ یہ جو ایشین آجکل ٹائیکون ویسٹ میں دندنا رہے ہیں ان میں سے دو کے بارے میں تو ہم جانتے ہیں۔ ایک کی والدہ پارٹیشن سے قبل پرانی دلی میں گھر گھر جا کر سلائی کرتی تھیں اور دوسرے کے والد معمولی سرکاری ملازم تھے۔" وہ جوش میں آکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور چینی اوپیرا کے قاصد کی طرح اعلان کیا "اب میں کل صبح ساگر پربت پربنے سمندر محل کو جاتا ہوں اور کیلاش پتی کی آکاش بانی آپکے لیے لاتا ہوں۔"

"استاد آپکو شاید یاد ہو۔ گل عبّاس مرحومہ کی تعزیت کے لیے چکوترا ناگپاڑہ آئے تھے۔ چند روز بعد جمالستان اسٹوڈیوز میں ملے۔ کہنے لگے ہم بدری ناتھ یاترا کیلئے جا رہے ہیں ہم نے کہا ابھی تو آپ گڑھوال سے لوٹے ہیں پھر وہیں چلے۔ تو وہاں پہنچ کر اس فرزند کہستان نے اپنی خودی پہچانی اور دنیا تیاگ دی۔ شیر کی کھال اوڑھ کھڑاؤں کا جوڑا بنائے رُدراکش کی مالا پہنے بدری ناتھ کی ایک چٹان پر بیٹھے تھے کہ گورے بیراگیوں کی ٹولی کا ادھر سے گذر ہوا۔ انکو شیو اوتار سمجھا۔ اپنے ہمراہ باہر لے گئے تب سے وہیں پر ہیں۔ ماؤنٹین گوڈ کہلاتے ہیں۔ بمبئی سے چکوترا گڑھوال گئے تھے۔ اترکھنڈ سے گوڈ بن کر لوٹے۔ باہر انکے متعلق انگریزی جرمن فرنچ وغیرہ میں کتابیں چھپ چکی ہیں

یہاں نیپین سی روڈ پر ایک بڑھیا فلیٹ میں مقیم ہیں۔ جب ہم پہنچے زعفرانی ساری پہنے ایک گوری عورت ریسپشن ڈیسک پر مستعد بیٹھی تھی۔ سامنے اسکے نام کا کارڈ رکھا تھا۔ ماں امبا وتی اس کو گڈ مورننگ کہا۔ وہ بولی ماں پاروتی سے بات کیجئے میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ماں پاروتی بڑی لحیم شحیم تھیں۔ نارویجین یا جرمن معلوم ہوتی تھیں گیلری میں ٹیلی فون کی میز کے پاس براجمان HE'S COME DOWN THE MOUNTAINS HE'S COME کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ میاں چکوترا کے متعلق اس کتاب کی لاکھوں جلدیں مغرب میں فروخت ہو چکی ہیں۔"

"بہار صاحب ذرا قصّہ مختصر نہیں کر سکتے؟" استاد نے بیصبری سے بات کاٹی۔ بہار صاحب شاید چاہتے تھے کہ اصل بات جسقدر ممکن ہو تاخیر سے بتلائیں اور اسی دوران میں بوڑھے پیٹی ماسٹر کو نفسیاتی طور پر تیار کر لیں۔ سگریٹ کا کش لیکر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ "تو استاد اس ماں پاروتی نے ہمیں جھنجھلا دیا۔ وہ صیغہ واحد متکلم کے بجائے دِس بوڈی کہتی تھی۔ یعنی یہ شریر۔ یہ کایا۔ معلوم ہوا۔ خداوند کہستاں بھی چُپ سادھنے سے قبل اپنے آپ کو "میں" کے بجائے "دِس بوڈی" کہتے تھے۔ ہم نے اس مریدہ سے پوچھا گوڈ کے درشن ہو سکتے ہیں۔ بولی۔

THIS BODY DOES NOT KNOW

"ہم نے کہا مادام ہمارا اپوائنٹمنٹ لاس اینجلز میں ہو چکا ہے۔ بولی ٹھیک ہے اسوقت ساڑھے دس بجا ہے آپکا وقت ملاقات گیارہ بجے کا مقرر ہے۔ اسی وقفے میں آپکا ہارٹ فیل ہو سکتا ہے یا بھونچال آسکتا ہے۔ یا خود ماؤنٹین گوڈ اپنا شریر تج سکتے ہیں کسی کو کیا معلوم۔

"غصّہ تو بہت آیا پھر سوچا ہم یہاں بیلا مرحومہ کے عقد کے سلسلے میں چکوترا جی کی گواہی حاصل کرنے آئے ہیں خود بیلا اور انکے شوہر کو محض چند سکنڈ قبل کیا یہ معلوم تھا کہ اتنی بھیانک آگ لگنے والی ہے اور دونوں اسمیں جل کر خاک ہو جائیں گے معاف کرنا استاد۔"

"کوئی بات نہیں۔ کہے جاؤ۔"

"ہم نے اس چیلی سے عرض کی آپکے دماغ کو علم نہیں مگر فی الفور آپکا ہاتھ تو انٹرکام پر مہاتماجی کے کمرے سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔

"کہنے لگیں ہاتھ بھی میرا نہیں ہے۔ محض وہم ہے۔

"ہم سوچنے ایک تو وہ بولتے نہیں لکھ کر جواب دیتے ہیں اگر موصوف بھی اسی قسم کی گفتگو کریں گے تو ملنا عبث ہے۔

"اسی وقت ایک اخبارچی آن پہنچا۔ بڑا چکرایا۔ پوچھا ـــ

"بہار صاحب آپ بھی اس چکر میں ؟

"چونکہ چکوتراجی انٹرویو نہیں دیتے۔ محض انکے اسٹاف کے گورے گوریاں پریس سے بات کرتے ہیں اپوائیمنٹ کے مطابق اخبارنویس نے ماں پاروتی کا انٹرویو شروع کیا۔ پوچھا۔ آپ کہاں کی رہنے والی ہیں ؟

"بولیں لامکاں کی۔

"اتنے میں گھنٹی بجی ایک دھوتی پوش گورا باہر آیا۔ اور ہمیں اشارہ کیا۔

"ہم اندر گئے۔ چکوتراجی مرگ چھالا پر بیٹھے تھے پیچھے دیوار پر شوجی کی بڑی سی تصویر لگا رکھی تھی۔ ایک گوری سکریٹری کچھ دور پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم نے نوٹس کیا کہ مغرب میں پوجے جانے والے دیگر ہندوستانی سوامیوں کے برعکس یہ بہت سادگی سے رہتے تھے۔ ہم نے کہا ـــ ہم آپکے پرانے دوست ہیں۔ اور آپ سے بالکل تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ عنایت ہوگی اگر اپنی سلیٹ پر ہندی میں خود ہی لکھ کر جواب مرحمت فرماتیے۔ اس دیوی کو زحمت نہ دیجئے۔

"گوڈ نے بڑی شفقت سے تبسم فرمایا۔ سنہری کنیا کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلی گئی۔ میں نے کہا۔ 'بھگوان صاحب۔ جب آپ اندھیری ریلوے اسٹیشن پر بانسری

بجا کر غبارے فروخت کرتے تھے ماسٹر توگرے نے آپکی کومیڈی کی صلاحیت اور آپکا مسخرہ پن دیکھ کر آپکو اپنے جتھے میں شامل کیا تھا آپ منوہر بنسی والا کہلاتے تھے۔ چکوترا گڑھوالی آپکا فلمی نام اس خاکسار ہی نے تجویز کیا تھا۔ سر ہلا کر کہیے ہاں۔

"انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ اب خدا نے آپکو گوڈ بنا دیا۔ تو اپنے پرانے ساتھیوں کی سہایتا کیجئے۔ پورا قصہ از اوّل تا آخر اس مقدمے کا سنایا۔ جواباً انہوں نے سلیٹ پر لکھا۔ اس بھینکر آگ کی خبر ہی نے دنیا سے ہمارا دل اچانک اٹھا دیا تھا۔ ترنت ہم نے بدری ناتھ جی پہنچ کر سنیاس لے لیا۔ اب ہم بھوساگر کی ہر اونچی نیچی لہر سے بے نیاز ہیں۔

"میں نے کہا ـــ فیل فروش نے دعوے کیا ہے کہ بیلا کی شادی قمر علی سے ہوئی ہی نہیں تھی۔ آپ اس سنجوگ کے واحد گواہ ہیں۔ کیونکہ اب ایک عالمی شخصیت ہیں اور مغرب کے نیکنام معبودوں میں سے ہیں۔ آپکی گواہی سچ مانی جائے گی۔ ہم کو بھی اللہ کے فضل سے چار آدمی جان گئے ہیں لیکن ہم محض بلبل شعرستان اور بزرنگ کوی ہی کہلاتے ہیں آپ ماشاءاللہ گوڈ بن چکے ہیں۔ یوں ہم کسی کو بتلائیں گے نہیں کہ آپ پہلے چکوترا گڑھوالی کے نام سے 'سی' کلاس فلموں میں جوکر بنتے تھے۔

"انہوں نے سلیٹ پر لکھا ـــ بتلا بھی دیجئے تو کیا حرج ہے والمیکی جی بھی تو پہلے ڈاکو تھے۔

"ہم نے جواب دیا ـــ چکوترا بھائی۔ اس زمین کی قیمت اسوقت پچاسی لاکھ ہے۔ بہت جلد ایک کروڑ سے اوپر نکلنے والی ہے۔ صرف آپکی گواہی سے ماسٹر جی کیس جیت جائیں گے۔

"انہوں نے لکھا ـــ اس مقدمے میں دم نہیں ہے۔ اسکا خیال چھوڑ دیجئے سنسار کی کسی چیز میں کوئی دم نہیں۔ موہ مایا کے جال سے نکلیے۔ بیلا بہن کے خوفناک حادثے نے ہمیں جوگی بنا دیا۔ اور پچھلے دس برس سے تو ہم مون برت ہی رکھے ہوتے ہیں۔ ماسٹر جی کا اصل احسان ہم پر یہ ہے کہ انکی بیٹی کی موت نے ہمیں

راہِ خدا بھائی۔ اوم شانتی — شانتی — شانتی۔

"سلیٹ ہماری طرف کھسکا دی۔ ہم بھی اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بولے — گرُو مہاراج۔ آپ کم از کم عدالت میں یہ بیان تو دے سکتے ہیں کہ نکاح آپکا چشم دید واقعہ ہے۔ کیونکہ آپ ہی منڈلی کے وہ فردِ واحد تھے جو چُپکے سے اوپر چلے گئے تھے۔ ہم لوگ برساتی میں بیٹھے آہا اوول سُن رہے تھے آپکو ہم نے تو زینہ چڑھتے دیکھا۔

"انہوں نے اپنی جٹاؤں کو جنبش دی۔ اور لکھا — ہمیں ایک ایک بات یاد ہے۔ ہماری صنوبر کمپنی کو راجہ رگھبیر پرشاد سنگھ نے اندر سبھا کا ایک سین پیش کرنے کے لیے اپنے گارڈن ہاؤس میں بلایا تھا تھوڑی سی آہا سننے کے بعد اپنا رول ادا کرنے کی غرض سے ہم نے کالے دیو کا بھیس بدلا۔ اسوقت تک ہم کو اس کوٹھی کا ذرا پر اسرار سا ماحول دیکھ کر کچھ شک ہو چلا تھا۔ کہ میاں امانت کے پردے میں یہاں کوئی اور کھیل ہو رہا ہے۔ سو جب بیلا دیر تک نہ لوٹیں تو سُن گن لینے ہم چُپکے سے اوپر پہنچے۔ ترنت ہی ایک کمرے میں بیلا اور قمر علی دکھلائی پڑے۔ وہ باغ کوٹھی باغ کوٹھی رٹ رہی تھیں — میرے نام لکھدو۔ میرے نام لکھدو۔ ہم چکرائے کہ یہ تو زر زمین زن کا لفڑا ہے۔ بھاگو۔ یہاں سے۔ الٹے پاؤں نیچے لوٹ آئے۔ لہٰذا سُر رنگ کوی بہار جی! ہم نے نکاح ہوتے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ہم سادھو ہیں۔ ستیہ وادی۔ حق پرست۔ ہم جھوٹی گواہی کیسے دیں؟ گیتا پر ہاتھ رکھ کر حلف کیونکر اٹھائیں؟ اوم نمو شوآیاہ؟"

---

⑧ قصرِ شیریں

"پرویز اینڈ فرہاد آرکی ٹیکٹس اینڈ بلڈرز" کے سینیئر پارٹنر پرویز مرزا عرف پنکی میاں اپنے جونیئر شریک کار فرہاد ڈھونڈی عرف فلی کے قدیم دومنزلہ شیریں کاسل میں ایوانِ نشست کے قالین پر ایک نقشہ پھیلائے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ مجوزہ "ہائی رائز" عمارت روز ہاؤس میں گلاب کا موتیف کس انداز سے شامل کریں۔ فطرت سے انسپریشن حاصل کرنے کی خاطر انہوں نے کھُلے دروازے کے باہر نظر دوڑائی تو محض "کُتا پری" کی مٹی سی قبر ہی دکھلائی پڑی۔ اس پر ایک بدتمیز بدذوق کوا آن بیٹھا تھا اور فرنچ پوڈل ٹی فی کا پردار مرمریں مجسمہ درنٹے کی جھاڑی میں چھپ گیا تھا۔

فی فی ان فرانسیسیوں کی یادگار تھی جو غدر سے پہلے یہاں رہتے تھے۔ مرغبازی کے شائق ہو چلے تھے لیکن وطن کی چاہت میں اپنی رہائش گاہ کو شاطوبار کو پکارتے تھے۔ عوام نے شاطوبار کو چھتہ فرنگی کر دیا تھا اور فی فی کا پردار مجسمہ "کُتا پری"۔

انگریزی ہوتے ہی "کُتا پری والی کوٹھی" میں مغبچے آن بسے۔ چو چلتے پھرتے شاہنامہ فردوسی تھے — نریمان۔ زال۔ نوشیرواں۔ رستم۔ یہ دیانتدار اور مستعد بادہ فروش۔ مجوسی فرنچ اسٹائل شاطوبار گو پر بہت نازاں تھے۔ لیکن جب نوشیرواں ڈھونڈی کی کتخدائی پالی ہل، بمبئی، کے ایک بیرونیٹ کی بیٹی شیریں بائی سے ہوئی انہوں نے کوٹھی اپنی بیوی کے نام لکھدی اور انگریزی میں شیریں کاسل اور اردو میں قصرِ شیریں کی مرمریں تختی پھاٹک پر نصب کر دی گئی۔ وہ تختی اب عشق پیچاں کی بیل میں پوشیدہ تھی

اور کسی نے اس کے نیچے کوئلے سے ہندی میں شیریں کا سِل گھسیٹ دیا تھا۔

آج یہ کنبہ محض تین نفوس پر مشتمل تھا۔ مانک بائی۔ فرامروز۔ مہناز۔ لہٰذا بالائی منزل پر فرانسیسیوں کے کارڈ روم میں پرویز اینڈ فرہاد کا دفتر قائم کر لیا گیا تھا۔

اسوقت ان دونوں نے نیچے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پر اپنا بلیو پرنٹ پھیلا رکھا تھا — اور اسمیں منہمک پنکی میاں بےخبر تھے کہ ستائیس سال قبل!

ایسی ہی بلوریں سہ پہر تین کٹوری ہاؤس کے صحن میں اودھم مچاتے ہوئے انہوں نے چاندنی بیگم کی عینک نہ توڑی ہوتی تو آج وہ شیخ طاہر علی سروش فیل فروش کی نئی ملکیت ریڈ روز گارڈن کی زمین پر کنکریٹ فولاد اور گلاس کا دس منزلہ روز ہاؤس پلان کرنے میں مصروف نہ ہوتے۔

مقدرات۔

پنکی اور فلی کے علاوہ اسوقت دیوان خانے میں متعدد افراد جمع تھے جنکا کوئی تعلق فن تعمیر سے نہ تھا۔ پنکی کے خالہ زاد بھائی ڈنکی جو کاسنی شلوار قمیص کے قومی لباس میں ملبوس تھے اور باقی سب سے ذرا مختلف نظر آتے تھے۔ وہ دوسرے غیر ملکی مہمان یعنی فلی کے امریکن پاسپورٹ والے ماموں مسٹر کیکی لال کاکا سے باتیں کر رہے تھے۔ پنکی کی چھوٹی بہن آمنہ ایک راکنگ چیئر پر بیٹھی سویٹر بننے میں مصروف تھیں۔

کلوپیٹرا کاؤچ پر متمکن انکی خالہ صفیہ سلطان مسز مانک بائی ڈھونڈی والدہ فلی سے دھن سک بنانے کی ترکیب پوچھ رہی تھیں مگر ذہن نشین نہ کر پائی تھیں۔

رستم جی نوشیرواں جی دادا بھائی ڈھونڈی کا اکلوتا فرزند فرامروز الموسوم بہ فلی نیرود ڈنیتی تال سے لیکر کولمبیا یونیورسٹی تک پنکی میاں کا ہم سبق رہا تھا۔ آبائی پیشہ مے فروشی ترک کر کے فنِ تعمیر کی طرف راغب ہوا۔ پنکی کے ساتھ ہی اس علم کی اعلیٰ اسناد حاصل کر کے وطن لوٹا۔ اور گذشتہ چند برسوں کے اندر اندر شہر کے نمبر ون عمارت ساز محمد معروف بلڈرز کے بعد اب انکی فرم کا نمبر آچکا تھا۔

تین کٹوری ہاؤس کی بالائی منزل پر صفیہ سلطانہ کا "سینٹ صوفیہ کانونٹ" — گراؤنڈ فلور پر وکی میاں اپنی موجودہ بیگم (جو الایچی خانم آتو جی مرحومہ کی نواسی تھیں) اور چار بچوں کے ساتھ سکونت پذیر — پنکی کی بیرسٹر بہن شہلا کا دفتر بھی اسی مکان میں — چنانچہ پنکی نے لق و دق شیریں کا سل کو اپنا کاروباری مستقر بنا رکھا تھا اور مجوزہ روز ہاؤس میں ایک منزل اپنی فرم کے لیے مخصوص کرنے والے تھے۔

"پرویز اینڈ فرہاد۔ معماران۔ قصر شیریں" سبحان اللہ"

ڈنکی نے انگریزی، ہندی اور اردو میں چھپے لیٹر پیڈ کی اردو عبارت پر نظر ڈال کر داد دی۔

"یہ ہماری دل بہار بوا کا آئیڈیا تھا۔ فلی نے نقشے پر سے سر اٹھا کر بتلایا — "کہنے لگیں — مرزا اینڈ ڈھونڈی بھونڈا لگتا ہے۔ قصر شیریں میں فرہاد ہونا چاہیئے"۔

"دل بہار بوا داستانوں کی تہذیب کی پروردہ ہیں"، پنکی نے گفتگو میں حصہ لیا۔ "ہم نے شہلا آپی سے کہا فلی کے نام میں فرہاد کا قانونی طور پر اضافہ کروا دیں۔ لہٰذا اب موصوف ملکہ وکٹوریہ کے کسی رائل یوریشین پر نواسے کی طرح ایک گز لمبے اسم گرامی کے مالک ہیں۔ فرہاد فرامروز رستم جی دین یار ڈھونڈی! فرم پرویز اینڈ فرہاد رجسٹر ہوئی۔ اہلِ ذوق سر دُھنتے ہیں۔"

"اس شہر میں اب کتنے اہل ذوق باقی ہیں؟" ڈنکی نے طنزاً دریافت کیا۔

"تمہیں تعجب ہوگا کہ بے شمار۔ کسی سبزی فروش یا رکشا والے سے بات کر کے دیکھ لو۔ یہاں کے عوام کی تمیز داری اور بذلہ سنجی تو اب بھی مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے"۔ پنکی کو اب جوش آچکا تھا۔ "ہمیں تو سراج وسالک بھی یاد ہیں۔ شام کو نخاس کے ایک چائخانے میں بیٹھتے تھے۔ انکے گرد بھیڑ لگ جاتی۔ پڑھے لکھے اپنے ادبی مسائل لیکر ان کے پاس پہنچتے۔ وکی ماموں اسی زمانے میں ذرا مجنوں ہو گئے تھے۔

—— ایک بار ہمیں بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرات مرآج سے ایک شعر کے متعلق دریافت کیا۔ کسکا ہے ؎

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں — شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

"انہوں نے فرمایا یہ شعر علاوہ میرؔ کے اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔

"محلّے محلّے انجمن بہارِ ادب کے مشاعرے۔ عوام رات کے کھانے کے بعد پان والوں کی دوکانوں پر جمع ہو جاتے۔ کبڑیے۔ زردوز۔ مستری۔ زیادہ تر ناخواندہ۔ طے ہوتا آج گُل کے مضمون پر شعر سُناتے جائیں آج قفس پر —— اور وہ ایک سے ایک شعر بے تکان سُناتے چلے جاتے۔"

"اپنی بات کرو۔ تم کو تو اردو پڑھنی بھی نہیں آتی۔ ڈِنکی نے پھر چوٹ کی۔

یکلخت پِنکی کا چہرہ اتر گیا۔ "ہاں اب ہمیں بھی ان اَن پڑھ کبڑیوں کا ایسا ہی سمجھو۔" انہوں نے تاسّف سے جواب دیا۔ "مگر ڈِنکی تم کتنی اردو پڑھتے ہو ؟"

"کیمونل پروبلم ——" فلّی نے کہا "ہندی بیلٹ کی مصیبت ہے۔ ساؤتھ میں حالات مختلف ہیں۔"

"ساؤتھ انڈین لوگ —— نسبتاً پروگریسو ہیں وہ ہمیں ان جھمیلوں میں گرفتار دیکھکر متعجب ہوتے ہیں —— ڈِنکی، چاندنی باجی یاد ہیں ؟" آمنہ نے پوچھا۔

"ہاں گوری گوری۔ نیپالی سی لگتی تھیں۔ ہر وقت امّی کے کپڑے سیتی رہتی تھیں۔ بلکہ امّی انکو اپنے ساتھ فیروزہ کی آیا بنا کر امریکہ بھی لے جانے والی تھیں۔"

"تم لوگوں کی روانگی کے چند روز بعد ہماری امّی نے ان سے کہا کہ پِنکی کو اردو پڑھا دیں۔ انکو اپنی شرارتوں سے فرصت نہیں تھی۔ اور وہ غریب بھی جل کے خاک ہوئیں۔"

"نہ ریڈ روز میں آگ لگتی نہ پِنکی آج یہ نقشہ بازی کرتے۔" صفیہ نے بلیو پرنٹ کی کی طرف اشارہ کرکے پہلی بار بات کی۔ اور بڑی ہولناک آواز میں۔

پِنکی دوبارہ نیلے کاغذ پر جُھک گئے۔ کمرے میں عجیب سی ندامت آمیز خاموشی چھاگئی۔

"چھوٹی خالہ کو دیکھ کر مسز عبدالقادر کی کہانیاں یاد آتی ہیں لاشوں کا شہر اور دوسرے ہیبتناک افسانے، اور موت کا راگ اور کاؤنٹ الیاس کی موت، از مس حجاب اسمٰعیل۔" آمنہ نے ڈِنکی سے سرگوشی کی۔

"وہ کون تھیں ؟" ڈِنکی نے چُپکے سے پوچھا۔

"کون ؟"

"مسز عبدالقادر اور مس حجاب اسمٰعیل ؟"

"اوہ۔ ڈِنکی وِنکی —— ! لیکن ہمیں چھوٹی خالہ کے لیئے ایسے مور بِڈ حوالے نہیں دینے چاہئیں۔" بطور پرائشچت وہ اٹھ کر صفیہ کے قریب جا بیٹھی۔

ڈِنکی نے سر پیچھے ڈال کر کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ شیریں کاسل کے اس ڈرائنگ روم میں بہت مدّت بعد خود کو موجود پا رہے تھے، اور جذباتیت میں مبتلا ہونے کے بجائے حیران تھے کہ جب وہ لڑکپن میں اپنی والدہ پروین سلطانہ کے ہمراہ پاکستان سے اپنے نانا نانی کے یہاں آتے تھے اور اپنی بڑی خالہ زرینہ سلطانہ کی اولاد شہلا، پِنکی اور آمنہ کے ساتھ قصرِ شیریں آکر فلی اور مہناز کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اُس وقت سے لے کر آج تلک اس مکان کی کسی چیز میں سرِ مُو فرق نہ آیا تھا۔ آتشدان کے اوپر شیریں بائی ڈھونڈی اور روڈابائی انجینیر کی تصاویر اُسی زاویئے سے رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار پر نوجوان امپراطورِ ایران ابھی تک ملکہ ثریا کے ساتھ ہی جلوہ گر تھے۔ وہاں فرح دیبا آئیں اور چلی بھی گئیں۔ خود آریہ مہر تختِ طاؤس سے اترے اور اپنے فرضی اجداد کیکاؤس اور جمشید سے جا ملے۔ ڈِنکی نے رشک کیا، مانک بائی کس قدر وفادار ہیں وفاداری بشرطِ استواری۔ خود مانک بائی بوڑھی نہیں لگتیں۔ اُنکا ولی عہد ہمایوں فرامروز عرف فلی البتہ گنجا ہو چلا تھا۔

اسی طور پر ڈِنکی میاں نے نوٹس کیا تھا، کہ انکی ننہیال تین کٹوری ہاؤس کے حمّاموں

میں قلعی وار تانبے کے آب گرما ہنوز موجود تھے، اور توشہ خانے میں گوٹے کناری والے چولی دار شلوکے اور گھر سواں پائجامے اور انگر کھے اور جامہ وار کی اچکنیں — کل ہی ڈنگی میاں نے اپنی بڑی خالہ زرینہ سے تجویز تھا کہ اس قسم کا سامان بطور نادرات اگر فروخت کردیں تو انکو کتنا منافع ہوگا۔ اُس پر وہ مخدومہ بے حد ناراض ہوئی تھیں۔

مسز مانک بائی ڈھونڈی ڈِل بہار بوا، ڈِل بہار بوا پکارتی اندر گئیں۔ وہ بیشتر پارسیوں اور بوہروں کی مانند "د" کو "ڈ" اور "ت" کو "ٹ" کے تلفظ سے ادا کرتی تھیں۔ انکی اولاد کا نہ صرف شین قاف بلکہ ت ٹ بھی درست تھا۔

ڈنگی نے مٹرلال کاکا سے اجازت لے کر ایک سگریٹ سلگایا۔ دوسرا اپنی چھوٹی خالہ کو پیش کیا۔ انھوں نے برُا مان کر سر ہلایا — مسز ڈھونڈی واپس آئیں —

"آپ لوگ سب کے سب بالکل نہیں بدلے" ڈنگی نے اظہار خیال کیا۔

"اور ہم یہ حیرت ہونا نہیں ختم کر سکتا کہ تم کتنا بدل گیا نی —" مسز ڈھونڈی نے کہا۔ "اس ڈریس میں ایک دم کابلی والا دِکھائی پڑتا —"

"اوہ نو ممی —" فلی نے پلان پر سے سر اٹھا کر ڈنگی کو معذرت خواہ انداز سے دیکھا۔

ڈنگی نے جھنجھلاہٹ ضبط کر کے ذرا مشفقانہ انداز میں پنکی سے کہا —

"تمہاری اس فرم کی کامیابی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی —" اپنی چھوٹی خالہ صفیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ حسب معمول اب وہاں نہیں تھیں۔ کہیں اور تھیں۔

صفیہ سلطانہ نے فلی کی دادی شیریں بائی اور پھوپھی رو ڈابہ کی تصاویر پر نظر جما رکھی تھی۔ ایک نوعمر حسین پارسن البرٹ فیشن بال بنائے اسی کمرے کے ایک ستون کے پاس بڑی نزاکت سے ایستادہ تھی۔ دوسری نوعمر حسین پارسن پَف فیشن زلفیں سنوارے گاؤن پہنے اسی کلوپیٹرا کاؤچ پر نیم دراز تھی۔ — اُس کے بارے میں

مسز ڈھونڈی نے ہمیشہ بتلایا تھا کہ مصور ڈیوڈ کی "مادام ریکیمیئر" والی مشہور پینٹنگ کو سامنے رکھ کر حضرت گنج کے ایک انگریز فوٹوگرافر نے ۳۶ء میں ان کی لیٹ سسٹر ان لا روڈابائی کا یہ فوٹو نکالا تھا۔

شیریں بائی۔ روڈابائی۔ مینٹل پیس سے اتر کر اس کلوپیٹرا کاؤچ پر واپس آجاؤ — پھر واپس چلی جاؤ۔

مانک بائی کے خیال میں اس نوع کی آمد و رفت کچھ مشکل بات نہیں۔

وہ مالابار ہِل بمبئی کے ایک مشہور پارسی تھیوسوفسٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ انکی نانی تہمینہ بائی سردین شاپیٹ کی تھیوسوفسٹ صاحبزادی رتی بائی سے واقف تھیں۔ مسز ڈھونڈی تو اب اکثر پارسیوں کی طرح بہت ہی زیادہ ہمہ اوست والی بن گئی تھیں۔ شیرڈی کے سائیں بابا اور پونا کے مہر بابا سے لیکر تمام خدایان عالم سے لو لگائے رہتی تھیں۔ بالا گنج کے بابا نیم چیلی کی بھگت تھیں جن کے معتقدین کا کہنا تھا کہ وہ ایکسو بیس برس کے ہو چکے تھے مگر پچاس کے دکھلائی پڑتے تھے۔ اور برگد کی شاخ پر کٹی بنا کر اُسمیں رہتے تھے۔

دل بہار بوا چاء کی کشتی لا کر ایک میز پر رکھ گئیں۔

"فینی بٹیا — تم عزت کرو" مانک بائی نے صفیہ کو مخاطب کیا۔

صفیہ سلطانہ مسز ڈھونڈی کی لاجواب اردو کی عادی تھیں لیکن اس وقت چکرا گئیں۔ ادہو — یہ DO THE HONOURS کا لفظی ترجمہ تھا۔

"تھوڑا چاء —!" پنکی نے مسکرا کر مسز ڈھونڈی کی زبان میں صفیہ کو پکارا۔

"ارے مانک کھالا آپ کہاں چلیں —؟"

اکثر شام کے وقت جب وہ سارے بہن بھائی باہر کھیل کود میں مصروف ہوتے مسز ڈھونڈی اپنی مُنّی سی ٹمٹم جس میں اُتنا ہی مُنّا سا سفید گھوڑا جتا رہتا تھا، خود ہانکتی

ہوئی تین کوڑی ہاؤس کے پھاٹک میں داخل ہوئیں۔ برساتی میں سے سونا کلی ہانک لگائی — امی بٹیا تمہری مانک کھالا آتے گیئں — تب سے وہ سب اُنکو خالہ کے بجائے کھالا کہتے آئے تھے، کہ کھالا میں بڑا بھولا سا پیار مضمر تھا۔ یہ بھی ایک نوع کی وضعداری تھی — اور مسز ڈھونڈی کی وضعداری یہ تھی کہ انکی انگریزی نما اردو من وعن برقرار تھی۔ بقول مسز ڈھونڈی جب انگریز آدمی لکھنؤ پر آیا۔ سپاہی لڑائی کے بعد۔ تب اُن لوگ کو دارو پلانے واسطے ہمارا دادا اُسٹر بومبے سے پہنچا۔ اور جب مانک بائی نورِ خدا کی سمبل آتش بہرام کے اگور ستم جی سے شادی بنا کر یہ سائیڈ میں آیا تب سے انھوں نے اپنی اردو داں سسرال کی خاطر اتنی رعایت کی تھی کہ انگلش فقروں، ترکیبوں اور محاوروں کا لفظی ترجمہ کرکے مسلسل اردو بولتی تھیں۔

کمرے میں واپس آکر ورقی سموسے پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا "میں امید کرتی ہوں ڈنکی بچے کہ تم پاکستان میں بہت اچھا کرتے ہوگے۔" یعنی DOING WELL

"جی ہاں۔ مانک کھالا۔"

"اور تمہارے پیارے باپ؟"

"وہ بھی کراچی واپس آگئے ہیں۔"

"کتنا عمدہ۔" مسز ڈھونڈی مطمئن ہوکر بیٹھ گیئں۔

کل زرینہ سلطان نے اپنی اس قدیمی وفادار فیملی فرینڈ سے کہا تھا کہ پنکی بوڑھے ہوئے جا رہے ہیں۔ فیرزہ اتنے برسوں بعد ماشاء اللہ سے سیانی ہوکر آئی ہیں اُنکو بہت اچھی لگیں۔ اُن سے بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈنکی میاں سے معلوم کیجیے، وہ اپنی بہن کے لیے یہ پیغام منظور کریں گے؟ مجھے پتہ ہے اُنکے گھر میں اُنہی کا حکم چلتا ہے۔"

"پنکی خود فیروزہ سے کیوں نہ پوچھے؟"

"آپکو تو علم ہے مانک بائی۔ ہمارے کے ہاں لڑکی سے ڈائریکٹ بات کرنے کا

دستور نہیں — آپ ڈنکی سے ہی دریافت کیجیے —"

چنانچہ مسز ڈھونڈی نفرتی تی کے پردفاتیل والا مصری پُوف کھینچ کر ڈنکی کے نزدیک جا بیٹھیں۔ دھیرے سے کہا "بے چارے بُوبی کی پہلی شادی چٹانوں پر گئی۔ دوسری بھی بہت کچھ آرزو کے لیے چھوڑتی ہے۔ بٹ تمہارا انکل وِکی کی سکنڈ میرج بہت اچھی جا رہی ہے۔ اب اپنا پنکی بولتا ہے اگر اُسکا کزن فیری اِدھر آجاتے۔"

"اِدھر۔ کدھر —" ڈنکی نے چونک کر پوچھا۔

"ادھر — یہ سائیڈ میں —"

"اوہ — ناممکن مانک کھالا۔"

"کیوں؟ ہاں یہ بات بر وبر ہے کہ فیروزہ کراچی، لندن، پیرس میں پلا بڑھا۔ لکھنؤ میں اُسکا جی کیسے لگے گا۔ پن —"

"یہ بات نہیں ہے مانک کھالا۔ بلکہ — بلکہ — نظریات، رویے، لائف اسٹائل مختلف ہو چکے ہیں۔"

"ایسا؟"

"علاوہ ازیں وہ ایک انگریز نوجوان سے شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں۔"

"ڈنکی — تم لوگ اپنا سگا والا سے شادی اپرُوو نہیں کرتا۔ انگلش چھوکرے سے اپرُوو کرتا —"

"وہ مسلمان ہوکر نکاح پڑھواتے گا۔ اُس نے یہ شرط منظور کر لی ہے۔"

"وہ تو سمجھے۔" مانک بائی نے ہونٹ پچکاتے۔ بمبئی والوں کا معنی خیز "سمجھے" ڈنکی نہ سمجھے۔

"اُوئی —" صفیہ سلطانہ نے زور کی چیخ ماری اور کاؤچ سے اچھل کر باہر بھاگیں۔ ڈنکی گھبرا کر اٹھے۔ ایک چھپکلی شاہ ایران کی تصویر کے پیچھے سے نکل کر ملکہ ایلزبتھ کی تصویر کے پیچھے کو رینگ گئی۔ برآمدے میں پہنچ کر صفیہ چلائیں "پنکی ڈنکی

—فلی — ارے تم لوگ کیا کر رہے ہو — اسے مارو — نکالو —"
ڈنکی باہر گئے۔ چھوٹی خالہ پہلے مراقی تھیں اب باقاعدہ سنک گئی ہیں۔

وہ برآمدے میں آویزاں گملوں کے نیچے بوکھلائی کھڑی تھیں۔
"چھوٹی خالہ۔ ہم نے تو نیوگنی میں چھپکلیاں اڑتے دیکھی ہیں' اور یہ مجیم شجیم ایگوانا —"
"پلیز — اسے مارو —"
"مانک کھالا کے ڈرائنگ روم میں کسقدر فرنیچر ٹھنسا ہوا ہے۔ چھپکلیوں سے معمور ہو گا یہ سارا گھر۔ کتنی ماریں گے اور اتنے سامان میں انھیں ڈھونڈیں گے کیسے؟ جب چیزیں بوسیدہ ہو جائیں اُن میں الائیں بلائیں رینگنے ہی لگتی ہیں۔"
"تم اینٹی کلچر ہو گئے ہو۔ مجھ سے بحث مت کرو۔ رہا بلاؤں کا معاملہ —
— بتاشن بوا کہا کرتی تھیں چھپکلیاں دراصل جنات ہیں۔ اس وجہ سے اُن سے ڈر لگتا ہے۔ اور یاد رکھو ڈنکی میں موت سے محض اس لئے خوفزدہ ہوں کہ قبر میں چھپکلیاں ہونگی —"
"چھوٹی خالہ۔ آئی ایم سوری —" ڈنکی نے نرمی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں واپس لے گئے۔

مسز ڈھونڈی مہاتما بدھ کے سامنے شمعیں جلا کر فرانسیسی دریچے میں چلی گئیں۔ اور غروب آفتاب کی زرتشتی دعا پڑھنے میں مشغول ہوئیں۔ پنکی، فلی، آمنہ اور مسٹر لال کا کا باہر جا چکے تھے۔ اور باغ میں ٹہل رہے تھے۔ کمرہ خاموش ہو گیا۔

ٹک ٹک ٹک — قدیم گرینڈ فادر کلاک۔
کھٹ، کھٹ کھٹ — دریچے کے باہر کھٹ کھٹ بڑھیا —
کھٹ کھٹ کھٹ — کہنہ چوبی زینے پر قدموں کی چاپ —

دریچوں کے رنگ برنگے شیشوں میں سے چھنتی روشنی کے منتشر شکر پارے فرش پر سے غائب ہو گئے۔

دفعتاً صفیہ کے اندر اسی آواز نے، جو برسوں سے اُن کو تنگ کر رہی تھی بہت دنوں بعد نمودار ہو کر کہا: "آداب عرض ہے۔" اُن کا رنگ فق ہو گیا۔ بُت سی بیٹھی رہیں۔ کئی ماہ سے یہ آواز خاموش تھی اس وقت یکایک اُس نے اپنی موجودگی کی یاد دلائی۔ چند منٹ بعد اُس نے سرگوشی کی "رگڑگئی —"

ڈنکی ان کے پاس آن بیٹھے۔ "چھوٹی خالہ آپ مجھے اینٹی کلچر کیوں سمجھتی ہیں؟"
"ہیں — ؟" وہ چونکیں۔ پھر جوش سے بولیں "ان پارسیوں کو دیکھو۔ ساری دنیا میں اُن کی تعداد گھٹتے گھٹتے السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا کی سرکولیشن سے کم رہ گئی مگر اب تک اپنی خصوصیات انھوں نے برقرار رکھی ہیں۔"

ڈنکی چپ رہے۔ یہ لوگ برقرار رکھنے کے چکر میں ہمیں کیوں پھنسانا چاہتے ہیں؟ یہ چاہتے ہیں کہ فیروزہ پنکی سے شادی کرے اور میں وکی ماموں کی لڑکی بیاہ لے جاؤں۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ رشتے دار ہیں؟ ڈنکی کو یاد آیا۔ ویزا کی مدت قریب الختم تھی۔ اُنکی امی پروین سلطانہ کپڑوں کی خریداری میں اسی طرح منہمک تھیں لیکن تابڑ توڑ بلاؤز نہیں سلواتی تھیں، وہ اور فیروزہ اب ایک سے ایک اسٹائلش شلوار قمیص پہنتی تھیں جن پر فرانسیسی ملبوسات کا دھوکا ہوتا تھا: "ہم لوگ اب واقعی ایک علیحدہ قومی شناخت رکھتے ہیں۔" فیروزہ نے آمنہ سے فخریہ کہا تھا۔ اب وہ پنکی سے شادی کر کے یہاں کیسے آسکتی ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے بڑی ذہنی اور تہذیبی کشمکش کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مگر جب وہ بحیثیت مسز براتن مور لینڈ انگلینڈ میں رہے گی تو کیا کوئی کشمکش — خیر یہ اُس کا ذاتی معاملہ ہے مجھ سے مطلب؟ بندہ اپنے لئے جو بہتر سمجھتا ہے وہی کرتا ہے۔

"شناخت اور تشخص تمہارا بڑا پروبلم ہے۔" پنکی نے کہا "ہم لوگ تو پہلے جو پہنا وا پہنتے تھے وہی اب بھی پہنتے ہیں۔ ہمارے طرزِ معاشرت میں کوئی ہوشربا انقلاب نہیں آیا ——"

"چوڑے پائینچوں کے مردانے پاجامے اور دوپلی ٹوپی ہا ہا!"

"اب سیاست لباس بھی ڈکٹیٹ کریگی؟"

"کیوں نہیں —— ؟ اتاترک نے اپنے لوگوں کو یوروپین بنایا۔ خمینی نے عورتوں کو پھر 'محجوب' کر دیا۔ خود تمہارے ہاں کھادی کا تعلق ہی سیاست سے تھا اور سارے چینی نیلا ٹیونک پہن رہے ہیں۔"

"یار ہماری امّی نے بڑے چاؤ سے تمہارے لئے شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ سلوایا ہے۔ اُن کا دل رکھنے کے لئے ہی سہی ——"

"ہاں بطور فینسی ڈریس پہن لینگے ——" فوراً افسوس ہوا — ایسا کھٹور جواب نہیں دینا چاہیئے تھا۔

ایک اور نکتہ ذہن میں آیا۔ "یار پنکی شناخت تمہارا ابھی تو مسلک بن گیا ہے۔ جس نوجوان کو دیکھو چہرے پر داڑھی۔ اور برقعے ہی برقعے ——"

دونوں نے ایک ایک پوائینٹ اسکور کیا اور مسکرائے۔

فلی کی چھوٹی بہن چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ مہناز ڈھونڈی نے کار لا کر عین دریچے کے نیچے روکی اور ہارن بجا کر پرانے انداز میں چلائی "ہلو۔ ڈِنگ ڈونگ ڈِنکی ——!"

بچپن میں ہر تیسرے سال جو ایک۔ ڈیڑھ مہینہ لکھنؤ آ کر گذارتے تھے وہ ہم سب کا مشترکہ خزانہ ہے اُسے برباد نہیں ہونا چاہیئے۔ ڈِنکی نے سوچا۔ باغ میں سے آمنہ کی آواز آئی "ہائی مہناز —— چلو آج شام ڈِنکی وِنکی کو نافتان اور ریشمی کباب کھلائیں اور کشمیری چاء —— ٹُو واش اِٹ ڈاؤن وِد۔"

مہناز کمرے میں آئیں۔ مسز ڈھونڈی نے پوچھا —— "پنکی فلی کا کھاتہ بانچا —— ؟ وہ تم کو کتنی بار گھنٹی کیا۔ جا کر پہلے اپنا منہ کرو —— تم زمین پر کسی چیز کی طرح نہیں لگ رہی ہو ——"

مہناز سمجھ گئیں۔ DO YOUR FACE FIRST. YOU ARE LOOKING LIKE NOTHING ON EARTH.

وہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے کی طرف دوڑیں دل بہار ربوا جو سامنے سے آ رہی تھیں۔ ایک اسٹول سے الجھ کر گر پڑیں۔

"آواز" نے کہا تھا "گر گئی"۔ جب کوئی بُری بات ہونے والی ہوتی آواز پہلے سے صفیہ کو مطلع کر دیتی تھی۔ اب معمولی واقعات سے بھی آگاہ کرنے لگی۔ وہ سہمی ہوئی بیٹھی رہیں۔ شیریں بائی، روڈا بائی مبتسم تھیں۔ گدھ۔ نہیں تو چھپکلیاں ——

اب وہ سب ہنسی خوشی باتیں کرتے موٹروں کی طرف جا رہے تھے۔ آمنہ نے پکارا "چھوٹی خالہ چلیے بھئی —— ابھی فیروزہ کو چھوٹے ماموں کے ہاں سے پِک اپ کرنا ہے۔"

"ہاتھ پر چھینٹ پڑ گئی تھی، مگلے میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ذرا طہارت کر آؤں۔"

"انکو طہارت کا بھی تو سودا ہو گیا ہے" آمنہ نے آہستہ سے ڈِنکی کو بتایا۔

"ممی چلو" فلی دہاڑے۔

"نہیں بابا لوگ —— تم جاؤ اپنے کو خوش کرو میرے کو ذرا کپ ہاؤس —— صفیہ کے سنگ چلی جاؤں گی۔"

مانک بائی ڈھونڈی نے تین کٹوری ہاؤس کو ہمیشہ کپ ہاؤس ہی کہا کہ آسان تھا۔

---

⑨ بوہیمین گرل

بوبی میاں کے گھر سے فیروزہ کو لیکر اترسوں شام جب وہ شیرمال خریدنے تحسین کی مسجد کی سمت جا رہے تھے۔ کشمیری محلے سے گزرتے ہوئے پنکی نے اپنی کزن کو مخاطب کیا: "ہمارے ہاں جو کشمیری چار بنتی ہے اصل کشمیری نژاد لوگ کہتے ہیں وہ چار کا ہیکو ہے۔ سالن ہے۔"

"میرے عزیز دوست برائے مورلینڈ کو" فیروزہ نے ذرا بے نیازی سے جواب دیا۔ "سبز چا بہت پسند ہے اور آم کا اچار۔"

پنکی کے لیے یہ اشارہ کافی تھا۔ متانت سے بولے ۔۔۔ "لندن کے انگریز تو اب سموسے اور تندوری چکن پر فدا ہیں۔"

اگلی صبح فیروزہ اور ڈنکی دن بھر کے لیے چھوٹے ماموں بوبی کے ہاں چلے گئے جو اپنی زوجہ ثانی کے ساتھ چریا جھیل پہ رہتے تھے۔ شہلا ہائی کورٹ روانہ ہوئیں۔ پنکی ریڈ روز سائیٹ پر گئے۔ ان کی شادی شدہ بہن آمنہ جو پاکستانی عزیزوں سے ملنے بمبئی سے آئی ہوئی تھیں اپنے بچوں کی دیکھ ریکھ میں لگی رہیں۔ تیسرے دن بھی۔ چوتھی صبح فیروزہ رِکی میاں کی بیٹی سلیمہ کے ساتھ خریداری کے لیے نکلیں۔ پھر توبی کے گھر چلی گئیں۔

رِکی میاں کی دلہن بہار آرا بیگم نے توشہ خانے کی کنجی نکالی۔

گزشتہ ہفتے بڑی نند زرینہ نے حکم دیا تھا اللہ نے چاہا تو بہت جلد

پنکی میاں دولہا بنیں گے۔ ذرا کپڑوں کو دھوپ دلوا دو۔

رانی دلہن کو علم نہ تھا۔ ترسوں شام مسز ڈھونڈی قصرِ شیریں سے آن کر طوطے کی طرح توپ کا گولہ داغ گئیں۔ فیروزہ تو ایک انگلش مین سے بیاہ کر رہی ہیں۔۔۔

الائچی خانم کی نواسی سابق گلشن خانم موجودہ رانی بہار آرا بیگم عرف رانی دلہن کسی گنتی میں نہ تھیں۔ جوان کو فوراً اس خبر سے مطلع کیا جاتا۔ اس وقت انھوں نے سونا کلی اور نورن کو آواز دی۔ کوری مارکین میں لپٹے گراں بہا ملبوسات صندوق سے نکلوا کر پچھلے دالان کے تختوں پر دھوپ میں پھیلائے۔ صحن میں جھاڑو دینے کے بعد بوڑھی انگوری آن کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور پچھلی شادیوں کے قصے دہرانے لگی۔

"ذرا بڑی بٹیا اور پینی باجی کو بلا لانا۔" رانی دلہن نے نُورن سے کہا۔

زرینہ سلطان اپنی منجھلی بہن پروین اور بھانجی فیروزہ کی نالائقی اور بے مروّتی سے ازحد نالاں اور پژمردہ تھیں اور پنکی کے برعکس انھوں نے اپنی کدورت چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ بھلا کیوں کرتیں۔ شکایت اپنوں ہی سے ہوتی ہے۔ وہ باہر آ کر ایک تخت پر ٹک گئیں بے دلی سے جوڑے الٹنے پلٹنے لگیں۔

پروین اپنے کمرے سے نکلیں۔ کرسی پر بیٹھ کر چند پرانے جوڑوں کا جائزہ لیا۔ "اماں حوا کے زمانے کا سامان! ہمارے ہاں تو کپڑے تین چار بار پہنے اور گٹھڑی میں باندھ کر پھاٹک پر رکھ دیتے ہیں۔ جو چاہے اٹھا کر لے جائے یا غریب رشتے داروں کے لیے انڈیا لے آتے ہیں۔"

زرینہ نے سر اٹھا کر بہن کو دیکھا۔

"پروین تم بھی اس قسم کی گفتگو کرنے لگیں افسوس۔"

پروین نے ذرا شرمندہ ہو کر ایک گل دوز کارچوبی دوپٹے پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ بنکی میاں کی بَری ابھی مکمل نہیں ہے۔" رانی دلہن نے مستعدی سے تبلایا۔ پروین اور بھینپیں۔ بَری تو انہی کے گھر جانے والی تھی۔ بات ٹالنے کو فوراً بولیں۔

"اتنا لاجواب کام۔ گویا مینا کاری۔ سوائے لکھنؤ کے اور کہاں۔ اس مصالحے کا جوڑا ہمارے ہاں پندرہ ہزار میں تیار ہو۔ یہاں تو چار پانچ ہزار ہی میں بن گیا ہوگا۔ افلاس کی وجہ سے کاریگری یہاں اتنی سستی ہے۔"

زرینہ خاموش رہیں۔ پروین نے سوچا شاید میں نے پھر غلط بات کہدی — بھاوج کو مخاطب کیا۔ "ارے دلہن بھابی یہ تو بڑا خوبصورت غرارہ ہے۔ ایسا ہی شہلا کے بیاہ کے لیے سلوائیے گا۔"

بہار آرا بیگم بات چیت میں بہت کم حصہ لیتی تھیں۔ ریذیڈنٹ نند زرینہ کے سامنے تو بالکل سٹی گم رہتی تھی۔ دبی زبان سے کہا۔ "بیرسٹر صاحبہ؟ وہ بیاہ کی حامی تو بھریں۔"

"کسی ہندو سے کرلیں گی۔" پروین نے آہستہ سے جواب دے کر ہونٹ بچکائے۔ زرینہ نے سُن لیا، مرچیں لگ گئیں۔ تنک کر بولیں۔ "پروین سلطانہ یہ تم کہہ رہی ہو۔ یاد کرو اسی جگہ بیٹھ کر اماں مرحومہ سے گلہ کرتی تھیں۔ جب نئی نئی یہاں سے گئی تھیں کہ وہاں پر لوگ جب انڈین مسلم لڑکیوں کی ہندوؤں سے شادی کے متعلق مبالغہ آرائی کرتے ہیں تم کو کتنا صدمہ ہوتا ہے۔ تعجب ہے تم بھی بدل گئیں۔"

بے چاری رانی دلہن اپنی دونوں جغادری نندوں کی جنگ سے نروس ہو کر اٹھیں اور پھرتی سے باورچی خانے کی طرف سرک لیں۔

شعلہ جوالہ زرینہ نے بات جاری رکھی ——

"تمہیں احساس ہی نہیں کہ یہاں شروع شروع میں شرفا کی ہجرت کے بعد باقیماندہ کی لڑکیوں پر کیا بیتی —— انکے لیے رشتے غایب ہوگئے۔"

"یہ شکایت سنتے سنتے کان پک گئے۔ سات فاقوں پر بھی یہیں پڑے رہتے؟"

"سبھی تو فاقے نہیں کر رہے تھے۔ آدھی سے زیادہ سروس جنٹری بھی روانہ ہوگئی۔ کوئی گلہ نہیں ہے۔ غدر کے بعد مغل شہزادیوں کو نانبائیوں اور سائیسوں سے بیاہ کرنے پڑے تھے۔ یہاں تو ہمارے سامنے سنہ سینتالیس کے بعد درزی اور جولاہے اشراف کے داماد بنے۔"

"اسلام میں کاسٹ سسٹم نہیں ہے۔ عربستان میں تو آجتک درزی اور قصائی اپنے نام کے آگے فخریہ ——"

"اوہو۔ تم اتنی جمہوریت پسند کب سے ہوگئیں؟ قصبات میں جاکر دیکھو شرفا کی بن بیاہی بٹیاں اپنے باپ دادا کی آن سنبھالے بیٹھی ہیں۔ بوڑھی ہوگئیں۔ اسکولوں میں پڑھا رہی ہیں۔"

"انہی مصیبت زدہ شرفا میں سے ایک کی لڑکی تو آپکے دولتخانے پر آئی تھی۔ آپ لوگوں نے اسکے ساتھ کیا کیا؟"

"کیا کیا؟ میں نے اسے بھاوج بنانا چاہا۔ تم نے یوپی سے ملکر بھانجی ماری۔"

"دل سے تو آپ بھی وہ رشتہ نہیں چاہتی تھیں بجیا۔"

"بھلا کیوں؟"

"وکی نگھرے رہتے تو اپنی جایداد آپکی اولاد کے لیے چھوڑجاتے بنکی کو اپنا وارث بناتے۔"

"توبہ توبہ۔ پروین۔ خدا سے ڈرو۔"

"رہی چاندنی کے سلسلے میں میری مخالفت تو جب میری اتنی عمر نہیں تھی کہ معاملات کی گہرائی میں جاؤں۔"

"اتنی سمجھ تو تمہارے اندر اب بھی نہیں ہے۔"

"شکریہ۔ تسلیم۔ اور نہ مجھے اسکا احساس تھا کہ وِکی آسے اتنا چاہنے لگے ہیں۔ ہم لوگوں نے تو انہیں ہمیشہ نیم دیوانہ ہی سمجھا۔ نہ اس کم بخت نے اپنے بارے میں بتلایا۔ ایک بار کچھ اپنے نانا کے جامہ وار کے شامیانے کا ذکر کیا تھا تو میں نے جھڑک دیا۔ کہ زیٹ نہ ہانکے۔ اسکے بعد وہ بالکل چُپ رہنے لگی تھی۔ یہ تو ہمیں آج تک نہیں معلوم ہوا نہ آپ لوگوں نے کبھی تفصیل سے پتہ چلانے کی پرواہ کی کہ وہ کون تھی۔ خوامخواہ ہی جل کر راکھ ہو گئی۔ اور بجیا اب دنیا دیکھنے کے بعد عمر کے ساتھ ساتھ مجھے عقل آئی ہے۔ اور آپ بھولتی ہیں کہ میں نے تو اسے امریکہ لے جانا چاہا امّاں نے منع کر دیا۔"

"ہم سب ساری زندگی اپنی غلطیوں اور خامیوں کے لیے دوسروں کو ملزم ٹھہراتے ہیں۔ یہ بشریت کا تقاضا ہے۔"

"وِکی اپنے بیوی بچوں میں خوش ہیں —— اور کیا چاہیے۔ چاندنی غریب اپنی زندگی ہی اتنی لکھا کر لائی تھی۔"

"یہ ذکر تو بی بی تم ہی نے نکالا۔ رہا یہ کون اپنے لیے کیا لکھوا کر لایا ہے یہ کسے معلوم۔ صفیہ اسکول میں تھیں ایک بار امّاں ان کے لیے بنارسی دوشالہ خرید رہی تھیں دوکاندار نے کہا —— رانی صاحب لے لیجیے بہت چلے گا امّاں نے جواب دیا اسے دُوئی کیا ساری عمر اسے یہی نگوڑا دوشالہ اوڑھنا ہے۔ وہ فوراً بولا نہیں رانی صاحب۔ ساری عمر کیوں۔ بٹیا اپنے گھر جائیں گی۔"

"مارے کنجوسی کے صفیہ وہی اب تک اوڑھے پھرتی ہیں۔" پروین نے ہنس کر کہا۔

دونوں کو چھوٹی بہن کی نکتہ چینی میں بھی بہت لطف آتا تھا۔

"منجھلے ماموں مرنے سے پہلے انکے لیے بھات بھی بھجوا گئے تھے سارا سامان گودام میں مقفل پڑا ہے۔ مجال ہے جو صفیہ نے ایک چیز نکلوا کر آمنہ کے جہیز میں لگائی ہو۔"

—— زرینہ سلطانہ دوبارہ زیر بحث موضوع پر لوٹیں۔ "وہ زمانے لد گئے جب یہاں برسر روزگار مسلمان لڑکوں کا قحط پڑ گیا تھا۔ بلکہ اب تو والدین اپنی لڑکیوں کو تمہاری طرف بھیجنا نہیں چاہتے۔ ویزا پاسپورٹ کی دقتیں اور خدا نخواستہ لڑائی چھڑ جائے تو راستے بند۔ نہ خط نہ پتّر۔ دو دفعے ان حالات کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں۔ اور امن کے دنوں میں کون آسانی ہے۔ ماں باپ کے آخری وقت میں بیٹی ان کی صورت دیکھنے کے لیے پہنچ نہیں پاتی۔ وہ تو کہو سنہ اکہتّر کے بعد اُدھر کے راستے بند ہوئے تو دوسری راہیں بھی کھُل گئیں۔ اللہ تعالیٰ سارے زمانے ایک سے نہیں رکھتا۔" پہلو بدلا۔ پاؤں اٹھا کر تخت پر رکھے۔ "بہنی بیگم! صفیہ کے لیے بھی خوب خوب پیغام آئے۔ ان کے ہاتھ کی معذوری کے باوجود۔"

"انھیں قنبر علی کا سوگ منانے سے فرصت نہیں تھی؟ اتنا یک طرفہ عشق کیوں ہو گیا تھا؟" پروین بھی مقابلے پر ڈٹی رہیں۔

"عشق؟ توبہ لاحول ولا۔ شریف زادیاں عشق کرتی ہیں؟"

"ارے بجیا مجھے سب پتہ ہے جو پیغام ان کے لیے لوپی کے ذریعے آئے وہ آپ سب نے لوپی ہی کی مخالفت میں رد کیے۔"

"بالکل غلط۔ صفیہ بیگم نے خود اعلان کر دیا کہ وہ نگوڑی اندرونی آواز انہیں منع کر رہی ہے۔ دو رشتے کینیڈا سے آتے تھے۔ بولیں ہوائی جہاز پر نہ جاؤنگی۔ اب ان کے لیے سمندری جہاز کس طرح چلوایا جاتا بھئی۔" زرینہ کا چہرہ غصّے سے تمتما رہا تھا۔ "اور تم اب کس منہ سے ہندو سے شادی کا طعنہ شہلا کے لیے دیتی ہو —— تمہارے ہاں کتنی لڑکیوں نے عیسائی یہودی امریکنوں انگریزوں سے بیاہ کر لیے۔ ہاں نہیں تو۔"

"وہ کافر نہیں۔ مشرک ہی تو ہیں۔ اہل کتاب۔"

"اہل کتاب سے مسلمان عورت کا بیاہ جائز ہے؟"

"وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں۔"

"اور تمہارے ہاں بھی انگریز داماد آنے والا ہے۔"
"وہ کلمہ پڑھ کر نکاح کرے گا۔"
"دل سے مسلمان ہوگا؟"
"دلوں کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے۔"
"یہ کہو جیت بھی تمہاری پٹ بھی۔"
"خیر ہوگا۔"

صفیہ اوپر سے اتریں۔ دریں کھڑے ہو کر بڑی بہنوں کا مچیٹا سنا کیں۔ دھیرے سے بولیں "آئیے ادھر چل کر بیٹھیں۔"
تینوں پہلو کے برآمدے میں پہنچیں۔ سامنے مختصر بارہ دری اور کدم کا جھرمٹ اترتی دھوپ میں پیلا ہوگیا۔ اسی برآمدے میں ان ہی کرسیوں پر بیٹھ کر گزشتہ برسوں میں بڑے بڑے رشتے جوڑے اور توڑے گئے۔

اسی جگہ سے آدھی رات کو گومتی کے اس پار فرزاں ریڈ روز کا نظارہ کیا تھا۔
ندی کنارے دھواں اٹھت ہے کیا جانوں کیا ہوتے
جیہہ کے کارن بھئ جو گیا وہی نہ جلتا ہوتے
کیوں صفیہ سلطان کیسی رہی۔ یہ نارمل لوگ اپنے قصوں ہی میں مگن ہیں۔

زرینہ دو تین دن سے بھری بیٹھی تھیں اب کہنے پر آئیں تو کہتی چلی گئیں "تمہاری صاحبزادی نے بنکی کے لیے انکار کیا۔ تم سلیمہ کے لیے آمادہ نہ ہوئیں۔ پروین تم بھی غرور میں اماں مرحومہ سے کم نہیں۔ ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ سے بڑے آدمی کی بی بی ہو۔ آتو جی کی پرنواسی کو بہو بنا کر کیسے لے جاتیں۔ لیکن تم یہ بھول گئیں کہ وہ راجہ صاحب تین کٹوری دکی میاں کی بیٹی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ ایسی نیک گائے

تم کو کہیں نہ ملے گی۔ اپنی ماں کی طرح بے زبان۔ ڈاکٹریٹ بھی کر رہی ہے۔"
"یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی گائے۔" صفیہ نے لقمہ دیا۔
پروین زیر لب مسکرائیں۔ "کیا موضوع ہے؟" انھوں نے صفیہ سے پوچھا۔
"لاغر بھسا دلی۔ حیات اور کارنامے۔"
پروین نے قہقہہ لگایا۔ آمنہ نے اندر سے جھانکا۔
"او ہو امی۔ منجھلی خالہ۔ چھوٹی خالہ۔ تینوں ـــــ ماشاء اللہ!"
"ـــــ ہاں۔" صفیہ نے جواب دیا۔ "بقول بوبی میکبتھ کی چڑیلیں۔"

بوبی فیروزہ کو لاکر پھاٹک پر اتار گئے۔ وہ اپنے بھائی بہنوں سے ناراض تھے۔ اندر نہیں آتے تھے۔ فیروزہ اپنے انکار کے بعد زیادہ سے زیادہ اس گھر سے باہر رہنا چاہتی تھیں۔ بڑی خالہ خفا۔ بنکی مصنوعی طور پر بشاش۔ ڈِنکی خاموش۔ وہ خود نادم۔ ماموں کی بیوی بے چاری کسی شمار و قطار ہی میں نہیں تھیں۔ فیروزہ کو ان سے بہت ہمدردی تھی مگر وہ نہایت مطمئن اور سکھی زندگی گزار رہی تھیں۔ ریذیڈنٹ نند کی تابعداری (جو وکی سے صرف دو سال بڑی تھیں) شوہر کی خدمت بچوں کی پرورش گھر کی دیکھ بھال۔ عورت کو اور کیا چاہیے۔ ذرا صفیہ کو دیکھو کیا گت بنی ہے۔ اور شہلا ہیں کہ کالا جبہ پہنے دن بھر عدالت میں جھائیں جھائیں شام کو پھر موکلوں سے۔ توبہ۔

"السلام علیکم ممانی جان۔" فیروزہ نے دالان میں پہونچ کر آواز دی۔
تخت پر ملبوسات پھیلے ہوئے تھے۔ فوراً دلچسپی سے دیکھنے لگیں۔
"غرارہ؟"

"جی ہاں گھرسواں پاجامہ۔ پہلے بھی پہنے جاتے تھے۔" نُورن نے کہا۔

"اور یہ جو بڑی خالہ اور ممانی وغیرہ پہنتی ہیں؟"

"چھُٹا پاجامہ۔ کھڑا پائینچہ۔ یہ تو پہلے لونڈیوں باندیوں کا پہناوا تھا۔ بلکیا نے میں گھرسواں۔" نُورن نے جواب دیا۔

"بلکیانہ کہاں ہے؟"

"بلکیانہ — بٹیا جیسے آپ لوگ — امیر لوگ —"

"ممانی دلہن آپ میرے لیے گھرسواں بنوا دیں گی؟"

"ضرور۔ ماہی پشت؟ کہنی کی گوٹ؟ گلوری؟ چٹا پٹی؟"

فیروزہ بڑبڑائیں۔ "ٹپیکل انڈین مسلم ویڈنگ۔"

"امام ضامن سے شروع کرو۔ تومانجھا۔ ساچق۔ شہانا جوڑا۔ مانگ بھرائی۔ آرسی مصحف۔ پہلے سقوں کا چھڑکاؤ۔ باہر کشمیری گھوڑا چھوڑتے ہیں —"

"وہ کیسے؟"

"اندر مریاسنین۔ تاروں کی چھاؤں میں رخصتی۔ شہدے دولہا میاں کے ہاں تڑکے ہی پہونچ کر دعاؤں کی بوچھار کر دیتے ہیں۔"

"اگر جلدی سے انھیں انعام دے کر ٹالیں نہیں تو لپیٹ لپیٹ کر وہ گالیاں — وہ گالیاں —" نُورن نے کہا۔

"ہاں لیکن شائستہ گالیاں۔" رانی دلہن نے اضافہ کیا۔

"شہدے اب بھی مل جائیں گے؟"

"جی ہاں بٹیا پرانے سعادت گنج میں۔" نُورن نے کہا۔

"فیروزہ کیا تم کوئی ٹیلی ویژن فلم بنا رہی ہو؟" رانی دلہن نے پوچھا۔

"لندن ٹیلی ویژن والوں کا ارادہ ہے۔"

"تمہارا بھی تو خیر سے بیاہ ہونے والا ہے؟ پنکی میاں سے نا؟"

"جی نہیں۔ وہی۔"

"اوہ — اچھا۔" پچیس سال اس گھر میں گزار کر رانی دلہن نے ڈپلومیسی بھی خوب سیکھ لی تھی۔ چند لمحوں بعد پوچھا "کون ذات ہیں؟ مہاجر، پنجابی، پٹھان؟" منجھلی نند پروین سلطانہ کے ہاں کراچی ہو آئی تھیں اور وہاں کی تازہ ترین سیاسی صورتِ حال سے واقف تھیں۔

"جی نہیں۔"

"سندھی؟"

"جی نہیں۔"

"بنگالی تو اب ہو نہیں سکتا — اچھا — بلوچ —؟"

"جی نہیں — انگریز —"

"انگ — ریز —" بہار آرا بیگم کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اب یہاں سے کھسکنا چاہیئے۔ اپنی شادی ہی کے سلسلے میں ایک ضروری بات وِکی ماموں سے کرنا تھی۔ ان کو ڈھونڈا جائے۔ فیروزہ اٹھ کر پہلو کے برآمدے میں گئیں۔ ماں، دونوں خالائیں اور آمنہ اندر جا چکیں۔ نُورن نے بارہ دری میں جا کر بتی جلا دی۔ وِکی گویا اسی سگنل کے منتظر تھے۔ اپنے کُتبخانے سے برآمد ہوئے۔ ایک خدمتگار کاغذات اور کتابیں اٹھا کر لایا۔

سفید ریش وِکی میاں عموماً زیادہ وقت سمن زار میں گزارتے تھے۔ مالی سے تبادلۂ خیالات۔ باغبانی اور علم نباتات کی کتابوں کا مطالعہ۔ اور بھی جانے کیا کیا پڑھا کرتے تھے۔ گھر بیٹھے سنسکرت اور عبرانی سیکھ چکے تھے۔ چالیس ہزار حرف تہجی نہ ہوتے تو چینی بھی سیکھ لیتے کہ لاؤ زے کی زبان تھی۔

اب وہ رات گئے تک وہیں بیٹھے رہیں گے۔ گویا بید مجنوں سے گھرے پویلین میں فنا فی الفلسفہ کنفیوشس۔

فوراً اندر گئے قرآن شریف کے چند تراجم ادب سے اٹھا کر لائے۔
فیروزہ دبے پاؤں نزدیک پہونچیں۔ "السلام علیکم ماموں جان۔"
"وعلیکم السلام جیتی رہو۔ بیٹھو۔ دن بھر کہاں غائب تھیں؟"
"چھوٹے ماموں کے ہاں۔ پھر ممانی دلہن نے کپڑے نکالے تھے وہ دیکھ رہی تھی۔ کھڑا پائینچہ —!" وہ محظوظ ہو کر مسکرائیں۔
"تم کو تو یہ سب فینسی ڈریس لگتا ہوگا۔"
"جی نہیں ماموں میاں ایسی بات تو نہیں ہے۔ دراصل میں اسی سلسلے میں آپ سے ایک درخواست کرنی چاہتی تھی۔"
"بجیا سے پوچھ کر جو چاہو لے جاؤ — ہم نے تمہارے لیے زیورات بھی محفوظ کر رکھے ہیں ہم بھات لے کر کراچی آویں گے نا جب تم —"
"بھات کیا ماموں؟ دال بھات لے کر کراچی نہ آئیں۔ لوگ ہنسیں گے۔"

یہ بچی اور ہم دو مختلف اصطلاحات میں گفتگو کر رہے ہیں۔

"اچھا ہاں۔ بتلاؤ۔"
"ماموں جان بات یہ ہے کہ —"

"آداب بڑے ماموں۔ ہلو فیری۔"

پنکی سامنے کھڑے تھے۔ روشن روشن سے۔ کھلے دل والے۔ عالی ظرف

کیسے اچھے ہیں مگر — نہیں — ناممکن۔ اب تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لندن کے اخباروں میں برائین سے منگنی کا اعلان تک ہو چکا ہے۔

"جیو میاں۔ اور تم کہاں سے آتے ہو۔ افتاں وخیزاں۔ ملول و رنجور؟"

بید کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جاپانی پودوں کے متعلق تبادلۂ خیال کیا جو سکندر باغ سے منگواتے تھے۔ کچھ کہنا چاہا مگر ہمت نہ پائی۔ بہت اداس تھے۔ فیروزہ نے محسوس کیا اس وقت یہ اداسی برائین مورلینڈ کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ ماموں کے متعلق فکرمند تھے۔ ان سب کو ماموں سے کتنی محبت تھی۔

"ماموں میاں کیا پڑھ رہے ہیں؟" دونوں نے تقریباً بیک زبان کہا۔

"ہیں — ہ؟" وہ چونکے — "یہ — یہ چند آیات کریمہ کے تراجم و تفاسیر کا تقابلی مطالعہ۔ تم لوگوں کو دلچسپی ہے؟"
"جی ہاں۔ جی ہاں —" ان کے بھانجے بھانجی ایک ساتھ گرمجوشی سے بولے۔
اس وقت فیروزہ نے خود کو اپنے کزن کے ساتھ خون اور دردمندی کے اٹوٹ بندھن میں بندھا پایا۔
انمول خزانوں میں ساجھا — مگر نہیں — خیر —

ڈکی ماموں کہہ رہے تھے: "یہ دیکھو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن پارہ ۲۹۔ آیت ۲۸ اِذَا شِئۡنَا بَدَّلۡنَاۤ اَمۡثَالَهُمۡ تَبۡدِيۡلًا —
"مولانا لکھتے ہیں اس فقرے کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ہم جب چاہیں انہیں ہلاک کر کے انہی کی جنس کے دوسرے لوگ ان کی جگہ لا سکتے ہیں۔ جو

اپنے کردار میں ان سے مختلف ہوں۔ ۲۔ ہم جب چاہیں ان کی شکلیں تبدیل کر سکتے ہیں یعنی جس طرح ہم کسی کو تندرست اور سلیم الاعضا بنا سکتے ہیں اسی طرح ہم اس پر قادر ہیں کہ کسی کو مفلوج کر دیں۔ کسی کو لقوا مار جائے اور کوئی کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہم جب چاہیں موت کے بعد ان کو دوبارہ کسی اور شکل میں پیدا کر سکتے ہیں۔"

"ارے ــ یہ تو وہ نہیں ہے؟ کیا اسے کہتے ہیں ــ"

"آواگون ــ" پنکی نے فیروزہ کی مدد کی۔

"معلوم نہیں مولانا کا کیا مطلب ہے۔ مگر یہ تیسری بات ہم کہتے تو لوگ ہماری ٹھکائی کر دیتے۔"

"آپ آواگون کو مانتے ہیں؟" پنکی نے دریافت کیا۔

"بالکل نہیں۔"

چاند طلوع ہو چکا تھا۔

"اب نہ پڑھئے۔ یہ بلب خاصا مدھم ہے۔"

"ہم تو چاندنی میں پڑھ سکتے ہیں۔ ہماری بینائی اتنی تیز ہے۔ اور قرآن کی چاند کی روشنی میں تلاوت کی جائے۔ واہ کیا لطیف نکتہ ہے۔" انھوں نے خود اپنی داد دی۔ ان کو سراہنے والے بہت کم تھے۔

"پونم کا چاند۔" پنکی نے کہا۔

"پونم کیا ــ؟ پونم ڈھلون؟"

"یار۔ یو آر ویری اسٹوپڈ۔"

وہی ہمسن رشتے داروں والی پرانی مانوس بے تکلفی پنکی بھی بھول گئے کہ فیروزہ کے انکار کے بعد سے ان کے درمیان کھنچاؤ برقرار رہنا چاہیے۔

موسم، فضا، ماحول، وقت کی پرچھائیاں، بڑی کرامتیں دکھلاتی ہیں۔

"رجیسی مُون!" دکی میاں نے اوپر دیکھا۔

ہوا خوشبوؤں کا ریلا ساتھ لائی۔

"اس سامنے والے چبوترے پر بیلا نے گایا تھا ــ بیلا پھولے آدھی رات ــ بہت واہ واہ ہوئی ــ اس رات بھی چاندنی خوب چھٹکی تھی ــ"

شب ماہ کی کرشمہ سازی ــ

"چاندنی باجی نے اسی بارہ دری میں آدھی رات تک بیٹھ کر میرے لئے کارڈیگن ختم کیا تھا جب ہم لوگ کراچی واپس پہنچتے ہی امریکہ جانے والے تھے۔" فیروزہ نے کہا۔ "بڑے ماموں امی بتلاتی ہیں کہ چاندنی باجی سے بھی تو انہی دنوں آپ کے لئے بات چلی تھی۔ اسے کیا کہتے ہیں۔ سلسلہ جنبانی۔ اگر وہ ریڈ روز نہ جاتیں۔ تو زندہ بچ جاتیں۔"

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا ــ "ہاں بھئی ــ تم کچھ بتلانا چاہتے تھے۔"

"کچھ بھی تو نہیں ماموں میاں۔"

"ہم سے نہ اُڑو ــ"

تذبذب میں رہے۔ پھر ہچکچا کر بولے ــ "آج ہم دھینا پہری کے پُل سے گزر رہے تھے۔ زنانوں کی ایک ٹکڑی نظر آئی ــ انہوں نے کہا

سلوچنا کی موت کے بعد ان کے جانشین مدھوبالا بمبئی چلے گئے اور میم صاحب عرصے سے لاپتہ ہیں۔"

"سارا قصور محض ہمارا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو جب وہ یہاں سے بھاگیں ہم اپنے حواسوں میں نہ تھے۔"

"میگی ممانی کے فرار کو کتنے برس گزرے؟"

"پورے تیس۳۰۔"

"تو اب تک وہ کہاں باقی ہونگی۔ اگر وہ سالویشن آرمی والوں کے ہاں سے پھر نکل بھاگیں تو اس مفلس خانہ بدوشی کی صعوبتیں کیسے جھیل پائی ہونگی۔"

"وہ بچپن سے اس طرزِ حیات کی عادی تھیں۔"

"— ؟؟ امی تو کہتی ہیں وہ کسی انگلش وائی کاؤنٹ کی لڑکی تھیں اور یونیورسٹی سے لوٹتے میں آپکو چیرنگ کروس اسٹیشن پر ملی تھیں۔"

"درست۔ لیکن ان کی ماں جپسی تھیں۔"

"جپسی ؟ یہ تو بالکل وہ بوہیمین گرل والا اوپرا ہو گیا جس میں کسی بوہیمین ڈیوک کی بچی کو اسکے قلعے سے جپسی چرا کر لے گئے تھے !!"

چاند بارہ دری پر چمکنے لگا۔ گرڈھل اور چاندنی کا کنج روشن ہوا بالمقابل میں استادہ برجیوں والا مکان ایسا لگا جیسے کینوس کے پردے پر پینٹ کیا گیا ہو۔ "دی بوہیمین گرل[۱]" کا اسٹیج۔

---

[۱] : آیرش کمپوزر مائیکل ولیم بالف کا تخلیق کردہ بیلیڈ اوپرا جو پہلی بار ۱۸۴۳ء میں لندن میں پیش کیا گیا۔ اور اس کا ایک گیت بےحد مقبول ہوا۔

"آپ چیرنگ کروس اسٹیشن پر —" پنکی نے یاد دلایا۔

"ہاں" وِکی چونکے۔

"وہ بھی یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں ؟"

"وہ اسٹیشن کے باہر کھڑے ہو کر گاتی تھیں!"

"ارے —!!" پنکی اور فیروزہ نے پھر ایک ساتھ کہا۔

"انکا بھائی اکارڈین بجاتا تھا۔ اپاہج ماں بیساکھی کے سہارے کھڑی رہتی تھی۔ ہاتھ میں جنگلی پھولوں کی ٹوکری جب ٹرین کے مسافر اور راہگیر انکی ٹوپیوں میں سکّے ڈالتے وہ ایک ایک پھول انکو تھما دیتی۔"

"مگر آپ نے تو ابھی کہا کہ ایک وائی کاؤنٹ کی بیٹی تھیں۔"

"پوتی۔ کسی وائی کاؤنٹ کے اوباش لڑکے کی نیچرل اولاد۔ ماں جپسی تھیں۔ بے انتہا حسین۔ کسی معمولی میوزک ہال میں کورس گرل بھی رہ چکی تھیں۔"

"پھر —؟ پھر کیا ہوا ؟" اب پنکی اور فیروزہ وہ ننھے بچے تھے جو اسی بارہ دری میں رات کے وقت نانامیاں سے کہانیاں سُنا کرتے تھے۔

"ایک روز کلاس سے لوٹ کر ہم چیرنگ کروس اسٹیشن پہنچے شکستہ برساتی اوڑھے ایک اُداس صورت لڑکی کو گاتے سنا۔ وہ بوہیمین گرل ہی کا مشہور گیت گا رہی تھی۔

I DREAMT THAT I DWELT IN MARBLE HALLS
WITH VASSALS AND SERFS AT MY SIDE.
I HAD RICHES TOO GREAT TO COUNT
AND A HIGHIESH ANCESTRAL NAME,
I ALSO DREAMT THAT PLEASED ME MOST
THAT YOU LOVED ME STILL THE SAME.

ہم نے ایک خانہ بدوش بھکارن کو سہارا نہیں دیا تھا ؟ "
" مگر آپ انکو اتنا پیٹتے کیوں تھے ؟ "
" ارے بھئی ذہنی توازن ہمارے اندر رہا نہیں تھا۔ لوگ سمجھتے تھے ہم تین کٹوری کا خاتمہ نہیں سہار پائے ۔ یہ بات ہرگز نہیں تھی۔ اس سارے برصغیر کے سیاسی معاملات نے ہمارا دماغ ہلا دیا تھا۔ بیرونی دنیا سے SANITY رخصت ہو رہی تھی ـــــ گھر کے اندر جب بیوی بیوقوفی کی باتیں کرتیں تو جھنجھلا کر مار بیٹھتے تھے۔ چھوٹے بچوں کو پیٹتے ہی تو ہیں۔"

" لوگوں نے اُڑا دیا کہ آپ سادیت پسند ہیں۔"
" لوگ جو چاہیں اڑائیں۔ لیکن ہم نے اتنا دِق نہ کیا ہوتا تو وہ نہ جاتیں۔"
" انسان حالات سے تنگ آ کر بھاگ نکلتا ہے۔" فیروزہ نے کہا۔ " نانا میاں سے کہتیں کہ انہیں وطن بھجوا دیں۔"
" ـــــ میاں ابّا کو وہ کوئی دیو سمجھتی تھیں امّاں کو دیونی۔ انکی شکل دیکھ کر ہی میگی کی روح فنا ہوتی تھی ۔ بچّوں کی طرح سہمی دُبکی اپنے کمرے میں چھپی رہتی تھیں۔ کہیں آنے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ ورنہ سوسائٹی میں انکا مذاق بنتا۔

" اور ہماری دونوں بد دماغ بہنیں ـــــ بنّی معاف کرنا تمہاری والدہ اور چھوٹی خالہ۔ میگی سے انہوں نے کبھی سیدھے مُنہ بات نہیں کی۔ ہمیشہ گھڑکی جھڑکی ڈانٹ پھٹکار۔ بنّی کیا تم ان کو بالکل بھول گئے ؟"
" ہم بہت چھوٹے تھے ماموں میاں اتنا یاد ہے وہ کبھی کبھی ہمیں انگلش گانے سنایا کرتی تھیں۔"
" ہاں۔ اور اپنی مخصوص جپسی بولی کا ایک گیت۔ خانہ بدوش عہدِ وسطیٰ میں شاید کالی دیوی کی مورتیاں بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے یورپ میں سیاہ فام

" ایسی سُریلی پاٹ دار دلدوز آواز تیر کی طرح ہمارے دل میں اتر گئی۔ ـــــ ہم نے ایک پاؤنڈ اس کے بھائی کی ٹوپی میں ڈال دیا۔ پھر ہم اکثر وہاں جانے لگے۔ اور اس بے چاری لڑکی سے وہی گیت سنتے۔
" ان تینوں سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ فرصت کسے تھی۔ اور انگلستان میں بھی خانہ بدوش آؤٹ کاسٹ سمجھے جاتے ہیں۔ اُچکّے۔ اٹھائی گیرے۔ جرمنی کے ان گنت بے چارے جپسیوں کو تو ہٹلر نے گیس چیمبرز کی نذر کر دیا تھا۔"
" بڑے ماموں۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ پیرس میں آج کل یوگوسلاویہ سے بھاگی ہوئی مسلمان جپسی لڑکیاں چوری چکاری کرتی پھر رہی ہیں۔ کیا یہ لوگ بھی یوگوسلائن مسلمان تھے ؟" فیروزہ نے پوچھا۔
" نہیں برٹش جپسی۔ غالباً آئیرش۔"
" آپ کو میگی سے عشق ہو گیا تھا ؟"
" ارے نہیں بھئی۔ محض ہمدردی۔ چنانچہ ہم انہیں اپنی سکنڈ ہینڈ مورس مائنر میں بٹھال کر ووکنگ لے گئے اور عقد پڑھوا لیا۔ ان کی ماں بہت خوش ہوئیں۔ لیکن کہنے لگیں یہ لڑکی پیدائشی کم عقل ہے۔ اس کا مجھ سے بھی زیادہ بُرا حشر ہوگا۔ اسے یہیں نہ چھوڑ جانا۔ ہم نے کہا نہیں ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے ـــــ میاں ابّا نے ہمیں قانون پڑھنے کے لیے بھیجا تھا مڈل ٹمپل میں ضابطے کے ڈنر کھا آتے تھے اور مارے مارے پھرتے تھے۔ واپسی کی تیاری کی۔ وہ اپنے ارسٹوکریٹ دادا کے ماربل ہالز تو کبھی نہ پہونچ پائیں بطور تلافی ہم ان کو اپنی اس چھوٹی سی محل سرا میں لے آئے ـــــ ہم دیوانے تھے ہم سے توقع بھی تھی کہ ولایت میں اس قسم کی کوئی حرکت کر بیٹھیں گے۔ ہم نے میاں ابّا اور امّاں سے کہا کہ یہ وائی کاونٹ فلاں کی پوتی ہیں تو ان کے ذرا آنسو پنچھے۔ میگی کو ہم نے سمجھایا کہ اگر اصلیت بتلائی تو ہم مار مار کے بھوسہ بھر دیں گے۔
" امّاں نے اصرار کیا کہ طلاق دے کر واپس بھیج دیں۔ ہم نہ مانے۔

مجمّے کا جلوس لے کر نکلتے ہیں جسے اپنی پیٹرن سینٹ کہتے ہیں۔ میگی جو گیت انگلش جپسیوں کی بولی کے گاتی تھیں ان میں بہت سے ہندوستانی کے الفاظ موجود تھے۔ الفاظ بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ پنکی تم اور ڈِنگی زبان کے معاملے میں تکرار کرتے رہتے ہو مگر یاد رکھو خانہ بدوش اردو شاید پانچ سَو سال اور باقی رہ جائے۔"

"ماموں میاں آپ ہمیں میگی ممانی کے متعلق بتلا رہے تھے۔"

"اوہ — ہاں۔ تو وہ اصلاً بوہیمین گرل ایک دیو کی قید میں تھیں۔ اور انھیں اس حصار کے ایک موکھے میں سے چند کوچہ گرد گوتے دکھلائی پڑے جیسی کنبہ یاد آیا اور وہ اس گمشدہ آزادی کی تلاش میں نکل بھاگیں۔"

"مگر وہ بنجارے نہیں تھے۔ وہ تو —"

"ان کو اس کی پہچان کہاں تھی۔ بے چاری انگریز عورت۔ اس مکان سے باہر ہی بہت کم نکلی تھیں۔"

"ہمارے ہاں کے زنانے بھی کس قدر پھٹے حال ہیں۔" فیروزہ نے کہا۔

"— ولیسٹ میں دیکھیں۔ رات کے وقت پیرس کے بوآد بولوں کی سڑکوں پر جمع جیسے پریوں کا میلہ۔ ایک سے ایک گلیمرس۔ بہت سے تو اپنی اپنی کاروں پر آتے ہیں۔ ہمارے ساؤتھ ایشیا میں ہر چیز اتنی پھٹیچر ہے۔"

"کیوں۔" پنکی نے جرح کی۔ "شاہی کے زمانے میں تو وزیر اور مدبّر تک بنے۔ خواجہ سرا تحسین علی خان۔ خواجہ سرا الماس علی خان۔ تحسین کی مسجد۔ امام باڑہ الماس۔ خواجہ سرا عنبر علیخان۔"

"ہمارے زوال کی ایک اور علامت!" رِوکی میاں نے جواب دیا۔

"ماموں میاں ہم نے ضد کی تھی تو ایک بار خوش قدم بُوا اور رمضے خاں اپنے اپنے ساتھ تُرّ کے میلے میں لے گئے تھے۔ وہاں ہم نے کیا دیکھا کہ آمنے سامنے دو

مچانوں پر کھڑے زنخوں کے دو گروہ فقرے بازی کر رہے تھے اور مجمع قہقہے لگا رہا تھا۔"

"مشرقی تمدن کا آخری نمونہ!" رِوکی میاں نے طنز کی۔

ایک چنڈول چیختا ہوا اوپر سے گزرا۔ وہ تینوں بارہ دری کے اندر کسی چینی جاپانی پینٹنگ کی طرح ساکت رہے۔

دفعتاً تصویر میں جان پڑی۔ پنکی دریافت کر رہے تھے۔

"ماموں میاں ہماری سمجھ میں آج تک نہ آیا کہ جب میگی ممانی اس ڈیوڑھی سے نکلیں سلوچنا نے ان کو منع کیوں نہ کیا۔ ان بے چارے حقیر زنخوں کی ہمت کیسے پڑی کہ وہ راجہ صاحب تین کٹوری کی بڑی بہو کو اپنے ساتھ لے جائیں؟"

"وہ انجان تھے۔ مالی کے ہاں برادری کا بھوج تھا اس کے بعد وہ سب مندر گئے۔ زنانے ان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ ساری کا گھونگھٹ کاڑھ کر وہ بھی چل پڑیں۔ وہ اماوس کی رات تھی۔ دوسرے روز سلوچنا لرزتے کانپتے میاں ابا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی میم صاحب ان کے ڈیرے پر تشریف فرما ہیں پچھاڑیں کھا رہی ہیں مگر یہاں واپس آنے کے لیے تیار نہیں سرکار موٹر بھیج کر بلوا لیجئے۔

"میاں ابا خود جانے کے لیے تیار ہوتے امّاں نے روک دیا۔ بلا کٹی۔ اسے مشنریوں کے حوالے کر دیجئے۔ ایک بڑی رقم سلوچنا کو دی کہ جب تک میم صاحب تمہارے ہاں رہیں ان کے کھانے پینے کا خیال رکھو۔ اور سڑک پر ہرگز نہ نکلنے دینا۔ ہمیں ان سب معاملات کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔

"تین کٹوری گاؤں میں سالویشن آرمی والوں نے ایک سینٹر کھول رکھا تھا ان کی بڑھیا میم اکثر وہاں گڑھی پر آیا کرتی تھیں امّاں نے معلوم کروایا وہ مر چکی تھیں — چند روز بعد میاں ابا نے بریگیڈیر کو بلوا بھیجا۔ کمتی فوج میگی کو لے گئی۔"

"وہ ہماری جھنی۔ پپنی۔ قینی کی جنریشن کے ہیرو تھے۔"

"جی ہاں۔ وہی تو۔"

رینکی نے ان کی دلچسپی کی گفتگو شروع کی۔

"تو آپ تناسخ ارواح کو نہیں مانتے۔"

"نہیں۔ البتہ ایک یونیورسل اسپرٹ ہے۔ سارے میں جاری وساری یہی ویدانت ہے اور زین۔ اور تاؤ۔ جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں۔ ہفت صد ہفتاد۔"

رینکی نے نظر بچا کر گھڑی دیکھی۔

"تمہیں کہیں جانا ہے؟" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھے اور سیڑھی اتر کر مختصر جاپانی تالاب کے کنارے کنارے ٹہلنے لگے۔ "بارش میں کنول! ——— پانی پر پھیلے نیل کمل پر نظر ڈال کر ایک غیر متعلق خیال کا اظہار کیا۔

رینکی نے آہستہ سے کہا۔ "یہ پاگل کبھی نہیں تھے ——— محض ایک DELIGHTFUL ECCENTRIC۔ ایسے نفیس الطبع آشفتہ مزاج لوگوں کی اب ہماری سوسائٹی میں گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ ہم تو ان کے کتب خانے کی وراثت کے بھی حقدار نہیں۔ ان کی زندگی اب کتنی باقی ہوگی۔ مگر یہ حیات جاودانی کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور رباعیاں کرتے جاتے ہیں اور 'سب کہاں کچھ لالہ و گل میں' دہرایا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بنوں میں ان کو کنترؔ نظر آتے ہوں گے اور طوطے ان کو کہانیاں سناتے ہیں۔ فیروزہ یہ ان قدیم شاعروں میں سے ہیں جن کے ذہن اور تخیل نے دیومالائیں تخلیق کیں۔

"جاپانی باغیچوں میں زین کی روح ان کو بڑی صاف دکھلائی دے جاتی ہے۔

سلہ : ہندوستانی دیومالا کے نصف انسان نصف حیوان جو جنگلوں میں نغمہ سرا رہتے ہیں۔

"ممتی باجی ——— وہ اس وقت بھی تھی؟" فیروزہ نے سوال کیا۔

"سالویشن آرمی یار۔" رینکی نے آہستہ سے ڈانٹا۔

"ممتی فوج کی باضابطہ مشنری زندگی اور پابندیاں میگی برداشت نہیں کر پائیں۔ بھاگ کر پھر سلوچنا کے جتھے سے جا ملیں۔ لالہ کالی چرن کے کھوجیوں نے تبلایا کہ وہ لوگ بہار چلے گئے۔ بریگیڈیر صاحب ان کو گھیر گھار کر واپس لے جانے میں کامیاب رہے تھے۔ کیا پتہ پھر رسیاں تڑا کر بھاگ نکلی ہوں۔ انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔"

"آپ بھی ایسا سوچتے ہیں ماموں میاں؟"

"کبھی کبھی۔ وہی قدیم ترین سوال ——— فلاں کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب نہیں ملتا۔"

رینکی نے ان کی دلجوئی کی سعی کی۔ "ماموں جان ہم نے سنا ہے سلوچنا ان کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے۔ ساری برادری ان کی بے حد عزت کرتی تھی۔ دراصل ان کو شاید ایک فادر فیگر کی تلاش رہی ہوگی جو نانا میاں اور بریگیڈیر صاحب میں بھی نہیں ملا۔ کمترین مخلوق جنت کی چڑیا سلوچنا میں مل گیا۔ خاکساران جہاں را ——— میں ابھی شیری کا سل گیا تھا۔ مانک خالہ کو تبلایا۔ وہ کہنے لگیں ——— آؤ ہم امید کریں میگی سالویشن آرمی والوں کے ساتھ میجر مارگریٹ بنی ———

ONWARD CHRISTIAN SOLDIERS MARCHING ON TO WAR

——— گاتی کہیں گھوم رہی ہوگی۔ یا ان لوگوں نے اسے ولایت لوٹا دیا ہوگا۔"

"ممتی فوج ہی نے یہاں سے کوچ کیا۔ کس سے پوچھتے۔"

فیروزہ نے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔ "بڑے ماموں۔ بیلارانی بھی ایکٹرس تھیں؟ بڑے ماموں۔ ہم دلیپ سے سوئیٹزرلینڈ میں ملے ——— وہ تو کافی مطلب یہ کہ ———"

پورن برہم ۔ یونیورسل اسپرٹ ۔ پیڑ ۔ پودے ۔ پرندے ۔ ان میں شامل ہوکر یہ خود اور ہم سب بار بار نمودار ہوتے رہیں گے۔" دفعتاً پنکی ہنس پڑے ۔
"ماموں جان کی یہی بات سُن کر ایک صاحب کہنے لگے ذرا سوچئے ۲۰۱۲ء کی ایک سہانی صبح ایک چڑیا بیڈروم کے دریچے میں آن بیٹھے اور اچانک انکل وِکی کی آواز میں تقریر شروع کردے ۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ـــــ ۔"

" بات یہ ہے فیری کہ زندگی کے بعد بدی موت ایک اٹل قانون ہے۔"
" یہ تم کہہ رہے ہو یا سنہ دوہزار بارہ میں کھڑکی میں بیٹھا پرند بول رہا ہے ؟"
" یہ ہم کہہ رہے ہیں ۔ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا ہواتا ۔"

وِکی واپس آ گئے ۔

" ماموں میاں اجازت ـــــ " پنکی نے کھڑے ہوکر کہا ۔" ایک وزیر کے ہاں ڈنر پر جانا ہے ـــــ بڑا سرکاری کنٹریکٹ ملنے والا ہے ۔ بہت منافع ہوگا ۔"

" تم زرپرستی کی منزل پر بہت جلدی پہونچ گئے ۔ یاد رکھو محض چند سال قبل تک شرفا روپے پیسے کا تذکرہ ہی نہیں کرتے تھے ۔ معیوب بات تھی ۔"
" ماموں میاں اب تو ہم خود بزنس مین ہیں ورنہ کیسے کام چلے گا ؟"

پنکی کے جانے کے بعد پھر عرض مدعا کی تیاری کی جس کے لیے سرِشام سے منتظر تھیں ۔

" ماموں جان ۔ ایک بات ـــــ "

" سنو ۔ انسان کی پانچ منزلیں ہیں ۔ پہلے وہ رومینٹک ہوتا ہے ۔ تمہاری طرح ۔ پھر انقلابی ۔ قنبر کی طرح ۔ پھر قوم پرست ۔ پھر زرپرست ۔ پھر شدید مذہب پرست ۔ یا صوفی ۔ یا قنوطی ۔ یا فلوطی المنفلوطی !"

" بڑے ماموں آپ کتنے دلچسپ ـــــ "

" یعنی اپنے چینل بدلتا رہتا ہے ۔ اچھا بھئی ۔ تم نے ہمارے کدم کی چھاؤں تو مسترد کردی ۔"
" جی ہاں ۔ انگلستان کا اوک !"
" اوہ ۔ شاہ بلوط ! وہ بھی اچھا درخت ہے ۔ اور بیٹا تم خود کس مٹی سے اُگی ہو ؟"

" ہم ویسٹ میں زیادہ ایٹ ہوم رہتے ہیں ۔"
" اس میں کیا قباحت ہے ؟ تمہاری بیشتر پرورش وہیں ہوئی ۔"
" اور یہاں امی کا میکہ ہے ۔ اینڈ اوِل ڈیٹ ۔ لیکن دشمن ملک ہے ۔"

ماموں نے آہ بھری ۔

بھانجی مسکرائی ۔ کہا ۔" میں نے اب اپنی سہیلیوں میں انڈین پنک کے بجائے کرسچین پنک کی اصطلاح رائج کی ہے ۔"

" تمہارے ان بیانات پر ہم متعجب نہیں ۔" نفس سرد کھینچا ـــــــــ
" تمہاری جنریشن نے ایک دوسرے کے خلاف دو بھیانک جنگیں دیکھی ہیں ۔ اور مسلسل دونوں جانب کا منفی پریس اور منفی اور مخاصمانہ تصورات ـــــ "

"جنگیں سہانی بھی ہوتی ہیں؟" متبسّم۔
"متواتر فسادات اور ان کی خبریں۔"

سُریلی سی ہوا چلی۔

"اچھا بھئی تو وہ — شاہ بلوط —"

"وہ لندن یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو تھا۔"
"تمہارے والدین کو اعتراض نہیں؟"
"تھا۔ بیحد۔ لیکن وہ مسلمان ہو جائے گا۔ خاندانی لڑکا ہے۔ اور اس کی بڑی تمنا ہے کہ شادی خالص انڈین — آئی مین — ساؤتھ ایشین روایتی ڈھنگ سے ہو۔ ہاتھی گھوڑے پالکی وغیرہ۔"
"وہ کیا ایک INDOPHILE ہے؟"
"کچھ کچھ۔ دراصل اس کے ایک ہم قوم دوست نے ایک برہمن لڑکی کے ساتھ اودے پور آن کر پھیرے ویرے ڈلوائے۔ ویدک رسوم اور ہاتھی گھوڑے۔ برائن بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ تو اسے بھی یہی شوق چرّایا۔"
"ایک عدد ہاتھی کا انتظام ہم کروا دیں گے۔ پالکی تو گودام میں موجود ہے۔"
"اوہ ماموں میاں یُو آر ونڈرفل۔ تھینک یو۔"
"مگر تمہارے ابّو کیا یہ پسند کریں گے —؟"
"ان کو منالیں گے۔ وہ میری ہر ضد پوری کرتے ہیں۔ وہ سرکاری ملازم نہیں ہیں۔ یہاں آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
"تمہارے والد علی گڑھ سے ڈگری لیتے ہی ۴۹ء میں چلے گئے تھے — تمہارے باپ کی نسل کے لیے قومیت بدلنے یا برقرار رکھنے کا انحصار —

یا انتخاب پر تھا یا مجبوری پر — اب قومیت کا دار و مدار وقوع پیدائش پر ہے۔ اگر تمہارے ابّو یہیں رہ گئے ہوتے اور پنکی کو ان کے والد نے وہاں بلا لیا ہوتا تو آج ڈِنکی وہ ہوتے جو پنکی ہیں اور پنکی وہ ہوتے جو ڈِنکی ہیں یعنی ڈِنکی پنکی ہوتے اور پنکی ڈِنکی۔ کیا سمجھیں؟"
"جی۔" سمجھے میری بلا۔
"دوسرا انحصار اس چیز پر ہے کہ کس کو کس سفید فام ملک کی شہریت زیادہ آسانی سے مل جائے۔"

بالکل خبطی۔ لیکن راجہ صاحب تین کٹوری اب یہی ہیں۔ بڑی خالہ کتنی ہی خفا ہوں اگر یہ اجازت دیدیں گے تو ساؤتھ ایشین مسلم ویڈنگ یہیں سے ہوگی۔ بلکہ جھونک میں آکر بہترین انتظام یہ خود کروائیں گے۔

"بڑے ماموں۔ چند شہدے بھی درکار ہیں۔"
"شہدوں کی آج کل کیا کمی ہے۔"
"جی نہیں۔ وہ شادیوں والے۔"
"شادی و غمی والے شہدے تو ابھی موجود ہیں۔ اندرون شہر میں شیعہ حضرات کے آخری غسل کا فریضہ بھی شاید اب تک انہی کے سپرد ہے۔"

فیروزہ لرزیں۔ یہ پُرانی تہذیب کا چکّر تو بہت تہہ در تہہ نکلا۔

"خواتین بھی آ رہی ہیں؟"
"جی ہاں۔ برائن کی دادی بہت مشتاق ہیں۔ لیڈی مورلینڈ۔ اسّی سالہ۔"
"یعنی ایک ٹکٹ میں دو تماشے۔ راج کا نوسٹیلجیا اور فینسی ڈریس نیٹو ویڈنگ۔"

یہ کیسے سرپھرے آدمی ہیں۔ اچھی بھلی بات کا کباڑا کر کے رکھ دیتے ہیں۔

ہمت نہ ہاری ___ "برائین کی والدہ اور بہنیں بھی آئیں گی۔"

"بہت خوب۔ ہماری چھنکی میراثن سمدھنوں کو بیحد نفیس گالیوں سے نوازتی ہے۔ اسے ضرور بلائیں گے۔"

دوبارہ لرزہ چڑھا ___ شہد میں لپیٹ لپیٹ کر شائستہ گالیاں ___ چھنکی نفیس گالیاں ___ پرانی تہذیب! لیکن فرمائشوں کا ایجنڈا ابھی باقی تھا۔ مری ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔ "تھوڑے سے بھانڈ۔"

"یقیناً۔ لیکن ہمیں یاد نہیں آ رہا ہم لوگ کن کشمیریوں کی میراث ہیں۔"

"ہم لوگ ___ آئی مین ___ آپ لوگ کشمیریوں کی میراث میں ہیں۔؟"

فیروزہ نے سٹپٹا کر دہرایا۔

"ذرا بتاشے کو بلانا۔"

نورن کے شوہر بتاشے ابن بتاشن بوا حاضر ہوئے۔

"سرکار۔"

"تین کٹوری کر نجے بھانڈ کی میراث ہے نا ___؟"

"جی سرکار۔"

"بڑے ماموں۔ تین کٹوری بھانڈوں کی میراث میں کیسے چلی گئی؟ یہ سب سن کر میرے تو ہوش اڑے جاتے ہیں۔"

کمیونیکیشن گیپ۔

"بیٹا میراثی اور بھانڈ مختلف خاندانوں کی خدمت اپنے باپ دادا سے میراث میں حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان کے ہاں اور کوئی گویا نہیں بلایا جا سکتا۔ کر نجے کا دھڑا ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ بتاشے کل ذرا کشمیری محلے چلے جاؤ۔"

"جی سرکار۔ ہمیں کر نجے کا مکان معلوم نہیں۔ بھانڈوں کی مسجد جا کر پتہ کر لیں گے۔ کٹرہ بوتراب۔"

"ٹھیک ہے۔ جاؤ۔"

"بارات کا بندوبست پنکی ___"

"پنکی ___؟"

"کیوں؟ کیا وہ تمہارے فرسٹ کزن نہیں ہیں؟ دیکھ لینا وہ کس خوبی سے رشتے داری اور وضع داری نبھائیں گے۔ ہنی مون کے لیے نینی تال ___ ہوٹل تین کٹوری ___؟"

سر اٹھا کر چاند کو دیکھا جواب بوہیمین گرل کی "اسٹیج" پر پہونچ چکا تھا۔

"تم کو زمانِ حال کے جپسی ماضی کے قلعے سے چرا لے گئے!"

"ماموں میاں اصل بوہیمین تو آپ تھے لیکن آپ کو قلعے میں واپس آنا پڑا!"

"تم انگلستان جا بسو گی! موسم بدل جاتے ہیں تو ندیاں اپنا رخ تبدیل کر لیتی ہیں۔ جیسلمیر اور سندھو گھاٹی ٹپر سے نکل کر بنجارہ چاند اسپین اور بوہیمیا اور ہنگری کیسے جا پہنچا۔ دریا کا بہاؤ بدل گیا تھا۔"

خانہ باغ شبنم سے بھیگ چلا۔ وہ بید کے سہارے کرسی سے اٹھے۔

"آؤ اب اندر چلیں تاکہ ہماری ہیپی فیملی ڈنر کھائے ___

تیز رکھیو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد!"

"اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ میں انکل وِکی سے بات کر کے طعام شب کے بعد اپنے کمرے میں آئی ہوں اور تم کو ایک خوشخبری تحریر کرتی ہوں۔ انکل وِکی فوراً مان گئے۔ انگلش بارات — انڈین ویڈنگ۔ تمہارا جوڑا ابھی سِل جائے گا مع صافے کی کلغی۔ تم بالکل لالہ رُخ والے پرنس آف بخارا نظر آؤ گے۔ خالائیں منھ پھُلائے رہیں گی۔ لیکن کزن پنکی نے (جن کا رشتہ میں نے رد کیا ہے) حیرت انگیز فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔ اب تم ہاتھی پر بیٹھنا۔ بہت تفریح رہے گی۔ ٹیلی ویژن والوں کو ساتھ لیتے آنا۔

اگلے ہفتے ہم سب چند روز کے لیے نیپال کی سمت والی ترائی جا رہے ہیں۔ جہاں میری کزن آمنہ کی سسرال کے فارم وغیرہ ہیں۔ میرے چھوٹے انکل بوبی خاندانی جمگھٹوں میں شامل نہیں ہوتے۔ نانا کے انتقال کے بعد بڑے بھائی سے جائیداد کے بٹوارے پر جھگڑا ہوا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ انکل وِکی نے ہاؤس کیپر کی نواسی سے شادی کرلی تھی۔ ہماری نانی ہی نے کروائی تھی جو بہت مطلق العنان تھیں۔ خاندان میں کوئین وکٹوریہ کہلاتی تھیں۔ انکل وِکی اس زمانے میں ذرا ابنارمل تھے۔ اولاد بالکل صحیح الدماغ اور ذہین پیدا ہوئی۔ انکل بوبی خفا ہو گئے۔ برسوں انکل وِکی سے مقدمہ لڑا کیے۔ اس مقدمے بازی میں یہ گھر تباہ ہو گیا۔ کیتھ کے جنگل ہی میں ہوا ہوئے —— ہوٹل تین کٹوری باقی بچا جو عدالت نے انکل وِکی کو دلوا دیا۔ اسے انھوں نے بہت ترقی دی ہے۔ یہ ایک انگلش اسٹائل مہمان سرائے ہے جو تم لوگوں کے عہد میں بھی بہت مقبول تھی۔ دروازے کے باہر انگلش INNS جیسا بورڈ آویزاں ہے جس پر تین کٹوریاں بنی ہیں۔ ایک

لاؤنج کے باہر بالکل ولایتی طریقے سے TEAS لکھا ہے —— سہ پہر کی چائے کے ساتھ وِلو پیٹرن کی نیلی پلیٹوں میں اسکونز پیش کیے جاتے ہیں۔ وغیرہ۔ نینی تال کا تم لوگوں کے عہد میں بڑا پکا انگلش ماحول تھا۔ اب اس کے برعکس ہے۔ خیر آ کر دیکھ لینا۔ اگلا خط میں تم کو پہاڑ کے دامن سے لکھوں گی اگر وقت ملا۔

"پنکی۔ ڈِنکی۔ شیلی۔ ایمی۔ فیری۔" ان سب کے عہد طفلی کے مانند زرینہ سلطان برآمدے میں کھڑی گویا ان کی حاضری لگا رہی تھیں۔ پھر انھوں نے حسب عادت زیر لب کہا۔ میری آنکھوں میں خاک۔

چاروں طرف سے بشاش صدائیں آئیں۔ "یس میم — یس میم —"

"وِکی۔ بوبی ——" یہ نام حلق میں اٹک گیا۔ بوبی ایسے خاندانی اجتماعات میں برسوں سے غیر حاضر تھے۔

"وِکی ——" دوبارہ پکارا۔

"باغ میں ہیں ——" رانی دلہن نے جواب دیا۔

"دیکھ لینا یہ ایک دن بابا نیم چمیلی کی طرح پکڑیا پر بیٹھے ہوں گے —— پینی۔"

"یس میم ——"

"فینی ——"

"اندر گئیں ہیں واپس۔ طہارت کرنے ——"

"سیلی ——"

"یس میم ——"

"اور یہ ہم خود ——" زرینہ نے پرانے دنوں کی طرح انگوٹھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

مسز ڈھونڈی ہڑبڑاتی ہوئی آن پہنچیں۔

"صاحب جی — مانک بائی — کیم چھو — ؟ سارو — ؟" وِکی نے روش پر سے پکارا۔

"فلی۔ مہناز —" زرینہ نے گویا رول کال پوری کی۔ قافلہ موٹروں کی طرف بڑھا۔ سب بہت مسرور تھے۔ سارے کھنچاؤ اور غم اور پریشانیاں وقتی طور پر بھول چکے تھے۔ ڈِنکی پنکی سے کہہ رہے تھے "یار یہ ہم لوگوں کے انگریزی نام کیوں رکھے گئے تھے؟ جینی۔ پنکی کے بجائے جنو، بنو نہیں ہو سکتے تھے اور وکو، ببو — ؟"

"نام اور عرفیت سے" پنکی نے کار میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا "کلاس واضح ہوتی تھی۔ ببو شبراتی دُھنے جولاہے تھے۔"

"مگر یار یہ جینی پنکی وغیرہ تو انگریز مشنری چمریشنوں کو بپتسمہ دیا کرتے تھے۔"

"ہم تم جیسے بابا لوگ کے یہ نام ان کی فرنگی گورنسیں بھی تو رکھ جاتی تھیں۔ جگی سنگھ اور ڈِکی خان میں کس قدر سنوبری مضمر ہے!"

"جمہوری دور میں ہمارے عوام نے اپنے تحقیر آمیز نام بدل لیے۔ دُھنے خود کو منصوری کہتے ہیں۔ منصور حلاج کی نسبت سے۔ حجام سلمانی بن گئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ سابق ہریجن موریہ —"

"موریہ کیا — ؟"

"چندرگپت موریہ کی ماں شودر تھیں۔"

"بہت پرانا رشتہ نکالا!"

"ہم لوگ بھی زیادہ تر گزشتہ ROBBER BARONS کی اولاد ہیں لیکن جانے کیا کیا کہلاتے ہیں — ایک سوشل سائنٹسٹ کے لیے یہ معاملات —"

"پنکی — چلو بھئی آگے بڑھو —" ان کی والدہ نے آواز دی۔

وِکی مع اہل و عیال اپنی نئی نویلی سرخ رنگ کی ماروتی وَین میں سوار ہو چکے تھے۔ مہناز اور آمنہ پنکی کی کار کی طرف آئیں۔

"سلیمہ کو بھی ادھر بلا لو" مہناز نے کہا۔

"وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جا رہی ہیں" آمنہ نے دھیرے سے جواب دیا "یار یہاں شادی بیاہ کی بڑی پولیٹکس چل رہی ہے۔ ہم ان سب کو اسی لیے آؤٹنگ پر لے جا رہے ہیں کہ ان کا دھیان بٹے اور ٹنشن کم ہوں۔"

مانک بائی ایک اٹیچی کیس نہایت احترام و احتیاط سے اٹھائے اپنی کار میں بیٹھ رہی تھیں۔ "لائیے ہمیں دید یجئے۔" آمنہ نے کہا۔

"نائیں۔ تم بچوں والا ہے۔ پاک صاف ہاتھ نہیں ہوگا۔ لو صفیہ تم پکڑو۔ تم ایک دم شُدھ ہو اس میں سالار بابا کے مزار کے لیے چادر ہے۔"

"جی نہیں۔ ہم نہیں۔"

"ارے چھوٹی خالہ ابھی تو آپ وضو کر کے آئی ہیں۔" آمنہ نے چڑ کر کہا۔

"یہاں پھر ساری پر چھینٹ پڑ گئی۔ مار سارے باغ میں وِکی ہر وقت پانی دلواتے رہتے ہیں۔"

"فیروزہ۔ پروین۔ شہلا ہماری گاڑی میں آجاؤ۔" رسالی میں کھڑی زرینہ ٹریفک ڈائریکٹ کرنے میں مصروف تھیں۔ "اب یہ دونوں پھر چلی جائیں گی۔" ٹھنڈی سانس بھری۔

"فیروزہ کا بیاہ تو بہت جلد یہیں سے ہونے والا ہے۔" شہلا نے بے خیالی میں بھانڈا پھوڑ دیا۔

ندی کے پُل پر سے گزرتے ہوئے پنکی ڈِنکی کو بتلا رہے تھے۔

"کرنیل گنج۔ ضلع گونڈہ۔ اللہ میاں کے پچھواڑے۔ وہاں سرجو اور گھاگھرا کے سنگم پر قیصر گنج میں بہترین پرندے ملتے ہیں مع سُرخاب۔ جھُنڈ کے جھُنڈ۔ وائلڈ لائف پریزرویشن سے پہلے سورگباشی ٹھاکر رگھبیر پرشاد سنگھ سنا ہے سرخاب بھی مار گراتے تھے۔"

دوسری کار میں آمنہ فیروزہ سے مخاطب تھیں "بیگم حضرت محل اسی راستے سے نیپال گئی تھیں۔ جہاں ہم لوگ جا رہے ہیں۔ ان کے وفادار رانا بینی مادھو بخش ان کے ہمراہ گئے تھے۔ ہمارے کسان اب تک ان کی آلہا گاتے ہیں ——
بینی مادھو بخش مردانہ ——"

"آلہا کیا ——؟"

"ارے یار تم نے تو لُٹیا ہی ڈبو دی۔"

"اگر ہم لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آلہا کیا بلا ہے تو کون سا ایسا غضب ہو گیا۔" فیروزہ نے پنجے نکالے۔

"ع آلہا اُودل بڑے لڑیّا جن سے ہار گئی تلوار!" آمنہ نے فیروزہ کا تیکھا پن نظر انداز کر کے دہرایا۔ وہ اس وقت صلح جوئی کے مشن پر نکلی تھیں۔ "تمہاری پکچریسک اور ینٹل ویڈنگ کے لیے بھاٹ بھی بلوالیں گے۔"

فیروزہ پنکی نسبت کے بریک ڈاؤن کے بعد سے مہمانوں اور میزبانوں میں بسلسلۂ ہند و پاک تعلقات، خوش اخلاقی کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ فیروزہ کو بھی یاد آیا کہ جنگ بندی ضروری ہے۔

گاڑیاں شاہراہ پر آ گئیں۔

"تمہاری سڑکیں بہت عمدہ ہیں۔" فیروزہ نے فراخدلی سے ریمارک کیا۔

"تمہارے ہاں بھی۔"

فیروزہ بے ساختہ کہنا چاہتی تھیں کہ ابّو نے مجھے نئی ہونڈا اکارڈ خرید کر دی ہے اب کی بار آؤ تو اس پر تمہیں سوات لے کر جاؤں گی۔ ڈر کے مارے چُپ رہیں آمنہ یہ بھی فوراً پوچھتیں ہونڈا اکارڈ کیا؟ کمال ہے یہ لوگ فارن کاروں کے نام تک سے واقف نہیں۔ کل ڈِنکی نے بجیرو کِڈز کا ذکر کیا، بجیرو بھی سمجھانی پڑی۔

کرپشن محفوظ ترین موضوع تھا۔ چنانچہ فیروزہ نے انکسار سے کہا "اتنا تو کرپشن ہے ہمارے ہاں۔"

"یہاں تو حد ہو گئی ہے۔"

"ہمارا تعلیمی معیار بہت گر گیا ہے۔"

"یہاں بھی بُری حالت ——"

"نہیں تو۔ بھارت میں سینکڑوں یونیورسٹیاں کھُل گئی ہیں۔"

"یونیورسٹیاں؟ گھڑسال!"

"گھڑسال کیا؟"

اگلی کار میں اب پنکی اور ڈِنکی کے درمیان اسی مفاہمت اور خیرسگالی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔

"یار ڈِنکی تمہارے ٹی وی پلے تو لاجواب ——"

---

۱۰ چار کھونٹ میں نوبت باجی

"جھولا ہے ۔" بوڑھے پیٹی ماسٹر نے اپنی برادری کا خفیہ لفظ دہرایا۔ یعنی یہ جگہ بیکار ہے آگے چلو۔ چنبیلی بیگم فوراً اسباب سمیٹنے لگیں۔ کم خمیدہ سفید فام، بادشاہ جانی رنگین بش شرٹ اور عنابی پتلون میں ملبوس اب بھی چھیلا بنے ہوتے تھے ـــ حنا آلود پنجوں پر ہاتھ پھیر کر بولے "یا وحشت کہاں چلیں ـــ یہیں آرام کیجئے۔ آپ دونوں کو اب آرام کی ضرورت ہے۔"

استاد حفظِ مراتب کے عادی تھے۔ دست بستہ عرض کی: "حضور شہزادہ سلامت ہم مقدمہ ہی ہارے ہیں ہمت تو نہیں ہارے ـــ ہم اب اسّی کے پیٹے میں ہیں۔ یہ نیک بخت ہم سے چند سال ہی چھوٹی ہیں۔ لیکن اٹھاؤ چولھا لوگ اپنی ہنڈیاں اللہ میاں کے ہاں سے مضبوط لکھوا کر لاتے ہیں۔ آخری بار لکھنؤ آئے اس سال ہمارا شٹرا ہیں صرف دو ہی عرس ملے (ایک زمانے میں بہار پھولپوری تاسف سے کہا کرتے تھے، اس چھ مہینے میں صرف تین مشاعرے ہی ملے) ذرا بہرائچ ہو آئیں۔"

بادشاہ جانی رکشا پر بیٹھ کر گلی کی بھیڑ میں غائب ہو گئے۔

استاد موگرے مقدمے کے لیے (جسکی یہ پیشی آخری ثابت ہوئی) جب بمبئی سے چل رہے تھے اُنکے قدیم مربّی، بھنڈی بازار کے سیٹھ عبدالرحمٰن بیکری والے نے کہا تھا کہ لکھنؤ پہنچ کر حسب سابق انکے غریب خانے پر ہی ٹھہریں۔ انکے چھوٹے بھائی وہیں رہتے تھے اور ایک چینی ریسٹورانٹ کھول چکے تھے۔ رنگین ٹائیلوں سے مزین انکی

سہ منزلہ رہائشی عمارت میں قیام کر کے اور شیخ فیل فروش کے حق میں اِس طویل مقدمے کا فیصلہ سن لینے کے بعد استاد پھر پابہ رکاب تھے۔ چنبیلی بیگم نے بوریا بدھنا سمیٹا۔ وہ دونوں اپنے نورِ چشم گلاب کے ہمراہ قیصر باغ کے بس اڈے پر پہنچے۔ جہاں سے سارے اتر پردیش کے اضلاع و قصبات کے لیے یوپی روڈویز کی بسیں ہر پانچ منٹ پر چھوٹتی تھیں۔ مسافروں کے جمِ غفیر سے نکلے بہرائچ کی کھڑکی کے سامنے جا کر طویل کیو میں لگ گئے۔

یوں چلی اشکوں سے چشمِ خونفشاں کی میدنی
جیسے بہرائچ چلے بالے میاں کی میدنی

(میر انشاء)

اودلسی داس جی نے چار سو برس قبل "جگ بہرائچ جاتا" دیکھا تھا۔ جگ اسیطرح ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ ٹرینیں۔ اسپیشل بسیں۔ ٹیکسیاں۔ موٹریں، ٹریکٹر۔ بیل گاڑیاں جو ڈنلپ کہلا رہی تھیں کہ ان میں ڈنلپ ٹائر لگ گئے تھے۔

اپاہج ۰ مریض، اندھے۔ جنکی آنکھوں کو روشنی ملے گی جیسے نابینا زہرہ بی بی کو غازی میاں کی کرامت سے روشنی مل گئی تھی۔ انہی زہرہ بی بی کی غازی میاں سے جیٹھ کے پہلے اتوار کو شادی ہوگی۔ یہ ساری خلقت گاجی میاں کی باراتی تھی۔ گاجی پیر بیاہن چلے۔ گاجی پیر ـــ "گاجی میاں کے سہلے "گاتے ڈفالی دور دور سے آپہنچے تھے۔ چار کھونٹ میں نوبت باجی۔ سید سالار مسعود گاجی۔

لکھنؤ کی ایک بس سے اتر کر ماسٹر جی، انکی بیوی اور فرزند نے درگاہ شریف کا رخ کیا۔ والدین کو ایک املی کے نیچے بٹھا کر گلاب مسافر خانے کی طرف دوڑ گئے۔ ماں باپ پودنی اور پودنے کی طرح پیڑ کے نیچے بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد پرزادہ واپس آکر

بولے۔"ابّا وہاں تو گورکھپور مرزا پور کا میاں بھائی بھرا پڑا ہے۔ اب ہم باہر دیکھ کر آتے ہیں۔
تم دونوں یہاں سے اٹھنا نہیں ورنہ گم ہو جاؤ گے۔"

گلّاب نے ٹیڈی بوائے چُست پتلون کے بعد نئے فیشن کے مطابق بیل بوٹم بھی
کئی سال پہنے اب عرصے سے تہمد پوش تھے۔ داڑھی اور زلفیں بڑھائی تھیں جن کے
بال سفید ہو چلے تھے۔ بمبئی میں اپنی دکنی بیوی نعمت بائی کو طلاق دینے کے بعد ایک کوکنی
حسینہ ہاجرہ بی سے رشتۂ مناکحت استوار کیا۔ اسے چھوڑنے کے بعد اب ماہم کی جھوپڑی
ایک بائی گھاٹن جمنا بائی نے بسا رکھی تھی جسے وہ جیلہ بائی پکارتے تھے۔ لاولد تھے۔ سینما
ٹکٹوں کی بلیک کا معزز دھندا فی الوقت اختیار کر رکھا تھا۔ لیکن اس سے بھی اب جی اچاٹ
ہو چلا تھا لکھنؤ کا مقدمہ ہارنے کے بعد ساری دنیا ہی کنڈم معلوم ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد
میلے کا چکر لگا کر واپس آتے —— "ابّا۔ سب جگہ دیکھ آئے۔ خطیب باغ۔ زہرہ باغ۔
نورنگ باغ۔ یہ باغ۔ وہ باغ۔ سارے میں بستی، گونڈہ، جونپور، بنارس سلطانپور
کانپور جانے کہاں کہاں کی میدنیاں ٹھہری ہوئی ہیں۔ ادھر ایک راجہ کی کوٹھی ہے اسکے
کمپاؤنڈ میں بھی براتی ہی براتی۔ مگر وہیں چلے چلو —کسی کونے میں بیٹھ جائیں گے۔"

وہ تینوں امرائی سے گذرتے ایک وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ کوٹھی کے
برآمدے میں ایک ڈفالی زور زور سے دف پر الاپ رہا تھا — گاجی جی
— سلام کریں تو ہرے دولہا — گاجی جی سلام کریں —— آپ راج کاج کریں آپ
تلک دھاری — دُکھین کا پھاؤں بلے تو ہرے چرنوا ——

کنویں کے قریب ٹھنڈک تھی۔ انہوں نے ایک چھتنار آم کے نیچے دری بچھائی
پودنے پودنی والدین کے لیے دانہ دُنکا لانے گلاب دوبارہ اڑنچھو ہوئے۔
جامن کے سائے میں قوّال ——

شاہ زمن کعبہ وطن اژدر فگن خیبر شکن
نورِ صمد شیرِ خدا ماہِ شرف شاہِ نجفؑ
تلوار دی اللہ نے، دخترِ رسولؐ اللہ نے
میری طرف بھی دیکھنا مولا علیؑ مشکل کشا

"فریاد ہے مولاؑ —— فریاد ہے مولاؑ —" چنبیلی بیگم نے زیرِ لب دہرایا، ساری
کے آنچل سے آنسو پونچھے شوہر کو مخاطب کیا۔" گلُ عبّاس دس سال کی تھی جب ہم
حنیفن بُوا کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ بمبئی جانے سے پہلے۔"
"ہاں۔ جرمن کی لڑائی چل رہی تھی۔ اور ممتاز شانتی کی بسنت ——
"بمبئی میں لوگ ہم سے کہتے تھے تمہاری بیوی کی شکل ممتاز شانتی سے کہیں
بہتر ہے۔ ہیروئن بن سکتی ہیں تم نے کہا نوج ہم کوئی پتریا ہیں جو ہیروئن بنیں —ہم تو
پردے دار شریف میراثن ہیں۔ مجبوری درجے بھابی بہن بننا پڑا۔"
"گلُ بکاؤلی کی بیٹی میں ہیروئن بھی تو آئی۔ وہ پکچر ہی ڈبّہ ہو گئی۔ قسمت۔"

چنبیلی بیگم ایک پل کے لیے بیٹی کو نہ بھول پاتی تھیں۔ ریں ریں کیا کیں۔
"حنیفن بُوا سُنی تھیں۔ کہنے لگیں بمبئی جانے سے پہلے گلُ عبّاس کے لیے منت مان لو۔
اسکا اچھے گھر میں بیاہ ہو جائے ترنت یہاں آن کر چادر چڑھا دینا۔ زہرہ بی بی کا جہیز لے
چلو۔ ہم نے چاندی کا مُنّا سا پلنگ خریدا تھا۔ چاندی کا تخت۔ کھڑاویں مُنّی مُنّی۔"
"تب چاندی سستی تھی۔" ماسٹر جی نے ہنکارا بھرا۔
"یہاں غازی میاںؒ کے بیاہ کے روز کتنے زور کی آندھی آتی۔ گلُ عبّاس
کے بیاہ کی مراد بھی غیب سے پوری ہوتی۔"
"ہوں۔"
"ہم اس اللہ ماری گلزار محبت پکچر کے لیے بھی منت ماننے نہ آتے۔"

"اس کا ٹائم کہاں ملا نیکبخت۔" موگرا نے ٹانگیں پھیلا کر بڑی سلگائی۔ چنبیلی بیگم نے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر تمبا کو پھانکا۔ وہ دو تھکے ہارے سُورما تھے جو اپنا زرہ بکتر اتار کر ستانے کے لیے بیٹھے تھے۔

"ہم لڑکی کے بیاہ کی منت بڑھانے آجاتے تو وہ نہ مرتی ——"

"پھر وہی رٹ۔ ارے اسکی مہلت کہاں تھی؟ ادھر باداجی کا تار پہنچتا ہے بمبئی آؤ۔ ادھر اندر سبھا کا نیوتہ لیکر کالے خاں موجود۔ ادھر گل عباس گل۔ گھر زرد جیسے طوفانی تولی بچھڑی ریل —— وہ ہال کمرے سے اوپر گئی جیسے مشین کے ذریعے اسٹیج پر سے پری اوپر نکل جاتی تھی جب اختری بائی ——"

"پھر وہی اختری بائی۔" بیوی چڑ گئیں۔

"پھر ہمارا چنہٹ سے واپس شہر جانا۔ پہاڑ سے بیلا کا خط آنا۔ تم لوگ اب کوٹھی پر ہرگز نہ آنا۔ پا پچھے پڑے گا پچھتانا۔ سیدھے بمبئی جانا۔ نہ کوئی لفڑا کرنا —— اب صاحب کے ساتھ ہے مجھے جینا مرنا —— عنقریب میں خود آؤں گی بمبئی اور —— دیکھوں گی پیارے ابا کا مکھڑا ——"

"اے تم افیم تو نہیں کھانے لگے۔ اس خط میں اس نے ٹونٹکی کا گانا کہاں لکھا تھا —— ع دیکھوں گی پیارے ابا کا مکھڑا!"

"مگر وہ نہ آئی۔ اس رات چنہٹ کے بنگلے میں —— زینہ چڑھ کر اوپر گئی میری دکھیاری بچی —— ہمارے لیے تو اس گھڑی ہی دنیا سے رخصت ہو گئی۔ پھر ہم نے سکی صورت نہ دیکھی۔"

"ہائے رے مولا۔ مولا۔"

"نیکبخت کتنا روؤگی۔ آدھی عمر تو تمہاری روتے کٹی۔ آنکھیں پٹ ہو جائیں گی۔"

"آنکھوں کو اب دیکھنا کیا باقی ہے جو پٹ ہوتیں تو بڑا اندھیر ہو گا۔"

ایک شخص قریب آیا۔ اسباب کندھے سے اتار کر رکھا اور درشتی سے چنبیلی بیگم

کو مخاطب کیا۔ "اے بوڑھا۔ ساری جگہ گھیر لی۔ پرے ہٹ کر بیٹھو۔" تھیلے سے صابن اور تولیہ نکال کر کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ چنبیلی بیگم نے سُوکھے ہاتھوں سے دری کھسکائی۔ پھر اپنی کلائیوں ہی کو دیکھتی رہیں۔ سونے کے کڑے مقدمے بازی کی نذر ہوتے۔ یہ چاندی کی چوڑیاں کب سے ڈال رکھی ہیں اور یہ سُرخ کانچ کی چوڑیاں بھی پچھلی عید پر پہنی تھیں میلی ہو گئیں۔ اب میلے سے انشاءاللہ ہری اور لال ضرور خریدوں گی۔ اللہ ان باپ بیٹے کو سلامت رکھیو۔

امرائی میں پپیہا بولا۔ وہ فوراً اپنے گاؤں پہنچ گئیں۔ شوہر سے کہا "جب ہم گاؤں میں تھے بسنت پنچمی پر اماں کے ساتھ بور کے گچھے لے کر ملکیانے میں جایا کرتے تھے۔"

"ہوں۔"

بدمزاج آدمی تولیہ سے اپنا منڈا ہوا سر رگڑتا واپس آیا۔ تولیہ ایک ٹہنی میں ٹانگی میاں بیوی کو گھور کر دیکھا۔ پھر میلے کی سمت چلا گیا۔

ماسٹر تلخی سے ہنسے۔ "اس بے چارے کو کیا معلوم کہ پُرانے زمانے کی ہیروئن سے بات کر رہا تھا۔"

"اور سب ہم سے تو اچھی رہیں۔ لکھنؤ والی دِلو چاہ مزے سے بال لال کیے موٹر اڑاتے پھرتی ہے کوئینز روڈ پر۔ رنجیت کی ہیروئن تھی۔"

"موٹر اسکول میں ڈرائیونگ سکھلاتی ہے۔" موگرا نے تصحیح کی۔ "اور زیب جہاں —— وہ ہاتھ میں ڈنڈا سنبھالے ماہم کی گلیوں میں پھرا کرتی ہیں۔ اتنی مشہور زمانہ گلّو پریشان حال مر گئی۔ ہماری کیا اوقات ہے نیکبخت ہماری تو شکلوں ہی پر لکھا ہے —— ڈوم —— مُردار کھانے والے۔"

"اے نوج۔ خدا نہ کرے۔ ہم چودہ پشت کے کلمہ گو۔ مُردار کھائیں ہمارے دشمن۔ ماسٹر جی کیا بکتے ہو۔"

"کہلاتے تو ڈوم۔ طوائفوں کے سازندے۔ انکی حرام کی کمائی سے تنخواہ پاتے تھے گویا مُردار کھاتے تھے۔ ارے ہم تو اتنے ذلیل ہیں کہ ہمارے ڈوم پنے کی

کہاوتیں بن گئی ہیں۔ ڈوم اور ڈومنی۔ ہماری کیا ہستی۔ چُپکی بیٹھو اور اللہ اللہ کرو۔"

گلاب فلمی ویلن بلک موہن کی طرح اینڈ کر چلتے ہوئے وارد ہو چکے تھے ——
کٹور دان اور نان کی پوٹلی ماں کے سامنے رکھی۔ باپ کی بات سنکر بولے: "واہ آبا
واہ بہت اچھے۔ یہ سالے اشراف مردار خور نہیں ہیں۔ اور نیتا لوگ۔ ڈھونگی لُٹیرے۔
بے گناہوں کو پل کی پل میں یہ سالے بھنوا ڈالیں۔ حرام کی کمائی یہ کھائیں۔ ڈوم ہم
کہلائیں۔ پبلک کا دل بہلانے والے روتوں کو ہنسانے والے —— ہم —— کلاکار ——"

ایک لڑکی سامنے سے گذر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر آواز اونچی کی۔ انگریزی نیگ مین
امیتابھ بچن کے اسٹائل سے گلے میں رومال باندھ کر تعویز چھوا اور للکارے ——
"یہ بھرشٹاچار یہ اتیاچار اور ہم کلاکار —— میں سماج کو بدل ڈالونگا —— میں کٹھور دھنوانوں
سے گھور بدلہ لونگا۔"

"دھنوانوں سے بدلہ لینے کے لفڑے میں چھ سال چکی تو پیس آیا۔ خاموش۔"
ماسٹر نے دھیرے سے ڈانٹا۔

"ابا جان اب بیڑی پھونکتے ہو۔ تب امپورٹڈ سگریٹ کے کریٹ مڈھ آئی لینڈ
سے لاتا تھا۔ اس سماج میں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ ساری عمر شرافت
کا گڑھا بیٹھے کھودتے رہے اسی میں دفن ہو جانا۔ لو بسم اللہ کرو۔ یہ لو بھنا گوشت۔ یہ سیخ
کے کباب۔ یہ دال ملکہ مسور۔ خاص ریاست ناپنارہ کے باورچیوں کی دوکان سے لایا ہوں۔"

تینوں کھانے بیٹھے۔ گلاب لقمہ چبا چبا کر کے ہڈیاں دور پھینکتے گئے۔ گفتگو جاری
رکھی: "سنو۔ والدین۔ دین کی کتابوں میں منع کیا ہے چوری نہ کرو۔ قتل نہ کرو۔ جھوٹ نہ بولو۔
یہ کہاں آیا ہے۔ ادھر کا مال ادھر نہ کرو۔ سنو۔" چاروں طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا ——
"نیپال کی طرف سے ——"

"چُپ پاجی۔" باپ نے التجا کی۔

وہ برے پلاسٹک کے گلاس میں کنویں کے ڈول سے پانی بھر لاتے۔ پھر بڑے
پراسرار لہجے میں کہا: "آل رائٹ۔ تو ابا جی یہاں سے چلیں گے سیدھے دلی۔"

"دلی کیوں؟" موگرا نے خلال کرتے ہوئے پوچھا۔

"ایک بات بولوں؟ کیا ہے کہ قیصر باغ بس اڈے پر دو بھائی ملے تھے۔ انو کھے
چو کھے۔ اور انکے والد شبراتی —— بنگلہ دیشی ایجنٹوں کے ایجنٹ۔"

"تو ——"

"بولے دلی جمنا پشتہ۔ سیما پوری میں بے شمار بنگلہ دیشی گرا ہے۔ ڈار کی ڈار۔"

"تو —— ؟"

"وہ تینوں عورتوں کو کام دلاتے ہیں۔"

موگرا نے کان کھڑے کیے۔ چہرے پر ملال اور پریشانی نمایاں ہوئی۔

"نہیں ڈیڈی اور کچھ نہیں۔ بس دلی شہر کے اشرافوں کے ہاں جھاڑو کٹکا۔ کراچی
شہر کے اشرافوں کے ہاں جھاڑو کٹکا۔"

"کراچی سے تو بنگالی کٹ گئے تھے۔ پھر جُڑ گئے؟" موگرے نے پوچھا۔

"پیٹ بڑا بلوان رے بابا۔ پیٹ بڑا بلوان۔" بیٹے نے گا کر جواب دیا۔

"یہ کوئی نیا گھٹالا ہے؟" ماں نے دریافت کیا۔

لفڑے پہ لفڑا۔ لفڑے پہ لفڑا —— طوفانی ٹولی گزر رہی۔ اسکی مشین ٹوٹے نہ پیل
پکچر بنی تھی چالیس سال پہلے ——

"کیا ہے انوکھے بولے اُدھر بنگلہ دیش میں ہزاروں کلمہ گو کیمپ میں پڑا تھا۔ بھوکا
ننگا بے یار و مددگار ——"

"کدھر کا؟" باپ نے پوچھا۔

"آسمان اور زمین کے بیچ کا۔ مشنری انکی سیوا میں لگ گیا۔ دوا علاج۔ اسکول۔
کام کاج سارا میاں بھائی ایک بلّے میں مع جن بچہ ——" گلاب نے بمبئی کے گوئیوں
کی طرح کراس کا نشان بنایا۔

"ہے ہے ——" چنبیلی لرز اٹھیں۔

"تو پھر؟ انوکھے چوکھے نے سیما پوری والی بے چاریوں کو کام سے لگایا تو بُرا کیا؟"

"وہ تو سمجھے۔" موگرا نے مختصراً کہا۔ "گُلّو تو یہاں غازی پیر کے احاطے میں بیٹھ کر پھر غلط دھندے سوچ رہا ہے۔ چل۔ میلے میں جا کر رزق حلال ڈھونڈ۔"

"او کے۔ ڈیڈی۔ مجبوری کا نام شکریہ۔" ماں سے بولے "امّاں جی ہم ابھی لّلی گھوڑی کی قبر بھی دیکھ آتے۔ اسکا ایک گیت بھی سیکھ لیا ؎

لّلی گھوڑی پَون پُتری چلے پَون سے آگے
کود سوار بھتے میاں لّلی پر بیری سب بھاگے

دف خرید لاتے۔ اس پر گا کر رزق حلال کمائیں گے۔ غازی میاں کے گیت تم یاد کرو۔"

"ہمیں آتے ہیں۔ امّاں جنیفی بوا شدّا خالہ سب گاتی تھیں ؎

مالنیائیں کالا دے بیلا کی کلی
اللہ میاں کو چڑھیّوں بیلا کی کلی۔"

موگرا دف بجانے لگے ——

"جہی کلی پنج پیرن کو چڑھیّوں
جہی کلی گاجی میاںؒ کو چڑھیّوں
کلی پکارے علیؑ —— علیؑ

اللہ میاں کو چڑھیّوں بیلا کی —— بیلا کی ——" چنبیلی بیگم کی آواز رندھ گئی۔ آنسو بہنے لگے۔

"اوہو —— امّاں —— چلو منہ دھولو۔ کلّی کرو ——" گلاب نے پیار سے کہا۔

کنویں کے شفّاف پانی کی نالی قریب بہہ رہی تھی۔ تینوں نے ہاتھ منہ دھویا۔ موگرا بولے "سبحان اللہ۔ یہاں تو جنّت کا مزا آ گیا —— ٹھنڈی چھاؤں اور بہتا پانی۔ شکر ہے مولا کا ——"

وہ تینوں قیلولے کی غرض سے دری پر لیٹ رہے۔

چنبیلی بیگم نے پیشانی پر ایک بازو رکھ کر آنکھیں موندیں۔ نیند کے جھونکے

—— اپنی ماں جعفر باندی کی انگلی پکڑے بور کے گچھے اٹھاتے بیبیوں بڑے خانصاحب کی گڑھی پہنچ گئیں۔ وہ تھیں یا بیلا۔ نہیں وہ خود۔ امّاں انکو ججمانوں کے ہاں چمکی کا جوڑا پہنا کر لے جاتی تھیں۔ بسنت میں زرد۔ ساون میں دھانی۔ محرّم میں کالا۔ نہیں بیلا تھی۔ گوٹے لچکے والا لال فراک لال ٹوپی پہنے بندیا سی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے سب کو غور اور حیرت سے تکتی ہوئی۔ فرمائش پر فوراً کل کی گڑیا کی طرح کھڑی ہو کر گانے لگتی —— میّا کے روتے تو سب جگ رویا۔ بابل نے کھائی پچھاڑ۔ تو بھوجی کھڑی مسکاتے۔ شدّا خالہ اسے بتاتی جاتیں۔ اتنی اونچی میراثن کہ صرف بیدانیوں اور پٹھانیوں کے ہاں گاتی تھیں۔ جشن ابھی۔ آواز بَن کی کوئلیا۔ جوان بیٹا مرا۔ انکا گلا پٹ۔ بیلا مری تو میری آواز بھی پٹ۔ کہاں گئی؟ جہاں میری لڑکی گئی —— مالنیائیں کالا دے بیلا کی کلی۔ اللہ میاں کو چڑھیّوں بیلا کی کلی ——

کروٹ بدلی۔ گاؤں میں بڑے خانصاحب کا مکان بھتیجے کی ولادت پر نند کنگن مانگ رہی ہے سب نے بھاوج کو سمجھایا۔ سُسر بھی سمجھانے آتے بہواری دے ڈارو ہاتھ کے کنگنوا —— دھیری پردیسن رے —— پردیسی بیرن کا کنگنوا ہیں کیسے دیہوں —— جواب تجھے بھیجوں کبھی نہ بلیہوں —— جیسے میرا بھیّا بھتیجوا۔ جو تم نہ بلیہو میں رتھ چڑھ آیہوں —— ڈھولک کی تھاپ۔ بیویوں کے بشّاش قہقہے۔ کروٹ بدلی۔ ایک چیونٹا کلائی پر رینگ رہا تھا۔ لڑکی کو مرے تیئس سال —— درختوں میں کوئل کُوکی۔ کوؤ کوؤ کوؤ

مورے انگنا چندن لہر لہر کرے ہو
کوؤ —— کوؤ —— انبوا کے پیڑ جھلر جھلر کریں

بند پپوٹوں میں تیز ہریالی۔ اوپر ہرے پتے۔ چاروں طرف پتے۔ آم ہی آم۔ پتوں میں پپیہا۔ پی کہاں پی کہاں —— کوؤ کوؤ —— باپ بیٹے گہری نیند میں ڈوب گئے۔ کنویں کے جگت پر اکڑوں بیٹھا ایک آدمی " بی بی فاطمہؓ کی چادر" کی بلند خوانی بے تکان کئے جا رہا تھا۔ جناب سیّدہؓ کی چادر چنبیلی بیگم کو پہلے

ہی معلوم تھا کہ جو ریں عرش سے لے کر آئی تھیں۔ یہ اہل بیت اطہارؑ اور ائمہؑ کو ملی۔ پھر اولیاء کو۔ اور اب ساری اُمت اس کی حفاظت میں بیٹھی تھی۔ دیہاتی نظم خواں ایک ہی سُر میں یہ سب سُنا رہا تھا۔ چنبیلی بیگم نے جھپکی لی تو شدّا بوا بھی بی بی فاطمہؑ کے گیت الاپتی ملیں —— بی بیؑ کی چوڑی عرش سے اتری ہاتھن پہنیں بی بیؑ امّت قربان۔ بی بیؑ کے گہنے عرش سے اترے سہاگن بنیں بی بیؑ اُمت قربان —— بیلا بھی بویا —— تیس سال آج ناتی پوتوں والی ہوتی —— بیلا بھی بویا چنبیلی بھی بوئی۔ اللہ تیری گلیوں میں برسے نور ——

سرہانے کنویں کی نالی میں پانی شرر شرر بہا کیا۔

اچانک کوئل زور سے چلائی —— عطر پری ——

اللہ جِلائی آج سے ہم تم کو عطر پری پکاریں گے۔ نواب حشمت جہاں بیگم کے البیلے صاحبزادے نے کہا۔

ہائے ہائے ہائے۔

ہائے۔

عطر پری ہو چنبیلی دیوی سینما والی۔ یاسمین بانو بھاؤ نگری۔ لیڈی قوّال۔ ڈھابے والی امّاں چنبیلی۔

ہائے۔ ہائے۔ ہائے۔

پپیہا پکارا عطر پری۔

دوپہر کا گرد آلود سنّاٹا۔

پانی کا شرّاٹا۔ ماسٹر موگرے کے خرّاٹے۔

ٹیٹو ا دبادوں گا سالے بنڈل باز۔ سوتے میں پریزادہ گلاب کی بڑبڑاہٹ کنویں کے من پر بیٹھی ٹیڑی چیخی —— العطش۔

پتّے سرسرائے۔ عطر پری۔ یک لخت کوّوں کا کورس۔ آک کی بڑھیا۔ آک کی بڑھیا۔ آک کی بُڑھیا۔

اے بوڑھا ساری جگہ گھیر لی۔ پرے ہٹ۔

جامن کے نیچے بیٹھے قوالوں کی آواز۔ اے فلک! غیرت! یہ محشر خیز منظر دھوپ میں۔ بانی شر چھاؤں میں، آلِ پیمبر دھوپ میں۔ الٹا سورج کو، پلٹ دینے کا ڈر تھا اس لئے، دھوپ اپنا روپ دکھلاتی ہے بچھ کر دھوپ میں۔

چنبیلی بیگم نے آنچل چہرے پر پھیلا لیا۔ اپنا غم بھول کر آلِ پیمبر کے مصائب پر اشکبار ہوئیں۔ اتنا روئیں کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ دیر بعد خود ہی منہ پونچھ کر چپکی پڑ رہیں۔

نمازِ مغرب کے بعد نعل دروازے کے نقّار خانے میں طبل پر چوٹ پڑی تہجّد کے وقت پھر نقّارہ بجا۔ چاروں طرف رت جگا۔ صبح تڑکے نقّار خانے کی روشن چوکی نے شہنائی چھیڑ دی۔ حصارِ فیروز شاہ تغلق اور مساجد اور پھاٹکوں کے اندر چہل پہل بڑھی۔ نشان اٹھاتے ڈھولک بجاتی "باراتیں" آتی رہیں۔ ان کے گاؤں اور قصبوں کے نام لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنس کیے جا رہے تھے۔ زہرہ بی بی کے "جہیز" کا سامان رجسٹروں میں چڑھا گیا۔

صبح سویرے اس کنبے کو مسافر خانے کے برآمدے میں جگہ مل گئی گلاب چار پیسے کمانے کی فکر میں سرگرداں تھے۔ ناشتے کے بعد شاداں فرحاں دوڑے آتے۔ "ابّا جی۔ ایک آدمی سے معاملہ پٹا لیا۔ عبدالکریم باجی کور۔ کلکتے والا۔ اس کے تمبو میں ایک بائیسکوپ بھی رکھا ہے۔ بولا ہمارے کو یہ بائیسکوپ دکھانے کا ٹائم نہیں۔ ادھر کا پبلک بنگال کا جادو دیکھنا مانگتا۔ تم ٹرائی مارو۔ منافع ففٹی ففٹی، بولا آج کل گاؤں کا بالک بھی ٹیلی ویژن دیکھتا ہے۔ بارہ من کی دھوبن نہیں دیکھتا۔ کیا ہے ابّا کہ اب یہ نٹ لوگ سینما ریل بتاتے ہیں۔ ساتھ گراموفون پر ریکارڈ چالو۔ بنگالی نٹ بولا گاجی میاں کا دوربار اَچھے۔ آمی دینی پکچر لایا ہے۔ نیاز اور نماز میرے غریب نواز۔ دیارِ مدینہ۔ میں بولا۔ ہم خود فلم انڈسٹری کا آدمی ہے۔ یہ پکچر پندرہ سال پیچھو بمبے میں بنا تھا موڈرن اسٹوری بتایا تھا۔ پن ہیرو ہیروئن اونٹ پر بیٹھ

کر مکّہ مدینہ جاتا۔ عبدالکریم بھائی آجکل گاؤں گرام کا بچہ لوگ بھی ہوشیار ہو گیا ہے۔ اسکا باپ، بھائی مکّہ مدینہ میں ایرکنڈیشنڈ گاڑیاں ڈرائیو کرنے چلا گیا ہے۔ حاجی لوگ بو میے سے فلاتی کرتا ہے۔ بازی گر بولا ٹھیک بات ہے مگر میاں بھائی کو اسلام کی شان اونٹ ہی میں دکھتا ہے۔ اونٹ اور کھجور کا پیڑ اس کی آنکھ کی پتلی میں کھڑا ہے۔ میں بولا۔ اچھا کوئی واندہ نہیں اونٹ چلے گا۔ اور ریل تماشہ۔ قلی کا ۸۶، کی برکت والا سین۔ بولا وہ ریل آمی کول کتہ اور باہر گاؤں میں اتنا دکھایا اتنا دکھایا کہ ایک دم گھِس گیا۔ ایک ریل دیش کی شوب دیکھا ہوں کی لایا ہے۔ اور ایک پروفیسر پی۔ سی شور کار کا میجک۔"

نقّال ابنِ نقّال تھے۔ بنگالی لہجہ چھوڑ زوجہ اوّل نعمت بائی کی پونا والی دکنی اردو میں دریافت کیا "اتاں کڑھائی کرچھا ہونا؟ تھال اسٹو و ہونا؟" یعنی چاہیے؟ "موڑی کا ناواں میرے سے لو۔"

"نکو۔" وہ اب آرام کرنا چاہتی تھیں۔

میلہ بھرنے لگا۔ درگاہ شریف کے احاطے کے باہر کچھ دور پر بنگالی نٹ اور اسکی اولاد نظر بندی کے کھیل اور کرتب دکھلاتی۔ اس کے نزدیک ماسٹر گلاب نے سیر بین جمائی۔ انکے مقابل میں دلفروش ناٹک کمپنی آف کاشی پور نے ڈیرہ ڈالا۔

ماسٹر موگرے کو علم تھا کہ نخاس لکھنؤ کے کشمیری بھانڈوں کے مانند ایک زمانے میں کاشی پور اور مراد آباد کے بھانڈ اور نقّال بھی مشہور تھے۔ استاد موگرے اور ماسٹر ببّن خاں مالک دلفروش کمپنی یعنی شو بزنس کے دو ٹائیکون تبادلہ خیالات میں مصروف ہوتے۔

"کام کیسا چل رہا ہے خاں صاحب۔" استاد نے بیڑی سلگا کر پوچھا۔

"مندا۔ جاں بلب ہیں۔" سیاہ مخملیں ٹوپی اتار کر عمر رسیدہ ببّن خاں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "بالے میاں کی بیرق کے میلے ہماری طرف بھی جگہ جگہ ہوہیں مگر — ٹیلی ویزن سے ہماری بدھیا بیٹھ گئی — کلیر شریف کی نوچندی میں مشہور عالم ناچ گانا ہوتا تھا ایک

زمانے سے — لوجی دس پندرہ سال ادھر مولویوں نے اسے بھی بند کرادیا۔"

ماسٹر جی نے خاموشی کے ساتھ اظہار افسوس کیا۔

"اور سرکار دیکھو، بندر نچانے والوں کو پیرس بھیج رہی ہے۔"

"فارن میں نوچندی بھی ہونے لگی؟"

"نہیں صاحب۔ ہندوستانی میلہ۔ ڈھول، تاشے، نفیری، جنگلیوں کی اچھل کود۔ ہبوڑنیں، پہاڑنیں سب چلی جارہی ہیں۔"

خیمے کے اندر سے اہلیہ ببّن خاں کی آواز بلند ہوتی — "اری اٹھّو — منڈوا بھر گیا۔ ڈوبی کی نیند نا بھرتی — اٹھّو —"

"ہماری ہیروین ہے — لاڈو تیلن۔"

"بندہ خدا نام تو بدل دیتے!"

"پبلک میں یہی چل پڑا۔ پچھلی والی جو تھی — ناجو — وہ دولت کی ہوس میں آیا کی پرمننٹ بنوا دوبئی کو نکل لی۔ یہ والی ہمیں میرٹھ کی نوچندی میں ملی۔ تیلی کی لونڈیا ہے۔ گھر سے بھاگ آئی تھی۔ آواز اچھی تھی پر تعلیم پر ہمیں محنت بہت کرنا پڑی۔ خاں صاحب یہ کمپنی والد مرحوم نے قائم کی تھی۔ دال منڈی آگرہ کی ایک سے ایک گانے والی ہمارے کنٹے اسٹاف پر تھی۔ اب کیا کرو۔ وخت بدل گیا۔"

خیمے کے اندر گئے۔ پان کی تھالی لے کر لوٹے۔ "گھر میں سلام عرض کرتی ہیں۔"

"میری دعا کہنا۔" ماسٹر نے گلوری منہ میں رکھی۔

"نیک بخت ذرا چا۔ تو بھیجیو۔" ببّن خاں نے پکارا۔ "شتابی سے —"

موگرے خاں کو صنوبر کمپنی اور قوّال پارٹی کا دورہ یاد آیا دل پر گھونسہ سا لگا مہاراشٹر کے دیہات میں مراٹھی "تماشا" والوں اور لاؤنی ناچنے والیوں کے ڈیرے۔ کرناٹک کا ٹور۔ وہاں پر بے چاری بیلا پر کسی نے بھان متی کا جادو مارا تو بیمار پڑ گئی تھی۔

میزبان نے چاء کا دھندلا گلاس پیش کیا۔ یہ غریب نبّن خاں بھی کب تلک باقی رہیں گے۔ پھر بھی بہت چلائے گئے۔ ہمت کی بات ہے۔

نبّن خاں سے ماسٹر کی گاڑھی چھنی۔ بھانت بھانت کے قصے سناتے ناجو کیسے ملی۔

"ہم گڑھ مکیتسر کے میلے جا رہے تھے۔ قصبہ منڈاور پہنچ گئے۔ ضلع بجنور۔ چاندنی رات میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قلعہ سامنے کھڑا ہے۔ ولایتی قلعہ۔ کھنڈر۔ اس میں پڑاؤ کیا۔ پتہ چلا ایک منشی جی تھے۔ وہ گئے لندن۔"

"آہا۔ حضرت جاتے ہیں لندن۔ کرپا کرو رگھونندن!"

موگرے نے آنکھیں نیم واکیں۔

"جی —؟"

"کچھ نہیں بھائی۔ ایک بات یاد آگئی۔"

"ارشاد۔" میزبان نے حقہ گڑگڑایا۔

"ہمارے واجد علی شاہ اپنے معاملات کے متعلق ملکہ ٹوریہ سے فریاد کرنے لندن جانے والے تھے۔ تو ہمارے اہل ہنود بہت اداس تھے انہوں نے یہ گیت بنایا۔"

نبّن خاں چند لمحوں تک غور کرتے رہے۔ پھر گویا ہوتے۔ "اور اب یہ منشی جی منڈاور والے گئے لندن — ملکہ کو اردو پڑھانے — امیر کبیر ہو کر لوٹے اور یہ قلعہ بطرز ولایت بنوا کر اس میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔"

"واہ۔ واہ۔ واجد علی شاہ اور منشی جی۔ دونوں کے وقت بدل گئے نبّن خاں ملکہ وکٹوریہ کی بدولت ایک کا محل چھوٹا — ایک کا بنا —"

"سبحان اللہ کیا نکتہ پیدا کیا ہے پچا۔"

"نکتہ وکتہ کچھ نہیں۔ ہم تمہیں دلاسہ دینا چاہتے ہیں۔ نبّن خاں قرآن شریف میں باری تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم زمانے کو لوگوں میں اولا بدلا کرتے ہیں۔"

نبّن خاں آنکھ بند کر کے جھوم گئے۔ پھر بولے۔ "حق ہے — تو ماسٹر۔ پھر ہوا بٹوارہ۔ منشی جی کی آل اولاد چلی گئی پاکستان۔ اب دیکھو تو قلعہ کھنڈر۔ اور اسکے اندر جنگل کھڑا تھا۔"

"نبّن خاں۔" موگرے نے بہت گہری سانس بھری "ہمارے تمہارے اندر بھی جنگل کھڑے ہیں۔"

"درست۔ درست۔" نبّن خاں نے کہا۔ "تو یہ لونڈیا صبح سویرے ہمیں قلعے کے ایک کمرے میں گھاس چھیلتی ملی۔ کہنے لگی میرا باپ لکڑہارا ہے گا۔ سات بیٹیوں کی فکر میں ہلکان۔ مجھے شاید بخاسے میں بیچ ڈالے۔ اپنے سنگ لے چلو جی۔ چلو۔ باپ خوش کہ ایک کا بوجھ کم ہوا۔ پر اس کی تعلیم پر بھی بڑی محنت کری۔"

"اسے گھسیارن تو نہیں کہلوایا؟"

وہ خوب ہنسے۔ "نہیں صاحب مس نازنین۔ پر وہ ناجو ناجو ہی مشہور ہوئی پر پرزے نکالے۔ ہمارے علاقے میں ٹھیکداروں نے جنگل کٹواتے، چونے کی کھدائی سے پہاڑ منڈے کر دیتے اور بھی بڑی آفت مچی۔ ناجو کے لیے جیپ گاڑیاں آنے لگیں۔ ہم اترانوں میں سے نہ سہی، شریف تو ہیں۔ بڑی غیرت آئی میری گھر میں بہت بکی جھکیں۔ کہنے لگی تم لوگوں کی تنخواہ میں میرا گذر نا ہوتا۔ تو صاحب وہ بھی پاسپورٹ بنوا کر —"

"طوفانی ٹولی کی ریل ہے کہ چلی جا رہی ہے — گھرررر — گھررر —"

نبّن خاں سمجھے استاد سنیما کی بات کر رہے ہیں بولے۔ "ماسٹر جی ہم رامپور کی نمائش سے سیدھے یہاں کو آرہے ہیں۔ واں کی سنیئے۔ ایک کمپنی بمبئی کی فلمی چھوکریوں کو بھرلائی۔"

"ایکسٹرا گرلیں۔"

"وہی ہوں گی۔ وہ فلمی گانے لاؤڈ اسپیکر پر بجاتے تھے اور چھوکریاں ان پر بے ہودہ ناچ دکھاتی تھیں — خلقت ادھر ہی ٹوٹی —"

مسماۃ امام باندی زوجہ نبّن خاں سے چنبیلی بیگم کی خوب پٹی۔ دن بھر انکے خیمے میں بیٹھی رہتیں۔ لاڈو چاندی کے پری چھم پہنے جھم جھم کرتی میک اپ میں لگ جاتی تو چنبیلی بیگم پھر بیلا کو یاد کرتیں۔ وہ جانہار اسی طرح ٹُنک ٹُھنک چلتی تھی۔

پریزاد ے کہ سدا کے دلفروش تھے۔ دلفروش کمپنی کی ہیروئن کی طرف متوجہ ہوتے پر اس نے گھاس نہ ڈالی —— "وہ سالی اپنے آپ کو سری دیوی سمجھتی ہے۔" انہوں نے عبدالکریم باجی کور سے شکایت کی۔

اس گوشے میں بہت رونق رہی۔ باجی کور اپنی اڑنگ بڑنگ ہانکتا تھیٹر کے منڈوے میں طبلے کی زوردار تھاپ پر گانے کی آواز بلند ہوتی —— راجہ جم جم چھم چھم چمکت آج —— چھتر سیس پر گھوم گھوم تن دمکت چمکت مُلک فلک تک —— برتر مرود آسمان تک —— واہ —— واہ کا ڈنکا —— کڑ کڑ —— چندرما تک تک لجات راجہ ——

تیسری جانب ماسٹر گلاب بھونپو منہ سے لگا کر حلق پھاڑتے —— آؤ آؤ —— پیارے بچو —— بالکو —— نونہالو —— راجہ اندر کے طلسمات دیکھو۔ باغیچہ سلیمانی دیکھو —— پل میں حاضر —— پل میں غائب ——

اللہ غنی —— ماسٹر موگرے کو یاد آتا۔ وہ پہلی بار قمر میاں سے ملنے گئے تھے صنوبر کمپنی کا اشتہار پڑھ کر انہوں نے کہا تھا یہ فلم کمپنی ہے۔ یا کمپنی باغ —— انہوں نے فوراً جواب دیا تھا —— جی ہاں بلکہ باغیچہ سلیمانی —— !

اللہ غنی۔ باغیچہ سلیمانی یا ریڈ روز گارڈن۔ پل میں حاضر —— پل میں غائب۔

گلاب خاصے ذہین تھے۔ اس خطّے کے لوگوں کے انداز میں پکارتے۔ تشریف لائیے باجی —— بٹیا —— حسینؑ پاک کی ضریح مبارک —— وارث پاکؒ کا روضہ —— میرے غریب نواز۔ دیارِ مدینہ، نیاز اور نماز پچھر کے سین —— آئیے بھیّا —— آئیے اپیا —— بائیسکوپ کے نزدیک بچھے ٹاٹ پر ماسٹر متمکن تھے۔ ایک گتے پر "پروفیسر سامری آف بمبئی" اردو، ہندی جلی حروف میں لکھوا کر سامنے رکھ لیا تھا۔ پروفیسر سامری بمبئی کے مقبول و معروف منجم اور عامل تھے۔ چند سال قبل رحلت کی —— یہاں انہیں کون جانتا تھا۔

بریلی کا سرمہ اور منجن بیچنے کے لئے گلاب جو ہو بمبئی کی چوپاٹی پر مجمع لگا چکے تھے۔

سیربین کے لئے پکارتے پکارتے دوسری ہانک لگاتے "آئیے مہربان قدردان بھائی جان، ماتاجی، دیدی، چاچا —— فلم اسٹاروں کے ذاتی اسٹرولوجر —— مشہور جیوتشی۔ پامسٹ —— عامل —— پروفیسر سامری آف بومبے —— مقدمے میں کامیابی —— محبوب سے ملاقات —— مطلوب سے شادی —— دشمن کی بربادی —— دھندا بیوپار —— ابو ظہبی میں روزگار —— پانچ روپئے —— صرف پانچ روپئے ——"

جیٹھ کے پہلے اتوار کو بارات کے دن حسب معمول زور کی آندھی آئی۔

میلہ ختم ہونے والا تھا۔ گلاب نے عبدالکریم سے حساب کتاب کیا۔ سیربین لوٹائی۔ ماں سے کہا "چلو چھوٹ لیں ورنہ بسوں میں جگہ نہیں ملے گی۔"

والدین ننّن خاں اور امام باندی سے بچشم پرنم رخصت ہوئے۔ چاروں نے ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کروایا۔ چنبیلی بیگم رونے لگیں۔ امید پرست موگرے نے انہیں بھی دلاسہ دیا۔ "اجی روتی کیوں ہو۔ انشاءاللہ پھر جلد ملاقات ہوگی۔"

"لب گور ہیں۔ اب کیا ملاقات ہوگی —— !" چنبیلی بیگم نے جواب دیا۔

"لشتم پشتم بمبئی پہنچ جائیں تو غنیمت جانو ——" زمین پر اُکڑوں بیٹھ کر انہوں نے اپنا بکسا کھولا۔ ایک تصویر نکال کر امام باندی کے حوالے کی "بیٹیا یہ تم ہی رکھ لو۔ نشانی۔"

"بیلا ہیں گی —— ؟"

"تمہاری چچی ہیں" استاد موگرے نے کہا۔ کاشی پور والے ان دونوں کو چچا چچی کہنے لگے تھے۔ ننّن خاں اور امام باندی مبہوت رہ گئے۔

"بطور گل بکاؤلی کی بیٹی!" موگرے نے مزید اطلاع دی اور مسکراتے ——

"اللہ تعالیٰ کلام مجید میں فرماتا ہے ہم جب چاہیں ان کی شکلیں بدل سکتے ہیں —— —— خانصاحب۔ وَخت انسان کو اِدھر سے اُدھر کر دیتا ہے۔ چلو نیک بخت۔ منڈوا اُٹھا۔ ٹاٹ اٹھاؤ اور ٹٹّو کھولو۔"

رختِ سفر سنبھالے وہ تینوں زنجیری دروازے کے سامنے سے گزرے ــــ ماسٹر بولے "چلو منت مانتے چلیں"۔

"اب کا ہے کی؟" بیٹے نے اچنبھے سے دریافت کیا۔

"بہار صاحب کہہ رہے تھے امریکہ میں کباب پراٹھے کا ریسٹوران ــــ ہمارا دل کہتا ہے اس میں ضرور کامیابی ہوگی"۔

گلاب نے سفری بیگ کاندھے سے آتار کر ایک فلک شگاف نعرہ لگایا ــــ "حق ہے ــــ" اور زمین پر لوٹنے لگے۔

ہلدیا غرارہ دھانی دوپٹے میں ملبوس ایک دیہاتی عورت پاس سے گزری ٹھٹھک کر چنبیلی بیگم سے پوچھا "حال آرہا ہے؟"

"ہاں"

"کون بُجرگ ہیں۔؟"

"بابا لوٹن کبوتر" والدہ نے تلخی سے جواب دیا

عورت نے اپنی راہ لی۔

"ارے کیا گدھے سری کا لوٹ رہا ہے۔ مائی ملے" ماں نے ڈانٹا۔ غصے میں وہ بلیغ بمبیا اردو بولنے لگتی تھیں۔

پریزادہ دولتی جھاڑ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے قریب آکر بولے "ارے ممی جی کیا ہے کہ نا آفتابِ موسیقی نا پدم شری استاد امام بخش آف امید پور گھرانا کی بات سنکر میرے کو وجد آگیا"۔

"نالائق۔ہم کیا خوجی ہیں؟ جانتا نہیں مایوسی کفر ہے؟" اب باپ نے ڈانٹا۔ اور پھاٹک کی ایک توپ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔

"جی ہاؤ! اور ڈیڈی جی کیا ہے کہ ماں کی دُعا فوراً اثر کرتی ہے۔ ادھر ممی نے ایک لیڈیز کو بولا بابا لوٹن کبوتر اور ہم فوراً وہی بن گئے بلکہ سائیں کملی پوش دلفروش۔

اب لکھنؤ سے سیدھا داور اسٹیشن وہاں سے سیدھا ماہم درگاہ بساؤ تھ بوَبے کا کونا چلو تراجی پکڑے گا نار تھ بوَبے کو ہم سنبھالے گا۔ سائیں دلفروش ــــ چھتریس پر گھوم گھوم کر "تن دمکت چمکت مُلک فلک تک!" ہاتھ سے تال دیتے آگے بڑھے۔ "ہم پروفیسر عبدالکریم آف کامروپ کا اسٹوڈنٹس رہ چکا ہے۔ ہوا سے وِبھوتی نکالنے سکتا ہوں ماں! ــــ بولو تو تم دونوں کو کبوتر بنا دوں ــــ"

"جا میرے چاند ــــ اب دور کشائیں لے آ ــــ" ماں نے التجا کی ــــ "بڈھا ہو گیا مگر ــــ"

"اے امّی حضور ــــ بھانڈ کبھی بوڑھا ہوتا ہے؟ چندر مان تک تک لجات" بھاؤ بتایا۔ لُو چل رہی تھی۔ چاروں طرف اڑتے زرد پتے گلاب کے ساتھ چکّر کاٹنے لگے۔

"ارے کیا باؤلا ہوا ہے" چنبیلی بیگم نے اکتا کر جماہی لی۔ بھوپالی بٹوے کی ڈوری کھینچ کر چونا تمباکو نکالا۔ تھوڑا سا چونا درد سر کی وجہ سے کنپٹیوں پر لگایا۔ کیسی مصیبت۔ کیسی کلفت۔ کیسی تھکن۔ دُھول اور دُھوپ اور زرد پتوں اور گداگروں سے پٹا ہوا سارا رستہ تو ابھی قبر تک کا باقی تھا۔ اپنے شریکِ حیات کے قریب جا بیٹھیں۔ نہ جانے کون سے گورستان تلک ہم دونوں کے جنازے پہنچانا اس ہمارے نورِ نظر لختِ جگر کے لئے زیادہ آسان رہے گا ــــ جوہُو ــــ بائیکلہ ــــ ناریل واڑی ــــ

گلاب نے اپنی زرق برق الیکٹرونک رسٹ واچ پر نظر ڈال کر والدین کو مخاطب کیا "چلو اٹھو بسم اللہ۔ یا علی مدد ــــ"

کنبہ بس اڈے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں زائرین جوق در جوق انار کلی جھیل کی سمت جاتے نظر آتے۔

---

⑪ ڈسکوری آف اے کلچر ہیرو

"چاسر کے کنٹربری والے انگلستان کی طرح خلق خدا بھانت بھانت کی سواریوں پر یا پیدل ایک قدیم زیارت گاہ کی جانب امنڈی چلی آ رہی ہے۔

"میں آب پارے کے نزدیک ایک 'مقدس چبوترے' کی سیڑھی پر بیٹھی تم کو یہ خط لکھ رہی ہوں ـــــ برگدوں کی پیچیدہ شاخیں ایک طویل و عریض ہال کی چھت کی مانند پھیلی ہوئی ہیں۔ ہرے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے رنگ برنگی پوشاکیں پہنے مسلم عوام نیلگوں جھیل کی طرف جاتے دکھلائی دے رہے ہیں۔

"شرائین کے باہر ایک حوض میں جذامی نہا کر کہا جاتا ہے کہ اچھے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں ویلیٹ میں (ذرا رک کر "ہمارے ہاں،" قلمزد کیا) لورڈ ـــــ غالباً حوض کے پانی میں گندھک ہے۔ شفا بخش انار کلی جھیل کی طرح جو متبرک بھی تصوّر کی جاتی ہے ـــــ"

"ماموں میاں آپ اب کچھ برنارڈ شا سے لگنے لگے ہیں کچھ ٹالسٹائی۔ اور تھوڑے سے مہارشی اور بندو ـــــ" پنکی کی شگفتہ آواز۔

"ہم فریج کٹ داڑھی رکھتے ہیں۔ مہارشی اور بندو کی چینی سی تھی۔ ہم فلوطی النفلوطی ہیں۔"

وہ لوگ جھیل کے قریب پہنچ گئے۔ فیروزہ نے نامکمل خط بیگ میں رکھا۔ مانک باقی ہولی واٹر سے اشنان کے دُھن میں ماہیتی کا بہتی پانی کی طرف گامزن تھیں۔ زرینہ اور رانی دُلہن نے دُھوپ میں پیدل چلنے سے انکار کیا تھا۔ اس سیلانی گروہ

میں شامل نہیں تھیں۔ وہ سب بھی آن کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ میزبان کی خادمہ ظہورن بُوا نے کہا۔ "اچھا ہوا آپ لوگ آج تشریف لائے۔ کل مکنا دیوا ہیے۔ سارے میں دُھوئے دُھول۔"

فیروزہ نے آنکھیں پھیلائیں۔ "کیا ہم لوگ پرستان میں آنکلے ہیں یا داستان گل بکاؤلی کے اندر بیٹھے ہیں۔"

"مکنا دیو آندھی ربرات کے لیے جھاڑے بہارے ہر سال ایکئے وقت پر آوت ہے۔ ڈیوٹی پر۔ مگر جھگڑے سے نقصان کسی کو نہیں ہوت ہے۔"

"ارے یار یہ ڈسٹرکٹ دو تین ندیوں کی گھاٹی ہے۔ اس قدر تو یہاں گرد اُڑتی رہتی ہے۔ مکنا دیوان ڈیڈ!" پنکی چپکے سے ہنس پڑے۔

"مگر ہر سال ایک ہی روز ایک ہی وقت کیوں؟ عین برات کے روز۔ مشرق بالکل قطعی پُراسرار ہے" پنکی "اسے پُراسرار ہی رہنے دو۔"

"ہاں۔ پُراسرار اور مفلس اور اوہام پرست۔ برائین مورلینڈ کو یہی سب تو اچھا لگے گا۔" پنکی کو دفعتاً اپنے لہجے کی تلخی کا ہوا۔

پروین سلطانہ نے فوراً بات سنبھالی "تم لوگ قصّہ تو سُن لو۔ ہاں ظہورن بُوا!"

"بیگم صاحب ردولی میں زہرہ بی بی جون رہیں۔ بڑی ہی خوبصورت اور نیک۔ بے چاری اندھی رہیں۔ سیّد صاحب ہُو بہتے حسین رہے۔ ایک روز لِلی گھوڑی پر سوار زہرہ بی بی کے دروازے کے سامنے سے گزرے۔ ان سے ایک کٹورہ پانی مانگن۔ اُو کہن ہم اندھی ہیں پانی کیسے لاویں۔ گاجی میاں کہن جاؤ لیکر تو آؤ۔ ای گھڑے سے پانی لائیں۔ تو آنکھیں روشن۔ سیّد صاحب بہرائچ آکر ان کے باپ کے پاس پیغام بھیجن۔ بٹیا بُدھ کے روز یہاں سے ایک آدمی ردولی جات ہے ـــ" ظہورن بُوا کے لیے سارے زمانے یکساں تھے بلاتعین مدت۔

"ارے تب کی بات تو بتاؤ۔"

"اِدھر تاریخ مقرر ہوئی اُدھر گاجی میاں لڑائی میں شہید۔ پھر گاتے بجاتے باراتی ردولی والوں سے خوب ہنسی مذاق کرت ہیں۔ لڑکی والے کہت ہیں اپنی بہنی کو کیوں نہیں لائے —"

"بہنی کو کیوں نہیں لائے کیا مطلب ؟" فیروزہ نے پوچھا۔

"درگاہ کے باہر دو پلنگ بچھت ہیں ان پر آم۔ کبھی بھی پکیں آم کی سیر اس روز ضرور ٹپکت ہے۔

"ٹھیک صبح چار بجے پنڈت پوتھی بانچ کر چلات ہیں پچکا لگ گوا۔ پچھڑوں میں جھگڑا ہو گوا — بیاہ اگلے سال — یہاں بھی یہی سب ہوت ہے۔ بنارس کے پنڈت آن کر پوتھی بچارتے ہیں۔ صبح چار بجے پچکا لگ جات ہے۔"

"اسی لیے کہاوت ہے۔ بالے میاںؒ کا بیاہ جو برابر ملتوی ہوتا ہے۔ کم از کم ایک اردو کہاوت کا منبع تو تم نے دیکھ لیا!" پنکی نے فیروزہ سے کہا۔

وہ جھیل کی طرف جانے کے لیے اُٹھے۔

کچے راستہ کے دونوں جانب رنگ برنگے غرارے دھوپ میں سوکھ رہے تھے۔ "ارے رے وہ دیکھو کارچوبی غرارہ جھاڑی پر۔" فیروزہ چلائیں۔

"میلے ٹھیلے میں جنتا اپنے بہترین کپڑے پہن کر آتی ہے۔" پنکی نے جواب دیا۔

وہ کنارے پر پہنچ گئے۔ بہت دور سرکنڈوں کی اوٹ میں جاکر عورتیں کپڑوں سمیت پانی میں ڈبکی لگاتیں۔ نہایت مہارت سے لباس تبدیل کر کے باہر نکلتیں۔ بھیگے کپڑے دھوپ میں پھیلاتی جاتیں۔ مانک بائی اس جانب دوڑ گئیں۔

ایک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کیچڑ میں پڑے پتھروں پر پاؤں رکھتے گزرے۔ بیوی نے برقعہ اتارا۔ "جلدی آنا بس تیار کھڑی ہے۔" انھوں نے کہا۔

خوش منظر تال کے چاروں طرف سرسبز کشت زار لہلہا رہے تھے۔ کنارے کنارے سطح آب پر گل نیلوفر کھلے تھے۔ ظہورن بوا نے کہا: "اللہ کی قدرت ہے۔ گاجی میاں یہاں بیٹھ کر وجو کرت رہے۔ بوند بوند تالاب بن گوا۔" وہ مانک بائی کے کپڑوں کا بیگ اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے بھاگیں۔

چگی داڑھیوں والے تہمد پوش آدمی اور ساری پوش عورتوں کی ایک ٹولی آپہنچی۔ عورتیں سرکنڈوں کی طرف چل دیں۔

"پنکی دیکھو ورکنگ کلاس، کسان ایک عورت برقعہ پوش نہیں۔ سوا ان کے جو شہروں سے آئی ہیں۔" شہلا نے پنکی سے کہا۔ بحیثیت قانون داں وہ شاہ بانو کیس کے دنوں میں بہت مضطرب رہی تھیں۔

"اپی۔ ہم لوگ ساری عمر بیٹھے یہ تجزیاتی مطالعے کرتے رہیں مولوی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔"

نوواردوں میں ایک سفاری سوٹ والا نوجوان بھی شامل تھا۔

"بنارس یا مرزا پور کے جولاہے۔" پنکی نے فیروزہ سے کہا۔

ایک بزرگ صورت سفید ریش بڑے میاں ساتھیوں کو کسی جیب کترے سے اپنی مڈبھیڑ کا قصہ سُنا رہے تھے۔

"پہلے تو اُو ریزر سے ہمگوا کاٹ دیہس۔ ہم ہمگوا کا جکڑ لیہن۔ پھر اُو بڑے جور سے ہمگوا کھینچس۔ ہم ہُو کھینچن۔ تو صاحب ایسے ایسے جبردست ہوت ہیں جیسے ہم۔"

رفقاء نے توصیفی قہقہہ بلند کیا۔

"واہ واہ۔ ابا — کمال کر دیہن۔" سفاری سُوٹ والے نے کہا "پاکٹ مار کے ہتھوا سے چھین لیہن — !" — وہ ورکی میاں کی طرف آیا۔ "سلاما لے کم —" فوراً بزنس شروع کر دی۔ وزیٹنگ کارڈ پیش کیا۔ "ہم سال میں دو بار لکھنؤ میں بھی پھیری لگاتے ہیں۔"

فیروزہ نے ہنسی سے کہا "کمال ہے۔ تم نے کہا — بنارس کے جولاہے۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ لکھنؤ۔"

"ہم بھوجپوری اور اودھی بولیوں کا فرق نہیں پہچان سکتے؟ اور ہم لوگ کیا مریخ کے باشندے ہیں جو وہ نہ پہچانتا؟ یار تم بہت غبی ہوتی جارہی ہو۔"

"یار یہ پوٹھوہاری اور ملتانی کا فرق نہیں جانتی۔" ڈِنکی نے بہن کی طرفداری کی۔

"اگر وہاں رہتی تو ضرور جان جاتی۔"

چینی ریشم کی شلوار قمیص میں ملبوس پروین سلطانہ اور فیروزہ پر نوجوان نے اچٹتی سی نظر ڈال کر پروین کو مخاطب کیا۔ "بیگم صاحبہ۔ شلوار سوٹ۔ دُلہن کا شرارہ سوٹ۔ دولہا کی شیروانی — اعلیٰ ترین کمخواب لے جایئے۔"

برائین کے لیے شیروانی! فیروزہ نے مضبوطی سے سوچا۔

وہ صفیہ۔ شہلا، آمنہ، سلیمہ اور رہناز کی طرف متوجہ ہوا۔

"بیٹا۔ اس موسم کے لیے بہترین زری کا تھان —"

نوجوان سمیت بنارسی گروہ جب روانہ ہوا پروین نے کہا "یہ لڑکا مجھے بھی الگ سے پہچان گیا۔"

"بہنی خالہ آپ کے ہاں سے بیگمات جہیز خریدنے بھی تو آتی رہتی ہیں۔"

"یہ دیبا و حریر کے تاجر—" وِکی میاں نے حسب معمول کہیں بہت دور پہنچ کر بات کی۔ "شاہرہ ریشم پر چلتے ہوئے ایک عالم کا تجربہ رکھتے آئے ہیں۔" وِکی میاں کے پاس پہنچ کر معمولی سے معمولی بات ایک عجیب عالمانہ، فلسفیانہ بلکہ مابعد الطبیعاتی کیفیت اختیار کرلیتی تھی۔

مانک بائی ڈبکی لگا آئیں۔ وہ واپسی کے لیے اٹھے۔

ایک نیچے سے ہرے بھرے ٹیلے پر بھورا مختصر امام باڑہ نظر آیا۔ اندر ایک سُرخ تعزیہ رکھا تھا۔

"کربلا" ظہورن بوا نے بتلایا۔ "ہم سنّت جماعت لوگن کی —"

متعدد تعزیے ہری زمین میں نیم مدفون بڑے ہی اداس سے لگے۔

وِکی میاں ٹھٹھک گئے۔ "عجیب بات ہے۔" وہ چند سکنڈ کے توقف کے بعد چاروں طرف دیکھ کر بولے۔ "اس بھوری عمارت کے اندر رکھا یہ تنہا سُرخ تعزیہ۔ اور میکزیکو کے سنسان کھنڈر۔ اچانک وہی پُراسرار سی فضا۔"

"کھنڈر بارونق بھی ہوتے ہیں۔" حقیقت پسند پروین نے چھتری کھولتے ہوئے پوچھا۔ "تاریخ کے اندرونی مظاہر کی روح یکساں ہے۔"

"اور وِکی بھیا یہ اندرونی مظاہر کیا ہوتے ہیں؟"

"— اہرام — بعلبک — پیٹرا —"

"تم ہم سب کا اس دھوپ میں پیٹرا نہ کرو۔ چلو آگے بڑھو—" پروین نے بڑے بھائی کو پیار سے ڈانٹا۔

ہری، آبی، نیلی، نکھری سی بے کنار خامشی میں ایک بچے کی صاف، نئی نویلی آواز بلند ہوئی۔ وہ امام باڑے کے پیچھے اکیلا بیٹھا نہایت تندہی سے پندرہ کا پہاڑا رٹ رہا تھا۔ "چو کا ساٹھ" — پچے پچھوتتر — چھی کا نبّے — سُتی پانچا — اٹھی بیا — نوپنتیا — دہی کا دہنا ڈیڑھ سو —"

"اے منظور بھیا — چلو —" کسی عورت نے دور سے پکارا۔

"آتے اماں —" وہ پشتے پر سے کود کر تال کی طرف بھاگا اور اپنے گھر والوں کے ساتھ چلتا جنگل کی ہریالی میں کھو گیا۔

"عجب ہے روش اور عجب باغ ہے" پنکی گنگنایا کیے۔ تینوں نوجوان عہد شجاع الدولہ کے رَوکو کو قدم رسولؐ کی سیڑھیاں اترے۔ دونوں بھائی ننگے سر۔ فرامروز مجوسی نے رومال باندھ رکھا تھا۔ پگڈنڈی پر ماموں بھانجی ٹہلتے نظر آئے۔

تینوں نے نزدیک پہنچ کر وِکی کو سلام کیا۔ "عجب ہے روش ——" پنکی پھر گنگنائے۔ "ماموں میاں کل منڈدے کی اسٹیج پر کوئی گویا الاپ رہا تھا —— ہمیں دور سے سنائی دیا۔ کل سے ہم فری کا رمسٹریس ایسٹ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ شاید شیخ طاہر علی کے روزہ اُوس کا موتیف بھی یہیں مل جائے۔ تغلق سے لیکر جان کمپنی تک کی تعمیرات تو یہاں موجود ہیں۔"

وہ پانچوں ایک دیپ استمبھ کی طرف بڑھے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔

"جنگلوں اور کھیتوں میں" پنکی نے بات جاری رکھی —— "ایسے مینار دیکھے جن کے لیے کہا گیا —— کہ وہ میدان جہاد کے ملٹری ٹاور تھے —— غازی میاں کی شہادت کے بعد زہرہ بی بی نے بطور یادگار تعمیر کروائے تھے —— ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈپارٹمنٹ آف سروے نے جانچ پڑتال کے لیے تعمیر کیے تھے۔ یہ آخری بات ہمیں درست لگی لیکن اسراریوں ہی جنم لیتے ہیں۔"

"بہت سے اصلی بھی ہوتے ہیں یار۔" فلی نے کہا —— "پرانے بنگال کے مندر مٹھ دیکھو۔ سولِڈ مسٹری۔ وہ نامعلوم کیفیت جو محسوس کرنے کے علاوہ دکھلائی بھی دیتی ہے۔ سولِڈ۔ وہ مغل عمارتوں میں نہیں ہے۔ سلطنت پیریڈ میں بے حد۔ کیا محض زمانے کا فاصلہ یہ مسٹری پیدا کرتا ہے؟"

"اور وہ کون سا لطیف تر عنصر ہے ماموں میاں جو مختلف خطوں کے فنکاروں اور معماروں کے بالکل اندرونی وژن کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے؟" پنکی نے سوال کیا۔ "محض نسلی حافظہ اور قومی مزاج اور جغرافیائی اور تہذیبی ماحول ——؟"

"انکل وِکی —— وہ کیا شے ہے —— وہ ایکسٹرا چیز —— جو یورپین

اور روسی آرٹسٹوں سے بچوں کی پرستانی کہانیوں کے السٹریشن بنواتی ہے ——؟ کیا محض تخلیقی تخیل —— بھی کہتی ہیں۔ بندرابن میں چھاؤندی کے کنارے چھاؤ کے پیڑ لگے ہوتے ہیں اور سننے والوں کو چاندنی راتوں میں وہاں دور کہیں بانسری بجتی سنائی دے جاتی ہے ——"

"فلی بھی گیا کام سے۔ ماں کا اثر کب تک نہ ہوتا۔" پنکی نے ڈِنکی کو چپکے سے مخاطب کیا۔

صفیہ دکھلائی پڑیں۔ حسب عادت گروہ سے الگ ہو کر ایک پیڑ کے نیچے عزلت نشین تھیں۔

"صفیہ ہم بھی یہاں بیٹھ جاویں؟" وِکی میاں نے نرمی سے دریافت کیا۔

انہوں نے سر نیہوڑا کر معذور بازو پر آنچل لپیٹا اور ذرا سی سرک گئیں۔ وِکی میاں کا جی بھر آیا وہ اب آرینک[1] صحائف کے مصنف ایک قدیم رشی کی طرح درخت کے سائے میں بیٹھے گویا کسی اپنشد کا درس دے رہے تھے۔

"فیروز شاہ تغلق کے دور میں ——" گرو نے ارشاد کیا۔ "ایک بڑے بزرگ میر محمد ماہؒ شاید اسی جگہ کُٹی بنا کر رہتے ہوں۔"

"عجب یہ روش اور عجب باغ ہے ——" پنکی پھر گنگنائے۔

"کل رانا صاحب نے ہمیں ایک عجیب واقعہ سنایا —— والدہ سلطان نے منت مانی تھی کہ فیروز جنگ ٹھٹھہ سے کامران لوٹے تو ——"

ٹھٹھہ —— !؟ فیروزہ چونکیں۔ بہرائچ کے اس باغ میں ٹھٹھہ کہاں سے آگیا؟

---

[1] جنگل میں تصنیف شدہ کتاب

"جام فیروز سلطان فیروز سے مل گئے تھے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ فتحیاب ہو کر سلطان حاضری دینے یہاں آئے اور میر محمد ماہ علیہ الرحمہ سے ملاقی ہوئے۔ جب رانا صاحب یہ قصہ گوش گزار کر رہے تھے' ہم نے سوچا۔ جام فیروز۔ جام تماچی ــــ سُرسامندری ــــ افسانہ ــــ

"وقایع فیروز شاہی ــــ افسانہ ــــ

"اور جب رومانس رومانس سے بھڑ جائے تب بھی خونریزی ــــ" وِکی میاں دفعتاً خاموش ہو گئے۔

"جام صاحب نوانگر کرکٹ کے مشہور کھلاڑی تھے نا ــــ ؟" فیروزہ کی آواز نے سکوت منتشر کیا۔

رینکی محظوظ ہوتے۔ "فیری ــــ تمہارے سوالات لاجواب ہوتے ہیں!"

"آپ نے وہ میر محمد ماہ اور سلطان فیروز شاہ کی حکایت نہیں بتلائی۔" ڈِنکی نے یاد دلایا ــــ

"کرامات کے متعلق تھی۔ تم لوگوں کے ورلڈ ویو سے باہر۔"

سورج ڈوبا۔ مدھم کرنوں میں زیارت گاہ مزید چند لمحات تک دمکتی رہی۔ وِکی میاں کہنے لگے ــــ "جس مقام پر صدیوں تلک محض عبادت کی جاوے۔ وہاں کی ٹون مختلف سی ہو جاتی ہے۔ اسے الڈوس ہکسلے وایٹ میجک کہتا ہے۔ یہ جگہ خالص خامشی کا ایک جزیرہ سا نہیں ہے؟"

"نمائش گاہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ہے اور زیادہ لوگ ادھر آتے نہیں۔" رینکی نے ڈِنکی سے سرگوشی کی۔

فلی ہنوز رومال سے سر ڈھانپے بغور سن رہا تھا۔

"قدیم مسجدیں اور قدم رسولؐ کی زیارت گاہیں ــــ" وہ کہتے رہے۔ "قصبات میں بھی ایک عجیب کیفیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ پری کتھا ایسی۔ سایہ دار کہنہ

درختوں اور ہرے کھیتوں میں گھری ــــ اندر ٹھنک' رنگین چٹائیوں پر بیٹھے نمازی۔ نیلگوں حوض۔ اوپر کھرنی اور مولسری کی سرسراتی ڈالیاں۔ گویا شیشہ پانی ندی کی سطح پر ماوراتی تصوّرات کا عکس۔"

"شیشہ پانی ــــ!" رینکی نے گھڑی دیکھی۔ "راتوں رات ہی اُدھر نکل لیں۔"

"یہ بے مایہ' بے علم خلقت۔" ماموں نے میلے کی سمت اشارہ کیا۔ "اس مخفی جہت کو چھو لیتی ہے۔"

"میں بھی چھو لیتا ہوں انکل؟" فلی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہم کیوں کٹ گئے؟" فیروزہ نے سوال کیا۔

"مکمل طور پر نہیں۔ مجھے یقین ہے تمہاری ہڑدنگی جنریشن کم از کم لمحاتی طور پر اس کائنات سے ایک رابطہ سا محسوس کر سکتی ہے۔"

"احساس تشخص کے لحاظ سے یقیناً۔ تخلیقی تخیل کے وسیلے سے شاید۔ لیکن جسے آپ وجدان' عرفان وغیرہ کہتے ہیں اس کے ذریعے ــــ مجھے افسوس ہے کہ ــــ نہیں!!" فیروزہ نے جواب دیا۔ اور آم کے ہرے پتے پر رینگتے چیونٹے پر نظریں جمائیں۔ برابر کے میدان میں تماشا گاہ جگمگا اٹھی۔ سرکس اور کارنیوال کے تنبو۔ مداریوں کے ٹانڈے۔ تماشہ گروں کی خیمہ گاہ۔

"شنکر شمبھو قوّال ــــ" ایک قنات کے پیچھے سے آواز آئی "خلیفہ جی ــــ"

"ہاں خانصاحب ــــ کہے جاؤ ــــ"

"لڑکے سے تھے دونوں بھتیجے۔ اسی جگہ ان کو لیلیٰ مجنوں کے سوانگ میں دیکھا۔"

"خانصاحب' پہلے آدمی کا ٹائم قبوتر کی طریوں اڑ جاتا ہے۔ پھر آدمی خود۔" حقّے کی گڑگڑاہٹ۔

"خانصاحب۔"

"ہاں۔ خلیفہ جی۔"

"کل شام ایک عدد بمبیا جنٹلمین گھروا گاڑی میں آدھمکے۔"

"کاروان کار کہو۔ خلیفہ جی۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"نواب صاحب گڑبھلی نے آنکھ کا نشہ کے شو سے خوش ہو کر ابا کو بخش دی تھی۔ ان مرحوم نے عرض کی سرکار اس محل رواں کے لیے موٹر خانہ بھی سلیمانی ہووے اور موٹر خانہ ہووے تو بنگلہ ——"

"فرمایا حافظ جیدا —— ہماری طبیعت خوش کرتے رہو گے تو وہ بھی مل جائے گا۔"

"کھینچو متی خانصاحب۔"

"تب کا واقعہ ہے جب پہاڑ پر ہز ہائی نس کی تین برابر برابر کی کوٹھیوں ان کی تین منظور نظر ایک وقت میں رونق افروز تھیں۔ تسنیم بانو۔ دینار اختر۔ اور کلکتے کی کٹی۔ اینگلو انڈین۔"

"خانصاحب۔ رات گئی بات گئی۔"

"ہمارے بھی بڑے ٹھاٹ تھے خلیفہ جی۔ اس کاروان کار پر اللہ بخشے ابا جی کے ساتھ لاہور تلک گھومے۔ وہاں راوی روڈ پر ایک طرف ہمارا کیمپ دوسری طرف جہاں آرا کمپنی میں کجن کے جلوے۔ ابا نے گاڑی پر انگلش میں لکھوا رکھا تھا۔ دلفروش تھیٹرز۔ ڈوُن وَیلی۔ جب ہمارا ٹائم بگڑا اسے بیچنا پڑا۔"

"فی الحال کا ماجرا سنو خانصاحب وہ صاحب دکھیارے دھاڑی دھاڑن کو ڈھونڈتے ادھر آئے تھے یہاں ٹکرا گئیں ہڑدابیگنی لاڈو۔ پیچھے پڑ گئیں۔ سیٹھ۔ سنی۔ ہمیں چانس دلا دو ہمیں سنگ لے چلو۔ وِن نے منع تو کر دیا پر اپنا کارڈ دے گئے۔"

حقّے کی گڑگڑاہٹ۔

"چشتیوں کا ایک وظیفہ ہے گا —— آج کل پرسوں —— اُڑجا بھنبھیری ساون آیا —— خانصاحب —— لاڈو اُڑی اور بدھیا بیٹھی۔"

"دلفروش ناٹک کمپنی —— ! اہاؤ کیوُٹ —— !!" قدم رسولؐ سے واپسی پر قنات کے سامنے سے گزرتے ہوئے فیروزہ نے کہا۔

سرحد نیپال پر راپتی کی شاخ شیشہ پانی کے کنارے وہ سب سیر و شکار میں مشغول تھے جب ایک سفید کاروان کار ہرے پیڑوں میں چمکی۔

"دِجے ماتا فاؤنڈیشن۔ سان فرنینڈو ویلی۔" ڈنکی نے کالا چشمہ اتار کر آواز بلند پڑھا۔

ادق زبانیں بولتے چند لاما ظاہر ہوتے فوراً بدیسی وضع کے بڑھیا خیمے نصب کرنے میں جٹ گئے۔ پھر ایک سمارٹ بزنس ایگزیکٹو نما نوجوان۔ آخر میں ایک شُرشندری، قدیم رومن وضع کا ٹوگا —— زعفرانی۔ جذبات سے عاری کتابی چہرہ چھریرا لانبا قد۔ گویا روم کی کوئی فیشن موڈل۔ اس نے ایک پاؤں ندی کے پانی میں ڈالا اور چٹان پر بیٹھ کر فی الفور للت آسن جمالیا۔

کالج کے چھوکروں والے شریر تجسس کے ساتھ دونوں کزن ذرا فاصلے پر ٹہلنے لگے۔

ایک جانب فلی ڈھونڈی مچھلیاں پکڑنے کے بعد نوواردوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ باغ باغ لوٹا۔ "یار تم یقین کر سکتے ہو کہ اس ٹولی میں ایک ریڈ انڈین لاما بھی ہے!"

وکی پھولوں کی تصویریں کھینچ کر واپس آئے ــــــ بانکا مفتی پوش ان کی طرف بڑھا۔ "گڈ مورننگ جنٹلمین!" انارکلی جھیل والے بنارسی پارچہ فروش کی طرح اس نے بھی اپنا کارڈ پیش کیا۔

ابنِ بہار۔ پبلک ریلیشنز ایڈوائیزر بہار ایڈورٹائیزِنگ۔ فورٹ۔ بمبئی

وکی مسکرائے۔ "ماشاءاللہ!"

"السلام علیکم!" نوجوان نے باچھیں کِھلا کر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔
"سطح سمندر سے اتنی بلندی اور اتنے فاصلے پر ــــــ! والد صاحب بخیریت ہیں؟"

لڑکا چکرایا۔

"تیس برس کا وقفہ نہ گزرا ہوتا تو ہم سمجھتے بہار صاحب ہی طلوع ہو گئے۔ اب تو وہ ماشاءاللہ ایک میڈیا پرسنلٹی ہیں۔ ملاقات ایک بار ہی سرسری سی ہوئی تھی۔" بُوبی کی دعوت ولیمہ کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔

جوان بھی تاڑ گیا۔ "جی"۔ اسی روانی اور سلاست سے جواب دیا۔ "اس وقت وہ صنوبر کمپنی کے بدحال منیجر اور سَونگ رائیٹر تھے۔ اکثر اس یادگار جلسے کا ذکر کرتے ہیں۔"

وکی میاں اجنبی کے معترف ہوئے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی کایا پلٹ کے بعد پرانے واقف کاروں سے آنکھیں نہ چُراتے ہوں۔

نوکروں نے دسترخوان بچھایا۔ خواتین جو ادھر ادھر نکل گئی تھیں واپس بلائی گئیں۔ پنکی نے ابن بہار کا ان سے تعارف کرایا۔

وہ ایک لسّان آدمی تھا اور اپنے لیے نہایت مناسب پیشہ اس نے منتخب کیا تھا دوران طعام اس نے سلسلہ کلام جاری رکھا ــــــ تیغ زَرَ شِش پَر ــــــ چھوٹا سُرخاب ــــــ اس کا پَر ہمیں دیجیے گا ساتھ لے جائیں گے بلکہ ہم اسے اپنا لوگو اور سلوگن بنا لیں گے ہمیں اپنی خدمت کا موقع دیجیے۔ ہم آپ کی ٹوپی میں سُرخاب کا پَر لگا دیں گے ــــــ"

"راجہ صاحب۔ ایڈورٹائیزنگ کی دنیا ایک عجیب دنیا ہے۔ گزشتہ برس ہم ابا کے ساتھ ایک بڑے یوروپین شہر میں ایک انڈین ریسٹوراں کے اندر گئے۔ دروازے ہی پر رادھا کرشنا شو پاروتی گنیش جی۔

"مالک ایک این۔ آر۔ پی نوجوان نکلا۔ ہم نے تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ پبلک ریلیشنز!! کیونکہ اس شہر میں کفار ہند بکثرت آباد ہیں۔

"ہمیں محو حیرت پا کر والد نے کہا فرزندمن جاننا چاہیئے کہ نظریاتی کٹرپن ان ہی ارباب حکمت تک محدود ہے جو ہنوز وطن میں مقیم ہیں۔ باہر پیسہ کمانے اور گوروں سے مقابلے کے معاملے میں این۔ آر۔ پی۔ این۔ آر۔ آئی مفاد تقریباً یکساں ہیں۔ اِلّا کرکٹ میچ کے جب وہ ایک اژدہام کثیر میں تبدیل ہو کر ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں اور جنگل کی قبائلی نفسیات پر لوٹ جاتے ہیں۔"

"آپ کا اس فاؤنڈیشن سے بھی کچھ تعلق ہے؟" فلی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ محض غیر فلمی شو بزنس۔ کلاسیکل ڈانسرز وغیرہ۔ لیکن ابا نے فرمایا۔ بیٹا میں نے ساری عمر اردو کی روٹی کھائی ہے اردو والوں کے لیے بھی کچھ کرو۔ ہم فلم انڈسٹری سے وابستہ اردو والوں کو تو مزید شہرت کی حاجت ہے ہی نہیں۔ البتہ جو غیر فلمی رائیٹر پوئیٹ لوگ ہیں اگر وہ اپنی پبلسٹی کرواتے ہیں تو نہایت بھونڈے پن سے۔ مزید برآں ان کے پاس پیسہ بھی نہیں ہے اور اگر ہے بھی ــــــ ٹراوٹ؟

واہ ــــــ واہ ــــــ

"فرمایا تم ایک ذیلی صیغہ اپنے دفتر میں اردو اہل قلم کی خاطر قائم کرلو۔ واجبی معاوضے پر کیونکہ میں اردو کی روٹی ——

"چنانچہ والد محترم کو خوش کرنے کے لیے ہم نے ایک اردو کاپی رائٹر انگیج کیا جو ووِدھ بھارتی میں جِنگلز لکھتا تھا۔ پامال توصیفی الفاظ اور جملوں پر مشتمل مضامین کے بجائے اوریجنل قسم کے رائٹ اپ اس سے لکھواتے۔ نمونتاً ان کو چنیدہ اہل قلم کی خدمت میں ارسال کرنے کے ارادے سے ان کی فہرست بنائی۔ پھر دفتر میں محفوظ رکھنے اور بوقت ضرورت کام آنے کے لیے بسلسلہ وفیات ایک عبارت قلمبند کرنے کا خیال آیا۔ اسی اثنا میں ہمیں باہر جانا پڑا۔ ہم اس ہونہار نوجوان سے کہتے گئے کہ تمہاری ہدایت کی خاطر علیحدہ کاغذ پر ایک عبارت تحریر کیے جارہے ہیں تاکہ یاد رکھو کہ اس انداز میں ہرگز نہ لکھنا ——

"مرحوم اپنی ذات سے انجمن تھے۔ ان کی بے وقت رحلت سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر ہونا مشکل ہے بالخصوص آج جب کہ غریب اردو ایسے نازک حالات سے دوچار ہے۔ ضروری ہے کہ مرحوم کے تمام نثری / شعری / تنقیدی کارناموں کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے صحیح ادبی مقام کا تعین وغیرہ۔ وہ پرچہ ہم کاپی رائیٹر کی میز پر رکھ کر ایرپورٹ چلے گئے۔ دوسرے روز وہ بھی دفتر نہیں آیا۔ ایک گجراتی پٹے والے نے اٹھا کر وہ کاغذ آوٹ کی ٹرے میں ڈال دیا۔ مراٹھے ڈسپیچ کلرک نے اس کی زیروکس نقلیں بنا کر ان پتوں پر پوسٹ کردیں جن کی لسٹ اسے دیدی گئی تھی۔

"لہٰذا صیغۂ اردو شروع ہونے سے قبل ہی غتر بود ہوگیا۔ جواباً جو خطوط ہمیں موصول ہوئے ان میں ابا کے حوالے سے ہمیں پسرِ نوح لکھا گیا تھا!" ابن بہار نے سرد آہ کھینچی۔

سامعین ہنس پڑے۔

"ادھر کیسے آنکلے؟" بنکی نے سوال کیا۔

"والد صاحب اسکاٹلینڈ میں ہیں۔ وہاں انھیں ریڈ روز کیس کے فیصلے کی خبر ملی۔ ہمیں ٹرنک کال کیا کہ معلوم ہوا ہے ماسٹر جی بے یارو مددگار لکھنؤ میں پڑے ہیں۔ فوراً جاؤ اور رہائی ایراَن کو بمبئی واپس لے آؤ۔"

"ایسے باوفا دوست۔" وِکی میاں نے پھر داد دی۔

"ہم جھٹ پٹ ان کے پتے پر لکھنؤ پہونچے۔ معلوم ہوا وہ بہرائچ چلدیے۔"

"لیکن یہ وجے ماتا کا کیا سین ہے؟" بنکی نے دلچسپی سے پوچھا۔

"لکھنؤ میں ہم جس ہوٹل میں اترے یہ وہیں مقیم تھیں۔ خزانے کی تلاش میں ادھر آئی ہیں۔"

"آپ کا یہ بیان صراحت طلب ہے!"

"ان کی نارنجی پوشاک پیرس میں ڈیزائن کی جاتی ہے۔ ایک فرانسیسی مشاطّہ ان کے ذاتی اسٹاف پر ہے۔ تین معروف یوروپین موسیقاروں نے ان کے قصیدے کمپوز کیے ہیں —— روحانی۔

"قصہ مختصر یہ بہت اچھّی جارہی ہیں مگر کہنے لگیں جی کو چین نہیں۔ ہم نے کہا آپ دوسروں کو آتما کا سکھ بانٹتی ہیں اور خود بیکل؟ کہنے لگیں خزانہ نہیں ملا۔

"ہم سمجھے روحانی بات کر رہی ہیں۔ ہم نے کہا وہ بھی مل جائے گا۔ ابھی آپ کا سن ہی کیا ہے۔

"مرزا صاحب ہمارے جہاں گشت والد نے ایک بار تکیہ قرا دولت جان بابا، ایشیائے کوچک میں ایک شخص سے ملاقات کی جو ——"

"بہار صاحب —— وجے ماتا ——"

"جی۔ تو انھوں نے فرمایا کہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ باپ تحصیلدار تھے۔ سیدھے سادے سناتن دھرم آدمی۔ یہ اسکول میں پڑھتی تھیں۔ تبادلہ ان کے والد کا ایک نیم کوہستانی تحصیل کا ہوا —— جہاں ایک کھنڈر ایسی

کوٹھی عرصے سے خالی پڑی تھی ــــ اس پر انھوں نے قبضہ کر لیا کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔"

وِکی چونک اٹھے۔ "اس پہاڑی قصبے کا کیا نام تھا؟"

"حذف کر گئیں۔ اسرار پرست خاتون ہیں اور تانترک بدھسٹ اسرار اتھاہ۔ ــــ تو یہ کنبہ اس میں رہنے لگا۔ کوئی غیر معمولی بات وقوع پذیر نہ ہوئی ــــ از قسم بھوت پریت وغیرہ۔ البتہ چند مقامی باشندوں نے کہا اس کے احاطے میں پیڑ تلے بڑا زبردست خزانہ دفن ہے۔

"ترائی کے مسلمان عامل دفینوں کا پتہ نشان بتلانے کے ایکسپرٹ مانے جاتے ہیں انھوں نے کہا اس پیڑ پر ایک اوگھڑ رہتا ہے۔"

"اوگھڑ کیا ــــ؟" ڈِنکی نے پنکی سے سرگوشی کی۔

"ــــ اور دفینے کے مٹکے پر شیش ناگ۔"

فیروزہ نے پھریری سی لی۔

"والدین کے انتقال کے بعد انھوں نے ٹھان لی کہ وہ گنجینہ ڈھونڈ کر دم لیں گی۔ دِہی والی۔ لُونا وغیرہ قدیم جادوگرنیوں کے نام لیواؤں سے ملیں۔ شام جادو پہاڑ ضلع کامروپ آسام پہنچیں۔ پھر بنگال اور تبت کے جنتر منتر تنتر میں چلی گئیں لیکن کہتی ہیں کہ ہمیشہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔ چنانچہ یہ بھی این۔ آر۔ آئی بن گئیں۔

"کہنے لگیں۔ ہے وسنت پُتر ــــ ہم ایک ایسے جُگ میں جیوت ہیں جس میں ہر ناممکن چیز ممکن ہو گئی ہے۔ ایک عرب کھرب پتی اوم نمو شوایاہ کا جاپ کر رہا ہے۔ مادام جہان سادات برہما کماریوں کی مداح ہیں۔ اور تلک دھاری رُوسی ماسکو کی سڑکوں پر ہرے راما ہرے کرشنا الاپتے پھرتے ہیں۔ اب کیا ممکن نہیں ہے؟ خزانہ مل جائے تو میں ساری دنیا میں دیبی تارا کی پرستش عام کر دوں۔ میں نے کہا بفرض محال وہ دفینہ موجود ہے اور آپ کے ہاتھ لگ بھی گیا تو قانوناً بحق سرکار ضبط ہو گا۔

"انھوں نے میری بات غیر ضروری سمجھ کر سُنی ان سُنی کر دی کہ ان کے نزدیک ساری دنیا ہی غیر ضروری ہے۔ کہنے لگیں۔ کُمار بسنت ماسکو کیا چیز ہے؟ اب تلک البانیہ میں دھارمک پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ میں ترانہ پہونچ کر دکھا دوں گی۔

"یعنی پہلے خزانہ۔ پھر ترانہ۔

"ہم نے کہا۔ ماتا کی جے ہو۔ ہم بھی ایک گمشدہ گنج گرانمایہ کی کھوج میں نکلے ہیں۔ دو بوڑھے بے خانماں، خستہ جاں ستم زدہ میاں بیوی۔ ہم بہرائچ جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلی چلئے۔ پہلے آستانے پر حاضری دیجئے۔ بعد ازاں اوپر جنگلات میں جا کر ترائی کے مطلوبہ عامل کھوجیئے۔ چنانچہ ان کے چل بھون پر بہرائچ شریف پہونچے۔ میلہ چھان ڈالا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کروائے۔ پھر ایک نازنیں ہمشکل سری دیوی، الموسوم بہ لاڈو تیلن سے ملاقات ہوئی۔"

سامعین مبہوت رہے۔

"والد محترم اپنی جادو کی چھڑی گھما کر لاڈو تیلن کو لیلا تملگا ڈنکر بنا دیتے۔ کہ ایک وقت صنوبری ٹی وی اینڈ ویڈیو فلمز، فلوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے اب وہ تھک گئے ہیں اور فی الحال گلاسگو میں اپنے اردو جہانوں کے ہاں آرام کر رہے ہیں۔

"تھیٹر والی بولی کون جانے وہ کنبہ کس بس پر بیٹھا اور کدھر گیا۔ اس بھیڑ بھڑکے میں کون دیکھتا ہے اور کسے پرواہ۔" ابن بہار چُپ ہو گئے۔

لنچ کے بعد ہاتھ دھونے کی غرض سے ان سب نے دریا کا رُخ کیا۔ وہ بھی اچانک اداس ہو گئے تھے۔ اور کوئی کسی سے بات کرنے کو آمادہ نہ تھا۔

"کیسا سرد اور خوشگوار پانی!" ابن بہار نے ندی میں ہاتھ ڈبو کر کچھ دیر بعد اظہار خیال کیا۔

وِکی میاں نے تھوڑی سی مٹی اٹھائی۔ "ہاں۔ اس مقام کا آب و تراب

ہی مختلف ہے۔ اور دیکھو یہ شیشہ پانی ندی اتنی مصفا اور شفاف ہے کہ سوئی گرے تو نظر آجائے۔"

"وہ دونوں بھی اس ندی کی طرح تھے راجہ صاحب پاکیزہ اور شفاف۔ نجانے کیوں —— مگر ہمارا دل کہہ رہا ہے کہ اب وہ زندہ نہیں ——"

ندی کا مترنم پانی بہا کیا۔ پرندے فضا میں چکر کاٹ رہے تھے۔
تمہاری طرف للیرے ہیں چاندنی ؟ اور لال سرے ؟
تازہ ہوا میں جنگلی گلاب کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔
اور چاندنی بیگم —— وکی میاں نے ندی پر جھک کر آب رواں کو مخاطب کیا —— کیا وہ تمہاری اجاڑ کوٹھی تھی جو وجے ماتا کی ملکیت بنی ؟ اور وہ خالی دفینہ جو کسی کو آج تک نہ ملا ہے نہ ملے گا۔
کیا وہ تمہاری کوٹھی تھی —— ؟
زرد رنگ کی بڑی سی تتلی آکر ایک جھاڑ پر بیٹھ گئی۔ گویا جواباً کہتی ہو۔ اس علاقے میں سینکڑوں قصبے ہیں اور ان گنت پرانی کوٹھیاں۔ اپنے ذہن کو خواہ مخواہ کے غیر ضروری وسوسوں اور لاحاصل قیاس آرائیوں سے خالی کرو —— اگر وہ چاندنی کا مکان تھا بھی تو —— پھر —— ؟
انھوں نے گیلی ریت پر انگلی سے لکھا —— بندہ کمترین وقار حسین۔ جو ابھی زندوں میں سے ہوں، میں بھی ایک روز اس طرف آنکلا تھا۔
پھر انھوں نے چاروں طرف پھیلے سرسبز منظر پر نگاہ دوڑائی —— اور اونچی آواز میں پکارے۔ "یہ ایک جنگل کا صحیفہ ہے جو خط گلزار میں لکھا گیا۔"
کوئی ان کی بات نہ سمجھا۔

تیسرے روز ——

—— ان کی میزبان ایک بوڑھی سابق رانی صاحبہ سیاہ برقعہ اوڑھے خراماں خراماں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔ آم کے درختوں کے نیچے بیٹھے "براتی" ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ کچھ کنوئیں پر نہا رہے تھے۔ جامن کے سائے میں قوالی جاری تھی۔ وکی میاں کے لڑکے ٹوٹی، بنی اور جمی تصویریں کھینچتے کھینچتے اکتا گئے۔
بھیڑ میں سے نکلتے وکی میاں، ڈنکی اور پنکی آگے آگے جا رہے تھے۔
"ڈنکی بھی فوراً الگ سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ اونچے پورے کھائے پیے ——" پروین نے اپنی بیٹی سے کہا۔
"امی ——" فیروزہ نے خفت کے ساتھ آہستہ سے جواب دیا۔ "آپ یہ بات یہاں کئی بار دہرا چکی ہیں۔ کھائے پیے۔ کھائے پیے۔ بار بار اس طرح نہ کہیں۔ پنکی بھی فاقہ زدہ نہیں ہیں۔ اور ڈنکی قومی لباس میں مختلف نہ معلوم ہوں گے ؟"
"ذرا اس غول کو دیکھو۔ کالے کالے چھوٹے چھوٹے۔ ٹیڑھے ٹیڑھے ——"
"امی۔ پورب کے لوگ عام طور پر سانولے اور پستہ قد ہوتے ہیں۔ ایسے نہ کہیں۔ پلیز۔ آپ بنگالیوں کا بھی اسی طرح مذاق اڑاتی تھیں۔ کیا آپ ماسٹرریس ہیں ؟" وہ جھنجھلا کر آگے بڑھ گئی اور ایک چبوترے کے کنارے جا بیٹھی۔

بالکل خواہ مخواہ۔ یہ لوگ امی کا کیا بگاڑ رہے ہیں۔
وکی میاں نزدیک آئے۔ "تم یہاں بیٹھی ہو! ماسٹرریس میرے کان میں پڑا۔"
"اگر میں امی کو بتا دوں کہ وہ نسل پرست ہیں تو وہ ہرگز یقین نہ کریں۔"

وہ بھی کنارے پر بیٹھ گئے۔ چہرے سے پسینہ خشک کیا۔
"یہاں کیا ہے —— ماسٹر کاسٹ ؟" فیروزہ نے پوچھا۔
وہ مسکرائے۔ "تم بہت عاقل و دانا ہوتی جا رہی ہو!"

"پنکی تو مجھے ــــ نخبی سمجھتے ہیں۔"

ایک طرف برائین۔ ایک طرف پنکی۔ یہ بچّی بڑی الجھن میں پڑ گئی۔

مسز ڈھونڈی اٹیچی کیس سنبھالے ہڑبڑاتی ہوئی سامنے سے گزریں۔

"وہ دیکھو بانوئے عجم چلی جاتی ہیں۔ یونان تک کی ماسٹریس تھے۔ تفو بر تو ــــ"

"جی۔"

"اور بانکے میاں کے ماموں نے فردوسی کو کمیشن کیا تھا۔"

"جی۔"

"تمہیں ہماری آتو یاد ہیں؟ الانچی خانم۔ لودھیوں میں سے تھیں۔ اور ــــ وہ خانِ جہاں تھے۔"

چند "باراتی" گاتے بجاتے ادھر سے نکلے۔

"لیکن دیکھو ولی اللہ کسی ماسٹریس سے تعلق نہیں رکھتے۔"

"جی۔"

"ہم تھوڑی سی زندگی میں ایک دوسرے کو عاجز کر دیتے ہیں۔ بس چلتا ہے تو فنا کر ڈالتے ہیں۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ صدیاں گزر گئیں جنتا کو مسرت کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ کیونکہ جنتا کی زندگیوں میں خوشیاں بہت کم ہیں۔"

"امّی کہہ رہی تھیں یہ بانکے میاں کی زہرہ بی بی سے شادی بہت ہی بڑی بدعت ہے۔"

"بدعت! کتنی تو ان غریبوں نے اس میلے میں تجارت ہی کر لی ہوگی۔ یہ ایک زرعی میلہ ہے۔ جیٹھ میں فصل کٹ چکی ہے۔ کسان کے پاس خریداری کیلئے پیسہ ہوتا ہے۔"

"بڑے ماموں! یہ منّی منّی دوکانیں سجائے لوگ اتنے کیوٹ لگے۔"

ہندو دیہاتی پیٹ کے بل چلتے آ رہے تھے۔

نیزے اور جھنڈے اٹھائے عوام الناس ہر سمت سے چلے آ رہے تھے۔ ان کے پرچموں پر ہاتھی گھوڑے بنے تھے اور نیزوں پر چنوَر لہراتے تھے۔

بولو بالے بادشاہ کی مدد۔ وہ نعرہ زن تھے اور ناچتے اور ڈھولک بجاتے تھے۔

"یہ بہار تک کے گاؤوں سے پیدل آ رہے ہیں" رِکی نے کہا "یو پی کے بتیس[۳۲] اضلاع میں یہی میلے لگتے ہیں۔ غازی میاں کے مزار اور چلّے اتنی کثرت سے ہر جگہ کیسے؟"

ایک درویش نما کیریکٹر نمودار ہوئے۔ رنگ برنگی تسبیحیں۔ زلفیں۔ داڑھی۔ وہ بھی فیروزہ کو ایک اور عجوبہ معلوم ہوئے کیونکہ وہ صفیہ سے اوکسفورڈ کے لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے قریب پہونچے تھے۔

"بات دراصل یوں تھی ــــ" انھوں نے تمبا کو پھانکا۔ "بھائی صاحب۔ کہ بدعت مٹانے کے لیے اورنگ زیب نے بھیجی فوج۔ اس نے کیا محاصرہ۔ عوام اس فصیل کے باہر پڑی اینٹیں اٹھا کر واپس گئے اور جگہ جگہ چلّے بنا کر یہی میلے وہاں لگا لیے۔ سکندر لودھی نے بھی یہ میلے بند کروانے کی کوشش کی تھی۔"

"اتنی شدید عقیدت؟ اور زیادہ تر ہندو۔ غازی میاں تو ہولی وار ــــ"

"بی بی یہ معاملات آپ کے لیے قابلِ فہم نہیں ــــ" وہ مسکرائے۔

"یہ اچھی مصیبت ہے کسی سوال کا معقول جواب دینے کے بجائے آپ لوگ یہ خواہ مخواہ اسراریت بیچ میں کیوں لے آتے ہیں؟" فیروزہ نے تندی سے کہا۔ رِکی نے ابرو کے اشارے سے منع کیا۔

"بات یوں تھی ــــ" وہ "بزرگ" اطمینان سے بولے "نوجوان سیّد کی کرامات سے فیضیاب اور مقامی حاکموں سے نالاں ــــ غالباً مقامی باشندے جھنڈے اور ہتھیار لے کر کمک کے لیے پہونچے مگر دیر سے۔ گنجِ شہیداں پر جھنڈے رکھ کر واپس گئے۔ تب سے یہ پرچم اور نیزے ــــ علاوہ ازیں ــــ سرکار"

علوی سید تھے۔ محمد بن حنفیہ کی نسل سے۔ رزمیہ روایت سے ان کا رشتہ مضبوط تھا۔"

"رایٹ ـــــ آئی انڈراسٹینڈ سر۔ ظلم کے خلاف لڑتا مقدس سورما سینٹ جارج دی ڈریگن کلر۔ انگلستان کا قومی سمبل مگر یہ کہ ـــــ معلوم ہوا مارگریٹ تھیچر پھول تماشے لیے چلی جارہی ہیں ـــــ!"

"تمہارے سارے رویے یوروسنٹرک ہوچکے ہیں۔" رِوکی بہت محظوظ ہوئے۔

"آئیے ادھر املی کی ٹھنڈی چھاؤں میں چل کر بیٹھیں۔" نوواردان تینوں کو ایک طرف لے گئے۔

"ان کے ساتھ حجت مت کرنا۔" وکی نے آہستہ سے کہا ـــــ

"یہ بڑھے جِن ہیں۔"

انھوں نے سُن لیا۔ چبوترے پر اکڑوں بیٹھے۔ مُٹھی بنا کر سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے فرمایا ـــــ "بچے ہیں۔ کرنے دیجئے بحث ـــ جی تو دیکھیے وہ سنگی حلقہ جو رکھا ہے وہ سرکارؐ کے حلقہ بگوش مکنا دیو کے کان کا سنگی بالا۔"

فیروزہ بھونچکی رہ گئی ـــــ "آپ ـــــ آپ سنجیدہ نہیں ہیں!"

انھوں نے چھوکری کو نظرانداز کیا اور ماموں سے مخاطب رہے ـــــ

"اور بھائی صاحب قبلہ غلامی کی بات تو یوں ہے کہ ایک بار ہم انگلینڈ سے لوٹتے ہوئے یوگوسلاویہ وغیرہ کا چکر لگاتے تو پہنچ جا پہونچے۔ بالکل بطور ٹورسٹ اس وقت۔ دو انگلش کلاس فیلو ہمراہ تھے۔ وہاں ہمیں ایک باقی ماندہ بوڑھا درویش ملا۔ اس نے ہمیں اس پتھر کے متعلق جوان کی رسوم میں کام آتا تھا ایک دلدوز دعا سنائی۔ اس پتھر کو اپنے کان میں لٹکاتے رہو اور علیؑ کے سائیں قنبر کے سائیں بنو۔"

"سبحان اللہ ـــــ" وِکی میاں کو وجد سا آیا۔

فیروزہ نے گھبرا کر صفیہ کو دیکھا۔ وہ بے تعلق بیٹھی رہیں۔

"مزید سماعت فرمائیے ـــــ"

"ارشاد۔"

"میں تیرے گھوڑے کے ہمراہ رہنے سے قنبر بن گیا ہوں۔ ـــــ"

"واہ!"

علیؑ امام منست و منم ـــــ؟"

"غلام علیؑ ـــــ" وِکی میاں نے جواب دیا۔

ایک طرف کو دوڑ گئے۔ پھر واپس آئے۔

"کڑکا سناتا ہوں جو التمش کے زمانے سے پڑھا جا رہا ہے۔ رجز ـــــ"

التمش ـــــ فیروز شاہ ـــــ شجاع الدولہ ـــــ وہ سب ان لوگوں کے بالکل نزدیک موجود ہیں۔ فیروزہ کا اچنبا سا ڈر اور استعجاب بڑھتا گیا۔ دایاں ہاتھ بلند کر کے کڑکے ـــــ "کھڑگ سرگ ہے نرنکار ـــــ انت شاہِ مرداںؑ کے بس۔" سُنیے گا بھائی صاحب ایک اور قدیم نوحہ جو اب تک پڑھا جاتا ہے۔"

"ارشاد ـــــ ارشاد ـــــ"

"ـــــ جب جوجھن کو گیو قاسمؑ دَل مار کے سگر وبھگا تے دیو
پگ پا پچھے دھرونا جراہٹ کے
تلوارن سے تن چُور کھیو اور باگ کے بیچ گرے کٹ کے
گورے مکھ پہ لہراوت ہیں سب لوگ کہیں سہرا لٹکے!

جیوں ساون میں جھڑ لاگے ـــ تیرن کی بوچھار
بُجھا بلی چھن چھن گریں' مہابلی کے پار۔"

ـــ چکر سا کاٹ کر وہ پھر ایک طرف کو چل دیئے۔

"ماموں جان۔ یہاں ہر جگہ بڑی ہی عجیب باتیں ہو رہی ہیں۔"

"عجیب؟ قطعی نہیں۔ رانا صاحب سنہ باون سے قبل ایک بڑے راجہ تھے۔ اوکسفرڈ کے تعلیم یافتہ۔ اب اخوان طریقت میں شامل سے ہو گئے ہیں۔"

"کیا ان کے پاس فاضل وقت بہت ہے؟"

"ہاں۔ میری طرح۔"

بھانجی نادم ہوئی۔

رفاعی سلسلے کے غوغائی فقیروں کا ایک گروہ صحن میں سے نکل گیا۔ یہ لوگ بدایوں، حسین ٹیکری (مدھیہ پردیش) اور دیوریا (مہاراشٹر) کے رفاعی تکیوں سے آئے تھے اور "مولا علیؑ" کے نعرے لگا رہے تھے۔

رانا صاحب دوبارہ نمودار ہوئے۔

"یہ رفاعی درویش ٹرکی اور توران میں مفقود ہو چکے۔ یہاں موجود!"

"کیونکہ وہاں انقلاب کب کا آچکا اور یہاں نہ آیا نہ آنے کی امید ہے۔" فیروزہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"یہ لوگ اولیا کی خفیہ پولیس ہیں۔" رانا صاحب نے جواب دیا ـــ "صاحب مزار صابر ہوتے ہیں مگر گستاخ بے ادب لوگوں کو یہ قلندر پھنٹی دے دیتے ہیں۔"

فیروزہ نے اپنے ماموں سے التجا کی ـــ

"اب چلیں ـــ؟" وہ بہت برافروختہ معلوم ہو رہی تھی۔

دراصل اس بچی کو بیوقوف پردین کی "نسل پرستی" نے بیحد مضطرب کر دیا ہے۔ غالباً یکبارگی اس کو یہ احساس ہوا ہے کہ نسل پرستی کے مختلف رنگ ہیں

اگر اس کی مُورلینڈ اولاد نے اپنے ایشیائی ورثے کو حقیر جانا اور یہ روایات بھی تو اس کے ورثے میں شامل ہیں۔

پچھم ـــ جیٹھ کے میلے سے کتنے نوری سال کی دُوری پر واقع ہے؟ ایک ایک ستارے کی روشنی لاکھوں نوری برسوں میں زمین تک پہنچتی ہے گزشتہ ادوار کی روشنی اور تاریکیاں دونوں یہاں ایک ساتھ پہنچ رہی ہیں۔ رانا صاحب دفعتاً باقاعدہ گانے لگے ـــ نیر پیوَن ہیت گئے سِندھوُ کے کنارے۔ سندھُو بیچ بستِ گراہ۔ چرن دھر پچھارے۔ ہے گووند راکھوشرن۔

"تُکا رام ـــ؟" وِکی نے دریافت کیا۔

"سنت رائے داس۔ راکھو شرن اب تو جیون ہارے۔ سولہویں صدی۔ پانڈیچری میں فقیر نے ڈی۔ کے۔ رائے سے خود سُنا۔"

"آہ ـــ گریٹ سِنگر مِتک ـــ دلیپ کمار رائے۔" وِکی نے کہا۔

"سولہویں صدی میں آپ ـــ؟" فیروزہ نے دہرایا۔ سب ممکن ہے۔ ـــ یہ دیوانے لگ ہیں۔ اکتا کر جمائی لی۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں۔

"لوگ تو پانی پینے گئے۔ مگر مچھ انہی کو کھا گئے۔ افسوس۔" وکی میاں کی آواز بلند ہوئی۔

پانی پینے گئے تھے۔ کہاں ـــ؟ گرمیوں کی بھری دوپہر تھکان نیند کا جھونکا۔ دُور پپیہے نے دہرایا ـــ کہاں ـــ کہاں ـــ ٹیٹری چلائی: العطش۔ فیروزہ نے آنکھیں ملیں۔

"آپ مراٹھی سے انداز میں گاتے ہیں۔" وکی نے اظہار خیال کیا۔

"فقیر پرنسپل رتن جھنکر کا شاگرد تھا۔"

"پانی پینے گئے تھے۔ زندگی کے دریا میں قدم رکھا اور مگر مچھ نے پچھاڑا۔" وکی میاں نے جواب دیا۔

نرالا ڈائیلاگ ہے۔ فیروزہ نے آنکھیں پھاڑ کر غنودگی بھگانے کی کوشش

کی کراچی اور لندن میں یقین نہ آئیگا کہ محض چند روز قبل میں ایک ایسی اِن کرڈیبل جگہ پر موجود تھی۔

اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ایک بیل اٹھایا۔

"ارے چھوٹی خالہ —— دیکھیے بالکل کرکٹ کی گیند کے برابر پھل۔"

"بابے بادشاہ مدد ——" ایک پہاڑی مینا چلائی۔ اس کا مسکین سا مالک پنجرا چبوترے پر رکھ کر وضو کے نلکوں کی طرف چلا گیا۔

رِنکی اور ڈِنکی آن کر ایک نیچی دیوار پر بیٹھ گئے۔

"اور تم دونوں لوفر کہاں غائب تھے؟" وکی نے شفقت سے پوچھا۔

"نواب مظفر جنگ پر کال کرنے گئے تھے۔"

"——؟"

"وہاں اس انتظام میں لگ گئے کہ نواب صاحب اور سرایلائی جاہ اِمپی کے ذریعے مسٹر ظفرالاسلام ڈنمارک سٹک لیں۔"

"——؟؟"

"ہم لوگ پروفیسر عبدالکریم کے ہاں بیٹھے تھے۔" ڈِنکی نے رِنکی کی بات کی گویا مزید تشریح کی۔

"——؟؟؟"

"پروفیسر عبدالکریم بازی گر۔ ورلڈ فیمس میجی شین آف کا مروپ۔ گولڈ میڈلسٹ۔" رِنکی نے تعارف مکمل کیا۔

"موصوف کے ڈیرے پر ایک بنگلہ دیشی ملے۔ لنگیاں اور رومال بیچ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر فوراً بیگ سے چند تصاویر نکالیں۔ مرشد آباد اور کمپنی اسکول۔ ایک تصویر بہت ہی نادر تھی۔ نواب مظفر جنگ مع سرایلائی جاہ اِمپی کی مہر۔

—— کہنے لگے مع اہل و عیال یورپ کا قصد رکھتے ہیں۔ دو بھائی اوسلو پہنچ چکے ہیں۔ پہلے برطانیہ گئے۔ بطور گھس پیٹھیے۔ وہاں سے چند پاکستانی گھس بیٹھیوں کے ساتھ گویا ایک وائکنگ ناؤ پر سوار ہو کر ناروے کے ساحل پر جا اُترے۔"

"واہ - میں کل کے خواب کی تعبیر کس سے پوچھوں گا
کہ میں نے نوحؑ کی کشتی پہ خود کو دیکھا ہے!؟"

"اب مسٹر ظفرالاسلام اسی تاک میں ہیں۔ روپے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ پانچ ہزار کی کسر ہے۔ ڈنمارک ورنہ سویڈن۔ وہ ہومنسٹ گورنمنٹ ہے۔"

"تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ہم نے پوچھا کیا آپ بھی وہاں سیاسی پناہ لیں گے؟ کہنے لگے ایسا تو کوئی پروبلم نہیں۔ یوں تو ہر بنگالی پیدائشی ریوولیوشنزی ہے۔"

"ہمیں محمد رضا خان مظفر جنگ نائب ناظم بنگال بہار اڑیسہ کی تصویر نے بہت مسحور کیا۔ سفید سنسان مہتابی پر سفید بارہ دری کے سامنے بیٹھے پیچوان نوش کر رہے ہیں بالکل اکیلے —— پلاسی کے بعد تاریخ کی پہنائیوں میں یکا و تنہا ——

"اندھیری رات۔ خاموش چبوترہ۔ بنگال اس عمیق تاریکی میں ڈوب گیا۔ اور وہ خود اب ایک آوارہ وطن بنگلہ دیشی کے خریطے میں پڑے ہوتے ہیں ایسے خریداروں کے منتظر جو جانتے ہی نہیں کہ وہ کون تھے۔ ابنِ بہار بالا بالا ہی واپس گئے ورنہ وہ بمبئی میں یہ ساری تصویریں بکوا دیتے۔ ہم نے ظفرُل بھائی سے کہا ہے رات کو رانی صاحب کے ہاں آجائیں۔ بڑے ماموں پلیز ایک دو ضرور خرید لیجیے گا۔ وہ بیحد حاجتمند معلوم ہوتے ہیں۔"

"عشق غم نوخرید —— اب ہمیں اور دُکھی نہ کرو۔ ضرور لے لیں گے۔ تم دونوں ہمپٹی ڈمپٹی کی طرح دیوار پر کیوں چڑھے بیٹھے ہو۔ ادھر آجاؤ چھاؤں میں۔"

رانا صاحب واپس آگئے۔

"یہ ہمیں بالے میاں کے متعلق بتلا رہے تھے۔ اتر گئے گڑھ بھرا پنج!"

"بڑے ماموں۔ وکٹورین انگریزوں نے تو غازی میاں کے معرکے ہی کو نیم اسطوری بتلایا ہے۔"

رانا صاحب پھر قلندرانہ شان سے اکڑوں بیٹھے۔ سگریٹ مٹھی میں اٹکایا۔ تبسّم کیا۔ اور بولے "اب میں آپ نوجوانوں کی خاطر جو پورب اور پچھم کے درمیان معلق ہیں — آپ ہی کی جدید اصطلاحات میں بیان کروں یہ سب کیا ہے؟" ایک گہرا کش لگایا۔ "یہ ایک عظیم الشان ڈرامہ ہے۔ سمبلسٹ پلے۔ لوک گیتوں میں سرکارؒ کی پیدائش پر ان کی والدہ برہمنوں سے جنم پتری بنواتی ہیں۔ غزنوی ماں اور پنڈت کی پوتھی —؟ تو بھئی اسپین کا وہ کرسچین سُورما جو مسلمانوں سے لڑا وہ عیسائیوں ہی میں ایل سِڈ کیوں کہلایا؟ السید؟

"عقیدتمند کمک لے کر تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ مسلمان ولی تھے ورنہ ناٹک بن جاتے۔ ان کی فوق الحیوان گھوڑی کے سوانگ بھرے گئے۔ بیاہ ہر سال ملتوی کیونکہ پچکا لگ جاتا ہے — ہم کتنا کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے — کیونکہ حالات موافق نہیں۔ ہم اپنے پلان مستقبل پر چھوڑتے جاتے ہیں، جو کبھی نہیں آتا۔ یہ ایک رمزیہ تمثیل ہے جو ہمارے عوام نے آٹھ نو سو سال قبل تخلیق کی۔" ایک اور کش۔

"بالے میاں ایک کلچر ہیرو ہیں"۔ انھوں نے فیروزہ کو مخاطب کیا۔ "ایک زرعی تمدّن کے سینٹ بسنت کے میلے میں آم کے بور اور گیہوں کی بالیاں یہاں چڑھائی جاتی ہیں کسان اپنی سالانہ آمدنی کا ایک حصہ گولک میں ڈال جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اورنگ زیب ایک موڈرن ذہن کے آدمی تھے۔ انیسٹ مسٹری —"

"اب بی بی تم برائین کو اطلاع دو کہ تم نے ایک نارتھ انڈین میلے میں ایک

کلچر ہیرو ڈسکور کیا"۔ پنکی نے دھیمی آواز میں فیروزہ سے کہا۔ اس نے جھنجھلا کر کرکٹ کی گیند کے برابر بیل دور پھینک دیا۔

"بالے — بالے —" مینا چلائی۔ "بادشاہ — بادشاہ —"

رانا صاحب نے گویا اس کی ترجمانی کی۔ "یہ تم کو بتلانا چاہتی ہے کہ محمد بن تغلق مع ابن بطوطہ شاید اسی جگہ آن کر بیٹھے تھے —! اس وقت مزار تک پہونچنے کا دروازہ اتنا چھوٹا تھا اور اژدہام اتنا کثیر کہ بادشاہ اور سیّاح دونوں اندر ہی نہ جا سکے۔"

"مدد — مدد —" مینا نے نعرہ پورا کیا۔ رانا ترجمانی میں لگے رہے۔ "محمد بن تغلق درگاہ کے لیے زبردست گرانٹ دے گئے۔ اتنی بڑی کہ اس کی بدولت کئی تعلقے وجود میں آ گئے۔"

"مدد معاش کی جاگیریں —" پنکی نے پوچھا۔ "ارے کیا پتہ ہمارے بدحال پرکھے جنھوں نے تین کٹوری ستّو ایک بزرگ کو پلایا تھا ان کا تعلق بھی کسی آستانے سے رہا ہو —"

"طلسماتی زمانے —" فیروزہ نے کہا۔

"ہاں طلسماتی۔ رات کو سوتے للّو پنجو صبح اُٹھے — منسٹر۔ سات پشت کے لیے اطمینان" پنکی نے جواب دیا۔

مسز ڈھونڈی، زرینہ، فلی اور مہناز املی کے قریب آئیں۔ ظہورن بوا نے سر پہ ڈلیا اٹھا رکھی تھی۔

"غریبی ہٹاؤ" مینا پھر چیخی۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ مسکین آدمی نماز پڑھ کر لوٹا۔ پنجرا اٹھا کر گروہ امراء کو معذرت طلب نظروں سے دیکھا۔

"یہ اسے کس نے سکھلایا؟" پنکی نے مسکرا کر دریافت کیا۔

"سرکار ہمار الڑکا یوتھ کانگریس میں شامل ہوگیا ہے۔" وہ سلام کر کے بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

ظہورن بُوا نے ٹوکری بصد تکریم چبوترے پر رکھی۔ فیروزہ سے کہا: "عزیبی ہٹاؤ! ارے خدائی کارخانے میں کوئی دخل دے سکتا ہے؟ ہمارے تین عزیز دار مزے سے سعودی چلے گئے۔ ہمارے بیٹے نے کھیتی باڑی، پتوہ کے گہنے گروی رکھ کر ایجنٹ کی پوری رقم بھری۔ وہ لے کر چمپت۔" آواز بھرّا گئی۔ دوپٹے میں آنسو جذب کیے۔ بیمنٹ کے گرم فرش پر بیٹھ گئیں۔ "ہمارے مقدر میں غریبی ہی لکھی ہے۔"

"ہاں بوا؟"

"حضورؐ نے ایک بار دعا فرمائی کہ اللہ پاک ہمری امت میں کوئی مفلس نہ رہے۔ دعا قبول ہوگئی۔ پھر پیٹا زوروں کا مینہہ برسا۔ چھتیں پرنالے ٹپکنے لاگے۔ مزدور غائب۔ مرمت کون کرے؟ سب تو پیسے والے ہوگئے تھے تو لوگ حضورؐ کے پاس گئے دعا فرمائیں کہ کچھ لوگ پھر سے غریب ہوجائیں۔ انھوں نے پھر دعا فرمائی۔"

وِکی نے بھنّا کر پوچھا: "یہ تم سے کس نے کہا؟"

'سرکار مولوی صاحب نے بارہ وفات کے وعظ میں بتلایا تھا۔"

"کہاں میں وہ مولوی صاحب۔ ہمارے سامنے لے کر آؤ۔" وہ گرجے۔

گھبرا گئیں: "جمور گاؤں میں رہت ہیں۔"

"وِکی ــــ وِکی ــــ پلیز۔ غصہ نہ کرو ــــ" مانک بائی ملائمت سے بولیں۔

"یہ دیکھو ہم کمہار کی دوکان سے کتنی فنٹاسٹک چیزیں لائے ہیں۔" تین چھوٹے بنڈل ڈلیا سے نکال کر گلابی کاغذ اتارے۔

"یہ دیکھو ہولی کعبہ ــــ!"

"آہا ــــ مٹی کا حرم اور بنا دو ــــ؟!"

"یہ ہولی پروفٹ کی ٹومب۔"

"اور یہ بہشت کی حور۔ بالکل اس دنیا سے باہر۔"

یعنی آؤٹ آف دِس ورلڈ۔ مٹی کا سر نکال کر چبوترے پر رکھا۔

ایک حسینہ کا چہرہ۔ ناک میں بلاق۔ ماتھے پر سنہرا چھپکا۔ سر پر شاہانِ اودھ کا ایرانی وضع کا تاج۔ آنکھوں میں تحیّر۔

گھوڑی جیسے نوکیلے کانوں میں بُندے۔

"ڈلڈل براق ــــ!" مانک بائی نے اطلاع دی "محرم آنے والے ہیں۔ کمہاروں نے ابھی سے تیار کر لیے۔ شاہی کے زمانے سے ایک ہی سانچہ ــــ"

"ایک بڑا سا ہال تھا۔ باہر شدید ہریالی۔ تیز بارش۔ تاشے بجاتے گاؤں کے جولاہے اپنے تعزیے لے کر پھاٹک پر آئے۔ انھوں نے پنّیوں سے سجا کاغذی گھوڑا اندر بھیجا ــــ اس کی گردن پر یہی شبیہ لگی ہوئی تھی ــــ بالکل یہی تو تھی۔"

کسی نامعلوم کیمیا کے زیرِ اثر صفیہ اپنے خول سے باہر آگئی تھیں۔ وِکی نے ان کی حوصلہ افزائی کی: "ہاں ہمیں بھی خوب یاد ہے۔ وہ بڑی پھوپھی کا گھر تھا جہاں ہم لوگ گئے ہوئے تھے۔"

"ہم سب اس وقت ــــ بہت ینگ تھے نا؟"

"ہاں ــــ ہاں ــــ اب بھی لپٹا حریبا تو نہیں ہوگئے ہیں ــــ صفیہ۔ سنو ــــ تمہیں ان نوجوانوں سے خائف ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے یہ لوگ بھی اپنی جگہ حق بجانب ہیں۔"

"ہاں بھیتا ــــ؟ یہی تو شبیہ تھی ــــ اور ہم چلاّئے تھے مرزیح بشکل پری! ابتاشن بُوا نے کہا تھا نہیں ای دُلدُل بُراق آہیں۔ جنت کی حور رہیں۔ ہزاروں برس روتی رہیں کہ رسول پاکؐ کو معراج شریف پر ہم ہی لے جیتا ــــ اللہ پاک نے ان کی التجا منظور فرمائی ــــ"

"ہاں ـــــ اور بارش ہو رہی تھی اور چاروں طرف جنگل اور بھیگی پروائی اندر آ رہی تھی اور براق کا عکس چمکیلے سبز فرش پر جیسے جنگل اندر آ گیا ہو اور جنت ـ"

"ہاں بھیا؟" صفیہ نے چھوٹے بچوں کی طرح پوچھا۔ ان کو اپنے حافظے پر خود اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ بڑے بھائی سے تصدیق چاہتی تھیں جو یقیناً ادراک کی ایک جہت اوروں سے زیادہ رکھتے تھے۔

"ہاں ہاں صفیہ" انھوں نے نرمی سے کہا۔ "بارش تھمی اور دلدوز جو گیا میں دہے گاتے وہ سب پھاٹک سے نکل گئے ـــــ

بیرن بھری ناؤ پڑی بیچ سمندر دھار
کھیون ہارو چل بسے اب پار کرو کرتار ـــــ"

"بیرن بھری ناؤ پڑی ـــــ" صفیہ نے دہرایا۔ چپ ہو گئیں۔ پھر کہا "نہیں۔ یہ نہیں ـــــ ایک اور تھا ـــــ" سر جھکا کر پیشانی پر انگلی پھیری۔

"بارہ برس کے بیٹے ڈلروا تانے چدریا رے ہائے
بن میں سوئی رہے ہائے رے ہائے
ہائے ہائے سوار ڈولدل گھڑوارے ہائے ـــــ"

جس طرح ایک نیولا درخت کی کھوہ میں سے جھانک کر سر فوراً اندر کر لیتا ہے صفیہ سلطان دفعتاً اپنے بل میں واپس چلی گئیں۔

سیرہ لارنس میں کنٹر بری ٹیلز پر پیپر لکھا تھا۔ کیا وہ لوگ ان کیریکٹرز سے مشابہ ہیں ـــــ؟ کچھ کچھ ـــــ؟ انکل وکی اور رانا صاحب ـــــ نائیٹ۔ فرینکلن اور جیوفری چاسر؟

پنکی ـــــ اسکوائر؟ بڑی خالہ ـــــ میڈیم اینگلنٹائین؟ مسز ڈھونڈی ـــــ وائف آف باتھ؟ چھوٹی خالہ ـــــ" دوسری نن"
ـــــ نہیں ـــــ غلط موازنہ ہے۔ اور ان میں سے بیشتر افراد تو زائرین بھی نہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے عقیدے کھو چکے۔

وہ لوگ چل پڑے۔ فیروزہ کو پکارا۔

اندر پہنچ کر مانک بائی اور فلی چادر چڑھانے کے انتظام میں منہمک ہوئے۔

"یہ گیارہویں محرم کو باون ڈنڈوں کے تعزیے کی زیارت کے لیے خیرآباد بھی تو جاتی ہیں۔ ایک بار ہمیں ساتھ لے گئی تھیں۔" پنکی نے ہنس کر فیروزہ کو بتلایا۔ "کہنے لگیں دیکھو تعزیہ خود بخود رقص کرنے لگتا ہے سینکڑوں آدمی اسے اٹھائے ہوتے تھے۔ اچانک وہ تیز تیز چکر کاٹنے لگے ـــــ ہمیں تو وہ انگلش کاؤنٹی کرکٹ کا ایسا میدان معلوم ہوا سرسبز اور خوش فضا۔ اور ہزارہا خوش پوش عوام کا جم غفیر ـــــ اور باون ڈنڈے کا تعزیہ رقصاں۔"

بڑی خالہ زرینہ گفتگو میں شامل ہوئیں۔ "پہلے زمینداروں میں تعزیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ سب سے اونچا تعزیہ جلوس میں سب سے آگے۔ پیسہ اب قصائیوں جولاہوں کے پاس آ گیا ہے اونچے سے اونچے تعزیے کا کمپی ٹیشن ایک دوسرے سے وہ کر رہے ہیں۔"

قصائی۔ جولاہے۔ لیجئے ایک اور نسل پرست میدان میں اتریں۔ فیروزہ چڑ کر ایک طرف کو ٹل گئی۔ فلی سر پر رومال باندھتے ہوئے کہہ رہے تھے: "ممی پورا

ایجنڈا لے کر اجمیر شریف بھی جاتی ہیں۔ مہناز کے لیے اچھا پارسی ڈگرا۔ کانپور الہ آباد کا۔ بمبئی کا نہیں چلے گا۔ ہمارے لیے اچھی پارسی ڈگری، بمبئی کی چلے گی بگر یزدی ایرانی نہیں۔"

"وہ دیکھیے بھیا — مزار شریف کے پاس — چندن کا بروا —"
"ہاں ظہورن بوا —" پنکی چند منٹ تک سوچ میں ڈوبے رہے
"بڑے ماموں۔ ابھی ہمیں ایک برین ویو آئی —"
"کہو —"
"میسوری صندل — لوٹی میاں کو اس میں لگا دیں۔"
"اچھا خیال ہے۔ تم نے ماشاء اللہ واقعی ایک کاروباری کا دماغ پایا ہے!"
رانا صاحب بھی مسکرائے۔
پنکی نے ان سے کہا۔ "رانا صاحب کالج میں انڈین ہسٹری ہمارا مضمون تھا۔ اسے پڑھ پڑھ کر دکھی ہوا کیے۔ اسی مضمون کے ذریعے فن تعمیر تک پہونچے اور آر کی ٹیکٹ بن گئے — کیا کریں۔ یار فلی۔"
"یس بوس!
"صندل کا پیڑ دیکھا؟"
ایک منٹ تک اس نے بھی سوچا پھر بشاش ہوا۔ "جولی گڈ!
"اگر ایک کرناٹکی پارٹنر مل جائے۔"
"نارتھ انڈین بھی چلے گا یار۔"
"اور لوٹی میاں منیجر — اب فرق یہ ہے رانا صاحب کہ مٹھی میں لے کر سگریٹ آپ ٹھیک سے نہیں پی سکتے۔ آپ کا یہ چوا حقیقتوں سے ————
فرار معلوم ہوتا ہے — معاف فرمائیے گا۔"
رانا صاحب نے پنکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "بھائی صاحب آپ کا بھانجا ماشاء اللہ بہت ذہین ہے!"

تبرکات کے محافظ خانے میں وکی میاں قرآن مجید کے قدیم نسخے دیکھنے میں محو ہو گئے۔ "حضرت سالار کی صدری اور جامہ قرآن۔" ایک متولی نے بتلایا " اور یہ فرغل فیروز شاہ تغلق نے بنوایا تھا کہ جامہ قرآن بوسیدہ ہو جائے تو اسے ری پلیس کر دیں۔ فرغل گل گیا جامہ قرآن ویسا ہے۔"

"آج کل کیوں نہیں ہوتے معجزے؟" فیروزہ مصر رہیں۔
"بڑے ماموں سے پوچھو۔" ڈنکی نے کہا۔
وہ آگے جا چکے تھے۔
ڈھال تلواروں توڑے دار بندوقوں سے آراستہ اسلحہ خانے کے پھاٹک پر درگاہ کے مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔

"یار پنکی۔ راولپنڈی میں بری امام کے روضے پر ہم نے ایک دفعہ بے حد عجیب و غریب سرخ پوشاک پہنے دو نوجوان ملنگ دیکھے۔ ناک میں سونے کے بلاق۔ ہاتھ میں ستار۔ ہری آنکھیں اور پرسکون چہرے۔ اور بالکل خاموش پہاڑ کی طرف سے آئے۔ اور چند منٹ بعد چپ چاپ ایک طرف کو چلے گئے۔ وہ دونوں اگر یہاں چلے آئیں تو اس میلے کے مناظر ان کو بالکل حیران نہیں کریں گے جس طرح ہم اور تم حیران ہیں۔ لیکن اپنے تجربے سے باہر کی چیزوں پر متعجب ہونا قدرتی بات نہیں؟ ——
تم چاہتے ہو کہ ایک آدمی سارے عالم کے رویوں کے متعلق یکساں طور پر —— پرسکون رہے۔"
"وکی ماموں تو ہیں کچھ کچھ — پرسکون — وہ سرخ پوشاک پہن کر ہاتھ میں ستار بھی لے سکتے ہیں۔"

باہر آتے ہوئے پروین سلطانہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"سُن رکھا تھا بھارتی درگاہوں پر دولتمند پاکستانی سمجھ کر فقیر گھیر لیتے ہیں۔ آج دیکھ بھی لیا۔ سارے منگتے میرے اور ڈِنکی کے پیچھے ہی پڑے رہے۔"

"خالہ آپ کے ہاں بھی تو درگاہوں پر بھکاری ہوتے ہیں ــــ" شہلا نے دبی زبان سے پوائنٹ آوٹ کیا۔

"اتنے نہیں۔" خالہ نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ۔ تم لوگوں نے بھکاریوں کا موازنہ بھی شروع کر دیا!" وِکی نے حیرت سے کہا۔

"کیا کریں بڑے ماموں ــــ" فیروزہ نے ہونٹ بچکائے۔ "چالیس برس سے تعلقات بھی تو ازحد یعنی کہ کشیدہ ہیں۔ اس وجہ سے دونوں طرف کے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق بھی ذرا ــــ ضرورت سے زیادہ حسّاس ہو گئے ہیں۔"

"محض کشیدہ؟ ارے چالیس برس سے ایک دوسرے کی جان کو آئے ہوئے ہیں۔ محض حسّاس ــــ؟ قطعی ابنارمل ــــ

"آزادی کے چند سال بعد مجاز نے کہا تھا ؎

اُدھر مشکوک ہے میری صداقت
اِدھر بھی بدگمانی کم نہیں ہے!

رانا صاحب نے قصّہ کوتاہ کرنے کے لئے مقطع پڑھا ؎

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے!"

وکی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

"چلو بچّے پھر ہم اس جہت کی سمت نکل چلیں جہاں کوئی تعلقات ہی نہیں۔ سناٹا ہے ــ شُونیہ ــ"

خاموش شاہراہ پر وکی میاں اپنی سُرخ ماروتی وین میں دھند کے ساتھ ساتھ آگے آگے اُڑے جا رہے تھے۔

"ماموں میاں ــ" ڈِنکی نے گیر بدلتے ہوئے فیروزہ سے کہا "اب تصوّف سے زین کی سمت رواں ہیں!"

"ہاؤ سُوئیٹ!" فیروزہ نے ہوا میں اُڑتے بال سمیٹے۔

"یہ ایریا بالکل گویا ایک فلسفہ زار ہے" ڈِنکی نے کہا۔ "ویرانے میں ستوپ گویا خاموشیوں کے دفینے! اس طرف ایک ستوپ کے نزدیک ایک قدیم مزار ــــ غازی میاں کے ساتھی تھے۔ یہاں بھی رن پڑا ہوگا۔"

"ستوپ اور مزار ــــ! عجیب جگہ ہے۔" فیروزہ نے کہا۔

"ان کے باہم تعلقات کیسے ہیں؟" صفیہ نے پھر اپنے ڈراؤنے انداز میں کہا۔ "جیسے ستوپوں کے اندر صندوقچوں میں مدفون قدیم ترین بھکشوؤں کی ہڈیاں کھڑکھڑائیں۔ میرا تخیّل بھی ضرورت سے زیادہ ایکٹو ہو گیا ہے۔ فیروزہ نے پھریری سی لی۔

"کس کے تعلقات چھوٹی خالہ؟"

"سناٹے اور سناٹے کے۔ پتھروں سے پتھروں کے معاملات کس نوعیت کے ہیں؟ کوئلہ ہیرا بن جاتا ہے اور مور جنگل میں ناچتا ہے۔"

"ان سے کہیے یہ ہاکی کھیلا کریں۔" پروین نے زرینہ سے سرگوشی کی۔

"ہیں؟"

"یا باسکٹ بال"

"یا ہیرا کوئلہ بن جاتا ہے" صفیہ بڑبڑایا کیں۔

"ارے کوئی بچہ میلے میں تو نہیں رہ گیا؟" اچانک زرینہ نے گھبرا کر پوچھا۔ "شیلی۔ ایمی۔ ڈِنکی۔ سیلی۔ شیلی اور ایمی کہاں ہیں؟"

"سب محفوظ ہیں۔ امی پیچھے پیچھے آ رہے ہیں" پنکی نے جواب دیا۔

پروین سلطانہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ بے چاری کیسی ویران زندگی گزاری۔ میاں چھوڑ کر چلے گئے — بے چاری اکیلی جان نے تین بچوں کو پالا۔ — باپ کی کمی بھی انھیں نے پوری کی اور میں ہوں کہ جب بھی آتی ہوں بیٹھی ان سے لڑا کرتی ہوں۔ لیکن یہ بھی تو تیتا مرچ ہیں۔

پیار سے بڑی بہن کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کاش — واقعی — فیروزہ خالہ کے گھر ہی بیاہ کر آجاتی۔ پنکی کیسا اس کا شیدائی ہے۔ جب سے نگوڑے برائین والی خبر سنی ہے بجھ کر رہ گیا ورنہ کیسا چہکتا تھا مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ آج کل کی خود سر اولاد۔

فیروزہ چلائیں۔ "ارے ارے پنکی وہ دیکھو ایک صاحب ہاتھی پر گھاس لادے چلے جا رہے ہیں۔ اور اتنے مطمئن گویا کوِن کورڈ پر بیٹھے ہیں"

"میلے کے بس اڈے کی بھیڑ دیکھی تھی؟ سب ایسے خوش گویا سوئٹزرلینڈ سے واپس جاتے ہوں" پنکی نے جواب دیا۔

ایک جگہ سڑک کے کنارے چائے کے ڈھابے روشن تھے۔ ان کے چھپروں پر لگے کیسری جھنڈے پچھلے پہر کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"پنکی یہ نارنجی پرچم کس چیز کی علامت ہیں؟ تمہارے ہاں ہر شے کی کوئی نہ کوئی سمبلزم ضرور بتائی جاتی ہے"

"ایک رایٹ وِنگ پارٹی ہے۔ شہر میں اس کا کوئی جلسہ جلوس ہوگا"

"رایٹ وِنگ۔ لفٹ وِنگ۔ تمہارے ہاں سچویشن نہایت — یعنی کہ پیچیدہ ہے نا؟"

"بے شک۔ بے شک۔ بالکل الواغوچین"

پچھلی سیٹ پر تینوں خواتین گہری نیند سو چکی تھیں۔

"ساؤتھ ایشیا کی حکومتیں" فیروزہ نے جوشیلی آواز میں کہا۔ "ایک نکتے پر متفق ہیں"

"شش — آہستہ! امی لوگ سو رہی ہیں"

"ایک نکتے پر متفق ہیں" فیروزہ نے سرگوشی کی — "کہ معاملات — جُوں کے توں رہنے دو"

"املی کے نیچے بیٹھ کر ایک ہی سہ پہر میں تمہارے اندر بہت گیان آگیا!!"

صفیہ نے ایک خرّاٹا بھرا۔

"تھک گئیں بے چاریاں۔ متواتر اتنے دنوں سے ہم لوگوں کے ساتھ ساتھ گھوم رہی ہیں۔ اتنی اسپورٹنگ" پھر وہ اداس ہو گئی۔ "پنکی میں یہاں دوبارہ آنا چاہتی ہوں۔ مطلب یہ — کہ — اس طرح کی اور جگہیں۔ اور چیزیں۔ جو رانا صاحب نے بتلایا — جوگیوں کا ماتم — اور بنجاروں کے نوحے — روری بانو تورا صاحب مارا گیو — تورا راوَل مارا گیو بن میں — اور نویں کی رات دو بجے دائرے میں کھڑے ہو کر جو پڑھتے ہیں۔"

"اوہو — تب تو تم لکھنؤ کی آخری جشنیں بھی برائین کو ضرور دکھلا دینا اور ان کا دائرے کا ماتم —"

یہ کیسی عالی ظرفی ہے۔ بات بے بات برائین کا طعنہ۔ فیروزہ نے تیوری پر بل ڈالے "جشنیں ؟ یہاں ؟"

"زمرد اور الماس۔ غالباً ابھی جیتی ہیں۔ پُرانے محلات میں بہت ساری تھیں۔ نانی آماں ہر سال تین کٹوری میں سُنیوں والی اعزاداری کروانے کے علاوہ شہر کی چند خاص خاص مجالس میں بھی جایا کرتی تھیں۔ امّی اور چھوٹی خالہ اب بھی جاتی ہیں —— ہم بھی ساتھ لٹک جاتے تھے۔ گلیوں میں تعزیوں کے ساتھ چلتے نوحہ خواں دھاڑیوں کے جوڑ۔ اور ان الف لیلوی ڈیوڑھیوں کے اندر جشنیں! وہ دائرے میں کھڑے ہو کر بڑے ہی پُرجلال انداز میں دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ماتم کرتی تھیں گویا افریقہ کی PRIMORDIAL تال اور لے پر۔ دردناک سُریلی آواز میں اس کے ساتھ خواتین کربلا کے بَین —— کہ ہائے ہائے رے ہائے —— کہ ہائے ماں رے۔ بی بی زینب رودن لاگیں میرا بیرن مارا رے —— ان ہی کے کزن امریکن ساؤتھ کے کھیتوں پر اسی غمگین گمبھیر انداز میں NEGRO SPIRITUALS گایا کیے۔"

"سوری۔ تمہارے ہاں ہائے ہائے بہت زیادہ ہے ——"

"ابھی تم باراتیوں کی واہ واہ بھی تو سُن کر آرہی ہو ——

"فیری مسئلہ یہ ہے کہ بعض یونیورسل تہذیبیں اور ان کی ذیلی روایات —— کمیونی کیٹ نہیں کر سکتیں۔ اب میں تم کو سمجھاتا ہوں —— نانی کی ایک سہیلی تھیں۔ رانی بادشاہ بیگم۔"

فیروزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بیکی نے استعجاب سے اس کی طرف رُخ کیا۔

"واقعی یہ —— یہ سچ مچ کا نام تھا؟ رانی بادشاہ بیگم؟"

"ہاں —— کیوں —— ؟ زرتاج منزل میں رہتی تھیں۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر کیوں —— ؟ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" چُپ ہوئے ——

"تمہارا یہ ری ایکشن اسی کمیونی کیشن گیپ کی ایک مثال ہے ——"

لیکن فیروزہ پر ہنسی کا دورہ سا پڑ رہا تھا۔ دہرایا —— "رانی بادشاہ بیگم! زرتاج منزل ——!! رائیلٹی کومپلیکس۔ او۔ کے۔ ہاں۔ پھر؟"

"نو ہمیں منّت کا چھلّہ پہنانے ہر سال وہاں لے جاتی تھیں۔ سات آٹھ سال کی عمر تک وہاں ہم سے کوئی پردہ نہیں کرتا تھا۔ نویں تاریخ کی رات ان کا صحن منّت ماننے والی ہندو عورتوں سے بھی بھر جاتا۔ ٹھیک دس بجے تمام بیبیاں پردے کے پیچھے چلی جاتیں۔ بچّے بھی۔ اور چند سیاہ پوش بڑے وقار سے چلتی آ کر بارگاہ کے سامنے بیٹھ جاتیں۔ اور لاجواب سوز اور سلام پڑھتیں۔ وہ ایک عجیب دلدوز نظارہ تھا۔ وسیع، سنسان امام باڑے کے وسط میں چاندنی پر موجود سیاہ پوش نوحہ خواں عورتوں کا چھوٹا سا گروہ۔ کرب و بلا کے علایم علم تعزیوں کے سامنے بیٹھی اس وقت وہ بہت ہی تنہا اور ساری دنیا سے کٹی ہوئی سی معلوم ہوتیں ——

"یہ منظر —— ایک —— مثال کے طور پر ایک چینی کی عقل و فہم سے بالاتر ہوتا۔"

"چینی کیا۔ میری بھی عقل و فہم سے بالاتر ہے!" فیروزہ نے کہا۔

"اوپر شہ نشین میں چلمن کے پیچھے نو اور امّی کے ساتھ ہم بھی ٹنگے رہتے۔ اس وقت ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ جو نیچے پڑھ رہی ہیں بچّوں تک کو ان سے کیوں چھپایا جاتا ہے۔ وہ شہر کی ایک مشہور گانیوالی تھی اور اس کی بیٹیاں۔ وہ رانی بادشاہ بیگم کے ایک مکان میں ان کی کرائے دار تھی اور شبِ عاشور زرتاج منزل کے اندر آ کر مرثیہ خوانی کی اسے اجازت تھی۔ ۵۹ء میں ہم نینی تال بھیج دیئے گئے۔ وہاں ہم خود کسی چینی کی طرح کرسمس کی اندرونی زبان سمجھنے سے قاصر رہے ——"

"گویا وَن ورلڈ کا تصوّر بے معنی ہے یا پھر آدمی رو کی ماموں کی طرح اندرونی طور پر ہفت زبان ہو۔"

"—— دائرے اور سلسلے۔ وہ یا چلتے چلے جاتے ہیں یا اچانک منقطع اور

معدوم ___ تم ان کے پھیر میں نہ پڑنا مستقبل پر اپنی نگاہ مرکوز رکھو۔"

"وہ تو بالکل ہے۔ مستقبل پر نگاہ مرکوز لیکن میں یہاں دوبارہ آنا چاہتی ہوں۔ مطلب اسی درگاہ کی قسم کے اور مقامات۔ عوامی زندگی ___ روایات ___ اور اپنے ہاں سندھ اور پنجاب میں یہی سب۔"

"گویا اب آپ بقول مانک کھالا بالکل گھاس کی جڑوں سے ابتدا کریں گی! ایریا اسٹڈی ___"

"پھر شاید کچھ لکھوں ___"

"پونم ڈھلوان پر نہیں لکھو گی؟"

"اوہ ___ پلیز ___! برائین ایک پبلشر کو جانتا ہے۔"

"تمہاری کتاب شائع ہو گی۔ اس کے بعد ___؟"

"مطلب ___؟"

"اس پر ریویو چھپیں گے ___"

"ہاں ___ امید تو ہے۔"

"انٹلکچوئیلز کی محفلوں میں اس کا تذکرہ بھی ہو گا۔ پھر ___؟"

"لوگ اسے پڑھیں گے۔"

"اس کے بعد ___؟"

"اوہ بنکی ___ پلیز ___!!"

"ششش ___! آہستہ! ___ اچھا۔ تو واقفیت اور مطالعے اور تجزیے کی کنجی تو تمہیں مل گئی۔ لیکن خزانہ نکالنے والا عامل کامل تو کہیں نہیں ہے۔"

"ہر عامل اوگھڑ بن جاتا ہے؟ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!"

"کمال ہے فیری۔ وِکی ماموں اور ان کے ساتھیوں نے چالیس سال قبل یہ شعر رٹنا شروع کیا تھا ہم بھی وہی رٹ رہے ہیں ارے یار چالیس برس بعد تو حضرت موسےٰ بھی دشت سے نکل آئے تھے۔"

فلی اور شہلا کی موٹریں زائیں زائیں پاس سے گزریں انھوں نے ہاتھ ہلائے۔ وہ قوالیاں گاتے جارہے تھے۔

"یہ لوگ کتنے خوش ہیں!"

"ماشاء اللہ کہو۔"

"ماشاء اللہ۔"

"تم نہیں ہو؟"

"کیا ___؟"

"خوش۔"

"بنکی شاید میں اس فینٹسی ویڈنگ کے لیے نہ آؤں ___ ہاں اگر برائین مصر رہا تو آنا ہی پڑے گا۔"

"مت بھول مسافر تجھے آنا ہی پڑے گا" بنکی مصنوعی شگفتگی سے گنگنائے۔

فیروزہ نے نم پلکوں پر انگلی پھیری۔ "ورنہ وہی سادگی ہے۔ گو سادگی کا تصور ہی ہمارے لائف اسٹائیل سے غائب ہو چکا ہے۔ بنکی تم نے ہمارے ہاں کی شادیاں دیکھی ہیں؟ مہندی، سات دن تک ڈنر وغیرہ۔"

"کلچرل سرگرمیوں کا نعم البدل ___!"

"نمائش پرستی ___ ناقابلِ یقین۔"

"ہمارا تو کیسہ میاں بھائی تمہارا مقلد ہو چکا ہے۔ نمائش پرستی اور اسراف ___ لیکن وہ ہاتھیوں اور بھانڈوں والا کارنیول جو تم چاہتی تھیں اس میں کون سی سادگی مضمر تھی؟ وہ طبقہ یہاں ختم ہو گیا۔ ہاتھی گھوڑوں سمیت۔ ڈنکی کی تقریب البتہ بہت شاہانہ ہو گی۔ وڈیروں کے پاس زمین بھی اب تک ہے اور اقتدار بھی۔"

"تمہیں معلوم ہو گیا؟"

"اتفاقیہ۔ رات ڈنر کے بعد مانک کھالا مسٹر ظفر الاسلام سے ایک تصویر خرید کر بولیں ــــ ڈِنکی بابا کے لیے ویڈنگ پریزنٹ! وہ ایک کالا گھوڑا ہے (یعنی ڈارک ہورس!) ایک وڈیرے کی جیٹ سیٹ ڈِکری ــــ"

"اوہ ــــ"

"فیروزہ ہمیں افسوس ہے کہ ڈِنکی نے ہم سے بھی چھپایا۔ ہماری تو ان سے بچپن کی یاری ہے۔"

"اس لیے شاید کہ تم سلیمہ کی وجہ سے بُرا مانتے۔"

"ہم نے تمہاری اطلاع کا بُرا مانا؟"

چند منٹ کی خاموشی کے بعد فیروزہ نے کہا: "ایک بات کا اور اعتراف کروں؟ اس خیال سے کہ تم کو رنج نہ ہو تم کو میں نے یہ بھی نہیں بتلایا کہ امّی جب وہاں اپنی سہیلیوں کے سامنے تین کٹوری کے قصّے چھیڑتی ہیں تو میں بڑی کوفت سے کہتی ہوں ــــ چھوڑیں امّی اب اپنے پودینے کے باغ کا ذکر نہ کریں۔"

"پودینے کا باغ کیا ــــ؟" پنکی نے دریافت کیا۔

تینوں بہنیں جاگ اٹھیں۔

صبح کا چار بج رہا تھا۔ صفیہ نے کار کے روشن ڈائیل پر نظر ڈالی اور زور سے چیخیں ــــ "پنکی گاڑی روکو ــــ"

بھانجے نے گھبرا کر بریک لگائی۔ وہ فوراً دروازہ کھول کر اتریں۔ راستے کے کنارے جا کھڑی ہوئیں۔ آسمان پر دمکتے دھندلے ستاروں کو غور سے دیکھا اور نعرہ بلند کیا۔ "پچکا لگ گیا!"

کار کے اندر دونوں بڑی بہنیں شرمندہ اور غمگین، سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

جیت وَن وِیہار میں اونچے کرین استادہ تھے۔ کھدائی کی مشینری۔ آرک لائٹس۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ جاپانی کیمرہ مین اور ہندوستانی آرکیالوجسٹ آن پہونچے۔ بازیافت شروع ہوئی۔

کاہے کی بازیافت بھئی۔ وِکی میاں نے کہا۔

جاپانی انہیں ہائیڈل برگ کا کوئی جرمن باستان شناس سمجھے۔

ان کی پارٹی کے افراد نیچے جھانک کر ایک نو دریافت اقامت گاہ کے مشاہدے میں مصروف تھے۔

"یار یہ اسٹوڈنٹ لوگ اتنی ننھی منھی کوٹھریوں میں اٹتے کیسے ہوں گے؟"

"ٹیکسلا میں بھی۔ بیحد ننھی منی کوٹھریاں ــــ"

وِکی میاں مسکرائے۔ "شکر ہے کم از کم ایک چیز تو یکساں نکلی۔"

"ہمارے ٹیکسلا میوزیم میں ایک فریز کے نیچے لکھا ہے۔ شراوستی کا معجزہ ــــ یہاں کیا ہوا تھا؟"

مسز ڈھونڈی اس عظیم الشان پیپل کی شاخ سے کلاوہ باندھنے چلدیں جس کا بیج بودھ گیا سے لا کر یہاں بویا گیا اور گیا ہی جس کے نیچے بیٹھ کر مہاتما بدھ کو جانے کیا معلوم ہو گیا تھا۔ وہ سب اس طرف پہونچے۔

چند تھائی خواتین ایک نیچی ڈال سے کترنیں باندھ رہی تھیں۔

"کفار بھی اسی طرح منتیں مانتے ہیں؟" پروین نے تعجب کا اظہار کیا۔

"پِنّی" وِکی میاں نے ملائمت سے جواب دیا۔ "تو ہمات یونیورسل ہیں۔ بائی دی وے ــــ پِنّی غیر مسلم مشرک ہیں۔ کافر وہ ہے جو خدا کے وجود سے انکار کرے۔ رہے جین اور بودھ نظریات وہ تمہیں سمجھانے کی اس وقت مجھے مہلت نہیں۔ میں بے حد مصروف ہوں۔" پھولوں کا مطالعہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھ گئے۔

پروین سلطانہ پیار سے مسکرائیں۔ وِکی بھیا کے لیکچر! ساری عمر یہ سب کو نصیحتیں کیا کئے۔ نہ دُنیا نے ان کی سُنی۔ نہ انھوں نے دنیا کی۔

پلکیں پھر بھیگ چلیں۔

ہم عمر مہناز، آمنہ اور فیروزہ ایک طرف ٹہلنے چلی گئیں تھیں۔ آمنہ کی مراٹھن آیا رادھا بائی دونوں بچوں کو ایک بنچ پر سُلا کر وہیں بیٹھ گئی۔ رانی دلہن دوسری بنچ پر آبیٹھیں اور وہ بھی اونگھنے لگیں۔

فلی اور نکی جاپانیوں سے باتیں کر رہے تھے۔

پروین پیپل کے نیچے کھڑی رہیں۔ زرینہ اور شہلا ٹہلتی ہوئی ان کے قریب آئیں۔ "یہاں اکیلی کھڑی ہو—" بہن نے کہا۔

شہلا نے محبت سے پوچھا۔

"پینی خالہ — A PENNY FOR YOUR THOUGHTS."

"کچھ نہیں۔ بس اب تو سفر سوار ہے۔ اگلے ہفتے آج کے دن انشاء اللہ تعالیٰ ہم لوگ کراچی میں بیٹھے ہوں گے بلکہ ابھی سو ہی رہے ہوں گے۔"

پیپل کے خشک پتے زور زور سے کھڑکھڑاتے ان پر تیز تیز چلتی صفیہ پاس سے گزریں۔

"یا وحشت! کہاں بھاگی جاتی ہو۔؟" پروین نے بلایا۔

"خامشی سے خامشی کی طرف جہاں اندھیرا اندھیرے سے بات کرتا ہے۔" انھوں نے ٹھٹھک کر اطلاع دی۔

"تھمو تو—" زرینہ نے آمنہ کی ملازمہ کو پکارا "رادھا بائی کافی کا فلاسک لانا۔"

"سناٹے میں محض فاصلہ ہے یا خالص قُرب—حضور قلب—؟" صفیہ نے ایک اور سوال داغا۔

وہیار کے وسیع باغات میں جدھر بالکل تنہائی اور تاریکی نظر آئی اُسی

طرف روانہ ہوگئیں۔ "پھر بہکیں چھوٹی خالہ۔" شہلا نے تاسف سے کہا۔

"تم سب کی بے نیازی کا شکار ہیں۔" پروین پھر برہم ہوگئیں۔

"پینی—" زرینہ نے ایک بنچ کی جانب بڑھتے ہوئے ڈپٹ کر آواز دی۔

"جی—بجیا۔"

"یہاں آؤ—بیٹھو—" ذرا رکیں، پھر بولیں۔ "چھوٹی بہن کے لیے تمہاری بھی کوئی ذمہ داری تھی؟ میں اکیلی کیا کیا کرتی؟ میاں ابا اماں دونوں مر گئے۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے مسلسل مقدمے ہی لڑا کئے۔ تین بچوں کو پال پوس کر میں نے بڑا کیا۔"

"پتہ ہے بجیا۔"

"ان کے باپ کا کوئی فرض نہ تھا؟ طلاق تو مجھے دی تھی۔ بچے تو انہیں کے تھے۔ تم اُسی شہر میں رہتی ہو تم اس شخص کو نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ ان کو کبھی کبھار خط ہی لکھ دیا کریں؟"

"بجیا ان کی بیوی بڑی فتنہ ہے۔"

"یہ بچے تو جانتے ہی نہیں باپ کیسا ہوتا ہے پیسہ کوڑی تو در کنار خط تک نہ بھیجا۔ کیا اتنا ہی کافی تھا کہ امیر ننہال میں پل رہے ہیں؟ تو ننہال میں بھی وہ اللّے تللّے کہاں رہے۔ وکی کو بچی رہا سہا اثاثہ ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ بازی میں جھونک بیٹھے۔ صفیہ بیگم ایک زمانے سے اتنے کامیاب اسکول کی مالک ہیں۔ بلا شرکتِ غیرے مجال ہے جو انھوں نے کبھی بھانجے بھانجیوں پر ایک نیا پیسہ بھی خرچ کیا ہو کنجوس مکھی چوس۔"

"ارے امّی۔ چھوڑیے پرانی باتیں۔" شہلا نے کوفت کے ساتھ کہا۔

"نہ ماموں آڑے آئے نہ خالہ۔ اماں میاں ابا کے مرنے کے بعد میں نے اپنی سیپر کی زمین گہنے بیچ بیچ کر ان تینوں کو پڑھایا اور تم ہو پروین سلطانہ کہ ہر بات کا الزام صرف مجھی پر ڈالتی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ صفیہ بیگم نے یہ گت خود بنائی ہے۔"

ایک تو انھیں دولت کا ہاپٹا ہے اور خسیس بھی کس بلا کی ہیں۔ ٹوٹی چپلیں پہنے پھرتی ہیں سپیڑ سپیڑ۔ سڑیل ایسی۔ ہاں نہیں تو۔ تم نے ان کے لیے کیوں کوشش نہیں کی۔"

"میں کیا کر سکتی تھی۔ ہمیشہ تو باہر رہی۔ سات سمندر پار۔"

"یہ بھی اچھا بہانہ ہے۔"

"اور اب کیا کر سکتی ہوں۔" دفعتاً بڑی ہی بے بسی سے رونے لگیں۔

شہلا نے کندھے پر ہاتھ رکھا: "ارے ارے پینی خالہ۔ صبح صبح روئیے نہیں۔ پلیز۔ آپ عنقریب اپنے گھر جانے والی ہیں۔ ہنسی خوشی سدھاریے۔"

ایک سنجیدہ صورت جاپانی سامنے سے گذرا۔

"دیکھئے یہ جاپانی کیا کہیں گے۔ یہ کبھی ساری عمر ایک آنسو نہیں گراتے۔ اتنے بہادر ہیں۔ اور یہ آرکیالوجسٹ لوگ کیا سوچیں گے!"

"بھاڑ میں جائے ساری دنیا۔ آج کے معاملے تو کوئی سلجھاتا نہیں۔ گڑے مردے اکھیڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔" پروین نے سسکی بھری۔

"پینی خالہ، دیکھئے نسیم سحر کے جھکورے۔ یہ روحانیت سے معمور فضائیں۔"

"بک بک مت کرو شہلا جاؤ صفیہ کو ڈھونڈو —" زرینہ نے حکم دیا۔

ایک گلہری نے پروین کے قدموں میں اکڑوں بیٹھ کر زمین پر پڑی آم کی کیری ننھے سے پنجوں میں اٹھائی گویا غیر ملکی مہمان کو شانتی کا تحفہ پیش کرتی ہو۔ اوم منے پدمے ہوں۔ اوم منے پدمے ہوں۔

زرینہ نے بھتیجوں کو پکارا — "ٹونی۔ بنی۔ جمی۔"

تینوں دوڑے آئے۔ ہشاش بشاش نوعمر لڑکے۔ پھول ایسے چہرے۔

ایک زمانے میں وکی اور بوبی ایسے ہی تھے۔ بے فکر۔ تروتازہ۔ اچھلتے کودتے۔ وکی تو اس پیپل کی طرح بوڑھے ہو گئے۔ بوبی بن گئے کانٹے دار ببھکیا۔

"جی پھوپھی جنیاں؟"

"چھوٹی پھپھو کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ ہم واپس جانے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔"

تینوں بھائی فوراً بوائے اسکاوٹس کی طرح خوش خوش ادھر ادھر بھاگے۔

پروین نے فریچ شفون کے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔

"شادی۔ شادی بس یہی ایک موضوع ہے آپ دونوں کے پاس۔" شہلا نے برا سا منھ بنایا۔

"یہ ہائی کورٹ جج بننے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔" ماں نے شکایت کی۔

"کیوں نہیں؟ اتنی خواتین ہمارے ہاں ہائی کورٹ جج ہیں۔"

"اپنی چھوٹی خالہ کی طرح پسی حریرہ ہو جانا۔"

"امی — وہ پسی حریرہ نہیں ہوئی ہیں۔ اگلے آئیے پینی خالہ تو آنریبل جسٹس مرزا سے ملاقات کیجئے گا!"

"ہوش ٹھکانے رکھو شیلی بیگم — اے بجیا — فیروزہ بھی اسی قسم کی ٹرٹر کرتی تھی — جب برائین کے متعلق مجھے بتلایا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بجیا میں کیا کر سکتی تھی؟ مجبور تھی۔ اولاد کی محبت سے انسان لاچار ہو جاتا ہے۔ ماتا بے بس کر دیتی ہے بجیا۔ ورنہ مجھے کیا پسند ہے عیسائی سے بیاہ؟" پروین نے پھر زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

مانک بائی دھاگہ باندھ کر ڈیر بوڈا سے لو لگانے کے بعد واپس آئیں۔ وکی میاں بودھی ٹری کے نیچے خرگوش کی طرح متبسّم کھڑے تھے۔ ان کے چاروں طرف زرد رنگ کی بارش سی ہو رہی تھی۔ نیچے زمین پر ان عظیم الجثہ زرد پتّوں کا فرش

بجھ گیا تھا۔ بھاگی عورتیں چبوترے پر خاموش بیٹھی شاید اپنے اپنے بھاگی خوابوں کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ صفیہ بھتیجوں کے ساتھ آتی دکھلائی دیں۔

وِکی نے ایک پتہ اٹھا کر مانک بائی کو پیش کیا۔ "تحفہ درویش! اس کے اوپر نہایت شبک پینٹنگ کی جا سکتی ہے۔"

"ہم جارجٹ کی ساری پر پینٹ کرتا ہے۔ اس پر بھی کرے گا وِکی بھائی۔"

"اس پر نقش کیجئے اوم منے پدمے ہُوں! کنول کے دل میں پوشیدہ ہیرا!"

"یہ بدھسٹ لوگ کا مہا منتر ہے نا؟ بٹ میرے کو پالی آتی نہیں۔ انگلش میں چلے گا؟"

"بالکل چلے گا مانک بائی۔"

"مانک کھالا کتنی پیاری چیز ہیں۔ میں تم سب کو بیحد مس کروں گی۔" فیروزہ نے آمنہ سے کہا۔

قافلہ جیت ون وہار کے پھاٹک کی طرف روانہ ہوا۔

لکھنؤ واپسی کے تین روز بعد، پنکی پروین ڈِنکی اور فیروزہ کو دہلی اندرا گاندھی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہنچا آئے ــــــ سب کو ہنوز بہت اداس پایا۔ مزید چند روز تک وہ سب ملول رہیں گے۔ بات بات پر پاکستان واپس جانے والوں کی یاد آئے گی۔ پھر اپنی اپنی مصروفیات میں لگ جائیں گے۔

شہر آم خربوزوں اور جامنوں سے پٹ گیا۔ اساڑھ بھی نکلا۔ کدم کی ڈال میں نیا تختہ ڈلوایا گیا۔ خوش قدم اور سونا کلی نے انتہائی مہارت کے ساتھ ململ کی چنریاں رنگیں۔ بہار آرا بیگم رانی دلہن جس مہارت کے ساتھ وِکی پنکی

اور لڑکوں کے لیے کرتوں کی آستینیں چُنتی تھیں اسی طرح وہ لہریا دوپٹے چُن کر ان کی کنڈلیاں بناتی گئیں۔ "اور یہ پروین اور فیروزہ کے لیے۔ کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھجوا دیں گے ــــ" زرینہ نے کہا۔

"امی وہ لوگ کاٹن تو پہنتی ہی نہیں ہیں آپ جانے کیوں بھجواتی رہتی ہیں۔ بیور میسور سلک کو فیروزہ موم جامہ بتا رہی تھیں!" شہلا نے چڑ کر کہا۔

"تم چپ رہا کرو جی۔ یہ لین دین بھی ہماری زندگیوں تک ہی ہے۔ تم لوگوں کی اولاد تو بالکل ہی ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گی ــــ"

"امی ــــ میں آپ کو ایک اور طریقے سے سمجھاتا ہوں۔" پنکی بولے۔ "اپنے نگڑ دادا کا نام آپ کو معلوم ہے؟ نہیں؟ ان کے بھائی بہنوں کی موجودہ نسل کو جانتی ہیں؟ نہیں! وہ کہاں ہیں؟ یہ بھی نہیں! نہ آپ کو جاننے کی پرواہ ہے! تو ہم سب کی آئندہ پیڑھیاں اگر ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوں گی تو کون سی انوکھی بات ہوئی؟ یہی سوچ کر خاطر جمع رکھیے!"

ساون کی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی جب شیخ طاہر علی نے کلکتے سے اطلاع دی کہ عنقریب پہنچنے والے ہیں۔

پنکی نے مجوزہ روز ہاؤس کی تعمیرات کے فائیل نکلوائے۔

---

۱۲ آلہا اودل

چوڑے کنارے اور ہری دھاریوں والی بنگالی ڈیزائن کی نفیس سُوتی ساری میں ملبوس ایک سانولی قبول صورت خاتون کارلٹن ہوٹل کے برآمدے میں کھڑی نواب و بیگم کے وہ حسین موڈل بنظر غور ملاحظہ کر رہی تھیں۔ جو کسی چکن فروش نے بطور اشتہار ایک شوکیس میں سجا رکھے تھے۔ دھانی لہنگے اور سُرخ دوپٹے میں ملبوس ایک بانکی جمعدارنی فرش پر پُچارا لگا رہی تھی۔ ہاتھ کی جنبش کے ساتھ ساتھ اس کے گھنے بالوں میں چھپی نقرئی بجلیاں چمک اٹھتیں۔ باہر آسمان پر ساون کی کالی گھٹا میں چھپی بجلی کوندجاتی۔ ہوٹل کے اونچے درختوں کی ہریالی سکندر باغ کے زمردیں رنگوں میں رل مل گئی تھی۔ نم مٹی کی سوندھی خوشبو اور تازگی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جیٹھ اساڑھ کی تپش کے بعد شادابی اور تراوٹ کا موسم۔

سفید پوش بیرے راج کی پرچھائیوں کے مانند برآمدے میں سے گزر رہے تھے ٹالی گنج کلب کلکتہ کی طرح ایک اور باقی ماندہ کولونیل جزیرہ۔ بنگالی ساری میں ملبوس خاتون دارجلنگ اور کلکتے کی اسی اپر کلاس برطانوی پرچھائیں میں پلی بڑھی تھیں۔ اس ہوٹل کو مختلف نہ پایا۔ پلاسٹر آف پیرس کے نواب و بیگم پر دوبارہ نظر ڈالی۔ ڈمی نواب صاحب سفید انگرکھا دوپلی ٹوپی پہنے آداب بجالا رہے تھے۔ سر خم کیے' جھک کر دایاں ہاتھ اٹھائے اس پر تکلف شائستہ انداز میں منجمد۔ جبکہ دنیا ان کے سامنے سے نکل چکی تھی مصنوعی "بیگم" نے کامدانی کا غرارہ پہن رکھا تھا۔ نیچے کسی فرم کا نام لکھا تھا۔

نم، چمکیلے فرش پر دراز قد بنکی کا عکس پڑا۔ پھر وہ خود نمودار ہوئے۔

ملکہ سبا اور سطح آب کا فرش۔ لیکن اس خاتون نے خاصی بے رخی سے رسٹ واچ دیکھ کر کہا: "مسٹر مرزا ــــ؟ لیلاے سروش"۔

بنکی نے لامحالہ شوکیس والے ڈمی نواب کی طرح تسلیم عرض کی۔

"ڈیڈی اپوائنٹمنٹ کے مطابق صبح نو بجے سے آپ کے منتظر ہیں"۔

"چند ٹرنک کال آگئے تھے۔ معاف کیجئے گا"۔ کھسیانی ہنسی۔

ایک سُو پرایفی شنٹ نو نوسنس بزنس وومن۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد سے والد کی دست راست اور اس قدر مصروف کہ آج تک لکھنؤ ہی نہیں آسکی تھیں۔

"یہ بھی ٹورزم کے سمبل بن گئے۔ نواب اور بیگم۔ اور ان کو بیچتا کون ہے؟" صاحبزادی نے بنکی کے ہمراہ تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری رستوگی"۔

"وہ کون ہیں؟"

"جیسے آپ کے کلکتے کے مارواڑی"۔

"نارتھ انڈیا کی چکن بادلہ مارکیٹ میں بھی اسٹڈی کروں گی۔ اس کے ایکسپورٹ فیگرز کا آپ کو کچھ آئیڈیا ہے اور اس طرح کی چھڑیاں بھی ــــ جیسی یہ عورت اوڑھے ہے"۔

قیامت خیز انٹر پرینیور تھی۔ ایک دروازے پر ٹھٹکے۔

"جی نہیں۔ اور آگے چلئے۔ یہ برآمدہ کتنے فرلانگ لمبا ہے؟"

"ہمارے انگریز آصف الدولہ بہادر کے جانشین تھے معقول عمارتیں بنوا گئے"۔

"اب آپ بھی روزانہ دس معقول بنوائیے۔ اور وقت پر"۔

انٹر پرینیور خواتین بمبئی اور کلکتے میں بے شمار ہیں۔ یہ اس پروانشل شہر کے

لیے ذرا انوکھی رہیں گی۔ ننکی نے خائف ہو کر سوچا کہ کہلاتے ہی ننکی ننکی تھے۔ صبح دس بجے دفتر پہنچنے والے۔ دفتر کیا قصر شیریں کا کارڈ روم۔ اہل شہر سے اس نوع کے تعلقات گویا وہ ایک بہت بڑی جوائنٹ فیملی تھی۔ دوست احباب تھے تو وہ زیادہ تر اپنے والدین کے دوستوں کی اولاد گویا ورثے میں حاصل کی تھی۔ ملازم تھے تو خانہ زاد۔ چالیس برس قبل جو پنجابی اور سندھی پاکستان سے بطور ریفیوجی یہاں آن کر بسے تھے بات چیت میں انھوں نے مقامی رنگ اختیار کر لیا تھا لیکن رہے ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند۔ لہٰذا بزنس پر چھا گئے۔ پھر بھی مزے مزے سے گزر رہی تھی۔ یہ لیلٰے سروش تو ہنر والی ثابت ہوں گی۔

برآمدہ ندی کی طرح بہتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ایک موڑ پر وہی جمعدارنی پچارا لگاتی ملی۔ بڑی ادا سے ننکی کو سلام کیا۔

"اتنی دیر میں ابھی یہیں تک پہنچی ہے یہ سو تیرس۔"

"کلاس فور کرمچاری کہیے۔"

"ہر چیز سلوموشن۔ ہر چیز سلوموشن۔"

لیکن تیسرے روز ننکی میاں نے جو صبح نو بجے ہی قصر شیریں پہنچ گئے تھے پھرتی سے اپنی بڑی بہن شہلا کا نمبر ملایا — "اپی — وہ — کونسا شعر ہے — گر تو برا نہ مانے تو سکون دل کی خاطر" فون کھٹ سے بند۔ گویا خود بھی ہوا کے گھوڑے پر سوار۔

کچھ دیر بعد اپنی والدہ زرینہ سلطان کو فون کیا۔ "امی — وہ — ایسا ہے کہ اس جمعے کو شیخ صاحب کی زمین پر انشاء اللہ کام شروع ہو جائے گا۔ لیلٰے میلاد شریف کروانا چاہتی ہیں۔ ہمارے ہاں ہی انتظام کر دیجیے۔"

"ضرور۔ ضرور۔ اور بھئی وہ اب تلک ہم لوگوں سے ملنے نہیں آئیں۔"

"بے انتہا مصروف ہیں۔ کل صبح ہوا خوری کے بعد۔"

لیلٰے نے اپنی نوٹ بک میں درج کر لیا تھا T.K.H. 7.30 A.M.

کارلٹن ہوٹل قصر شیریں اور T.K.H کے آدھوں آدھ فاصلے پر درمیان میں واقع تھا۔ سالہا سال سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ پہلے تین کٹوری اور شیریں کامٹی والے سورج نکلنے سے پہلے اپنے اپنے گھروں سے نکلتے اور سکندر باغ کے پھاٹک پر یکجا ہو کر اندر ہوا خوری کے لیے چلے جاتے۔

مسٹر طاہر علی فیل فروش نے پچھلے پندرہ سال کے دوران بسلسلہ مقدمہ ریڈ روز کلکتے سے آن کر کارلٹن میں اتنی مرتبہ قیام کیا کہ وہ "کلکتے والے شیخ صاحب کارڈوم" کہلانے لگا تھا۔ تب وہ کبھی کبھار ہی سکندر باغ میں چہل قدمی کرتے تھے۔ ان مفلوک الحال میراثیوں سے کیس جیتنے کے بعد اسی چمنستان میں ٹہلتے ہوئے انھوں نے پرویز اینڈ فرہاد کو کنٹریکٹ دیا تھا۔ اس دفعہ وکی اور سلیمہ ننکی اور شہلا شیخ باپ بیٹی کو ہوٹل کے پھاٹک سے ہمراہ لیتے ہوئے سکندر باغ کے گیٹ پر پہنچ جاتے جہاں ڈھونڈی خاندان منتظر ملتا۔ فلی ننکی اور شیخ باپ بیٹی چہل قدمی کے دوران مجوزہ تعمیرات کے متعلق تبادلہ خیالات میں لگ جاتے۔ وکی جا بجا ٹھٹھک کر اپنے دوست پھولوں اور پیڑوں کو دیکھتے جاتے یا کنول کے تالابوں کے سمت چل دیتے۔ شلوار قمیص، جوگنگ سوٹ اور کینوس کے جوتے پہنے فیشن ایبل خواتین و حضرات باغ کی معطر سڑکوں پر سے جوق در جوق گزرتے رہتے۔ شناسا ایک دوسرے کو نمستے، گڈ مورننگ اور آداب عرض کہتے جاتے۔

طلوع آفتاب کے ساتھ وہ سب پھاٹکوں پر کھڑی کاروں اور اسکوٹروں پر بیٹھ کر ہوا ہو جاتے۔ باغ کے متصل امام باڑہ شاہ نجف کے سامنے شاہ نجف روڈ پر سے ٹہلتے براؤن صاحب میم صاحب اور ان کے کتے اپنی قدیم کوٹھیوں کی طرف لوٹتے نظر آتے۔

لیکن یہ پرسکون ماحول بھی سُرعت سے معدوم ہو رہا تھا۔ اس پُر فضا علاقے کے بیشتر بنگلے منہدم کیئے جا چکے تھے۔ ان کی جگہ اپارٹمنٹ بلاک اور دفاتر تعمیر ہو گئے تھے۔ اکثر ہوا خوری کے بعد مانک بائی کلکتہ والوں کو اپنے گھر لے جا کر انگلش بریک فاسٹ کھلاتیں۔ ایک صبح انھوں نے کہا ــــ

"ادھر دیکھو مسٹر ٹائیر بھائی ہاتھی والا۔ فلی بھی تمام پُرانے بنگلو گرانے پر جھکا ہوا ہے۔ پر ہم نے بول دیا ہے۔ شیریں کاسل کو ہاتھ نہ لگانا۔ تم اس کا سنٹی منٹل ویلیو نہیں سمجھ سکتا۔"

"اوہ ممی ــــ! اس علی بابا کے غار میں کب تک رہے جاؤ گی۔ ڈِنکی تو اس کی حالت دیکھ کر بھو نچکے رہ گئے۔ مارے اخلاق کے کچھ بولے نہیں۔ تمہارے کمرے ہیں یا بڑے امام باڑے کی بھول بھلیاں ــــ؟ بس اجازت دیدو۔ دیکھو اس کھٹار افرنگی چھتّے کی جگہ کیا بڑھیا پندرہ منزلہ شیریں ٹاور بناتا ہوں! ــــ اتنا ہرا نیلا گلاس آیئنے جھاڑ فانوس۔ ہر تصویر کے آگے کنول ــــ ممّی یہ گھر ہے یا امام باڑہ ــــ ڈیٹ ری مائینڈ زمی ــــ مہناز تم اتوار کے روز لیلے کو شہر گھما لاؤ۔ اور لیلے سروش تم جنگل گرل ہو کر اتنی ور کھلک ــــ!"

"ڈیڈی واپس جانے والے ہیں۔ میں تو ابھی یہیں رہ کر کام دیکھوں گی۔ اسپیڈ ورک ــــ تم لوگ کہتے ہو ساون کی جھڑی لگنے والی ہے۔"

"تم اکیلا چھوکری ہوٹل میں کیسے رہے گا۔ ادھر آ جاؤ۔"

"لیلے کو اوپر والے گیسٹ روم میں مت ٹھہرانا۔ شا طوِ مار گو میں۔" فلی نے پُراسرار انداز میں لیلے کو مخاطب کیا۔ "کرنل دو بووار رہتے تھے ــــ اکثر وہ آدھی رات کو پھر آ لگا جاتے ہیں۔ مع فی فی۔ اور وہ بھونکتی بھی ہے۔"

"ہم کلکتے کے انگریز بھوتوں کے عادی ہیں۔ ڈونٹ یو وری!"

وہ سب امام باڑہ آصفی کی بھول بھلیاں میں داخل ہوئے۔ شہلا اور مہناز آگے آگے جا رہی تھیں۔ مانک بائی اپنے مٹاپے کی وجہ سے ذرا پیچھے رہ گئیں۔ لیلے ان کے ساتھ تھیں۔ مانک بائی کہہ رہی تھیں "تمہارا ڈیڈی اتنی بار لکھنؤ آیا اور تم فرسٹ ٹائم۔ ایسا کیسے؟"

"پہلے میں امریکہ چلی گئی پڑھنے۔ پھر کام میں لگ گئی ــــ تینوں چھوٹے بھائی بزنس کرنا نہیں چاہتے۔ ہائی ٹیکنولوجی میں پڑ گئے ہیں۔ تو ڈیڈی کا ہاتھ کون بٹائے؟ ہمارے ایک ہی چچا ہیں۔ وہ ایسٹ پاکستان میں تھے۔ چاٹگام، سلہٹ میں کھید اکرواتے تھے۔ سنہ اکہتر میں وہاں ان کی بیوی اور لڑکے مارے گئے۔ لڑکیاں اغوا ہو گئیں۔ وہ خود جان بچا کر کلکتہ آئے۔ ڈیڈی نے اپنے ساتھ کام میں لگایا۔ مگر بیوی بچوں کا صدمہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے دل نے جواب دیدیا۔ اب وہ مستقل بیمار رہتے ہیں۔ میں ان کی جگہ کام کرتی ہوں۔"

"شاباش۔ یہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ بٹ سنو۔ اب تم تھوڑا اپنا اسپیڈ کم کرو۔ ہاتھی پکڑنے کے بجائے ایک چھوکرا پکڑو۔ سُنا کیا؟"

"جی ــــ؟"

"آیر وِنکی ــــ سُنا کیا؟ زندگی ایسا ہی ڈارک سُرنگ ہے۔ تمہارے پیارے باپ کا کزن قنبر علی اس بھول بھلیاں میں غلط چھوکری سے ٹکرا گیا تھا۔ پھر دیکھو اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اور صفیہ سلطان اس نے اپنے آپ کو خود ہی بھول بھلیاں میں ڈال دیا۔ دِکی کا معاملہ بانچو۔ وہ چاندنی کا ٹریجڈی۔ خدا ان لوگوں کو معاف کرے۔ ہم تو ان سے اتنا ناراض ہوا تھا کہ بہت دن تک ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا ــــ آدمی اپنی دولت اور پوزیشن کے نشے میں بھول جاتا ہے ــــ تمہارے چچا کے ساتھ کیا ہوا۔ جب وہ ٹھاٹھ سے سہلٹ میں اپنی فیملی کے سنگ رہتا تھا کیا اسے پتہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھیانک ٹریجڈی ہونے والا ہے؟ تم ابھی

اونچی لہروں پر اوپر جا رہی ہو۔ پن تھوڑا اپنی شان کو الگ رکھ دو۔ یہ ٹنل میں جدھر روشنی آوے ادھر لپکو —— اب تم کوئی بہار کے موسم کی مرغی کا بچہ نہیں ہو۔"

"جی —— ؟" لیلا ابھی مانک باتی ڈھونڈی سے اتنی واقف نہیں تھیں کہ اسپرنگ چکن کا ترجمہ فوراً سمجھ لیتیں۔

"ممی اس شہر کی نمبر ون میچ میکر ہیں۔"

"ہاں۔ مہناز۔"

"پنکی؟"

"ہاں مہناز۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"ہاں مہناز۔"

"ایک دم اوسکر وائیلڈ والا جواب! شاباش۔ کم ایلونگ ——"

برسات نکلی۔ پت جھڑ کی ہواؤں کے ساتھ پرویز اینڈ فرہاد کے سینیئر پارٹنر نے بنگال کی اڑان بھری۔ ایک چھلاتی رات ٹالی گنج کلب میں چاء پیتے ہوئے ایک پیّی نے دوسرے پیّی کو اپنی میسور پروجیکٹ سے آگاہ کیا۔

"دور کی سوجھی!" خاتون انٹرپرینیور توصیفاً مسکرائیں۔ "پینے سے چار بڑھتی ہے آنکھوں کی روشنی۔ ڈماؤں نظر آتا ہے موغل سرائے سے۔"

"ماموں میاں کے بڑے صاحبزادے ٹونی کے متعلق ہمیں بہت فکر ہے۔ باپ کی طرح شاعر مزاج آدمی ہیں۔ گل و لالہ چرند پرند سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ منجھلی خالہ وغیرہ آئی ہوئی تھیں۔ ان کو ہم لوگ گھمانے لے گئے۔ ایک شرائین پر صندل کا پیڑ دکھلائی پڑا۔ اچانک خیال آیا۔ چندن کی ہوا ٹونی میاں کو خوش

آئے گی۔ ایک کرناٹکی پارٹنر درکار تھا۔ خیر۔ ایک عدد فیل نشین ٹمبر ایکسپرٹ بونگ بھی چلے گی۔ بقول فلی —— ! اللہ میاں مسبب الاسباب ہیں۔"

لیلا سوچ میں پڑ گئیں۔

خزاں کی زرد رات۔ کسی باؤل سنیاسی کی طرح نغمہ سرا سُریلی ہوائیں دور بنوں سے گزر رہی تھیں۔ کلب کے باہر زعفرانی پتوں کے احرام زیب تن کیے اونچے درخت دراز قد وارثی درویشوں کی طرح استادہ تھے۔

گول، پیلے چہرے والے، سر منڈے لاما جیسے کاتک پورنماشی کے چاند نے دریچے میں جھانکا۔

"اوہ یاہ —— شیور! دو تین سال ادھر جنگلوں میں ایک بڑا اسینز لاما ملا ——" بنگالی اڈے یعنی طولانی گپ اور پُر لطف بحث مباحثے کی عادی اور شائق لڑکی نے ونڈو سیٹ پر آرام سے بیٹھتے ہوتے جواب دیا ——

"وہ بھوٹان کے پہاڑوں سے اترا تھا اور میرے جنگل میں بھٹک رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے اسے ہاتھی پر بٹھا کر بینا گوڑی پہنچایا۔ راستے میں اس نے کہا ——"

"تم بھوٹانی لاؤ گی تو ہم انواع و اقسام کے لاما نکالیں گے جو کیلی فورنیا کے پہاڑوں سے اترے تھے شیشہ پانی کے کنارے۔"

"سنو تو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہر شے اور ہر واقعہ انڈپنڈنٹ نہیں ہے۔ ساری کائنات سے ایک فرد کے ان گنت رشتے ہیں۔ نہ کوئی بیگانہ ہے نہ جداگانہ اور ہر چیز دوسری چیز پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ ارے۔ جانے کیا بات ہے باہر وکٹوریہ میموریل بھونک رہا ہے۔"

"ٹیمز کے کنارے والے سنگی شیروں کے لیے کہاوت ہے کہ وہ بڑے ہی نادر موقعوں پر گرج اٹھتے ہیں۔ وکٹوریہ میموریل بھونکنے بھی لگا؟"

"ارے نہیں۔ یہ ایک صاحب نظر انگریز کا کُتا ہے۔ بیحد سُوئیٹ۔"

ہر لڑکی ایک جیسی بات کیوں کرتی ہے؟ فیروزہ کہتی تھی ___ وہ کتنا سُوئیٹ گدھا گھاس چر رہا ہے۔ یہ دھوبی کتنا سُوئیٹ ہے۔

"ہلو! تم کس پینک میں چلے گئے؟"

"آہا۔ وہ کتنا سُوئیٹ لاما تھا۔ اور اس کا فلسفہ اس قدر کیُوٹ! اور اور بجبل۔"

"ڈُونٹ اپ پنکی۔"

وہ دونوں دوبارہ اپنی اسکیم کے متعلق تبادلہ خیالات میں مشغول ہو گئے۔

"صندل انڈسٹری میں ___ تینتیس فیصد سرمایہ دار اور ستر فیصد موروثی کاریگر میاں بھائی ہے جو روایتی اور موڈرن مصنوعات تیار کرتا ہے۔ اگر ہم ___"

شیخ سروش کی پرانی دوست لیڈی گھوش برج رُوم کی سمت جاتے ہوئے لاؤنج سے گزریں۔ ان دونوں کی کاروباری گفتگو کان میں پڑی۔ ہمارے زمانے میں ___ انھوں نے افسوس کے ساتھ سوچا ___ نوجوان منگیتر لوگ اسی دریچے میں بیٹھ کر MOONLIGHT & ROSES کی بات کرتے تھے۔ رومانس کا تصوّر ہی ختم ہو گیا۔

شیخ اینڈ مرزا لکھنؤ پہنچے۔ لیلےٰ نے حسب سابق قصرِ شیریں میں قیام کیا۔

ایک خوشگوار اور مُنوّر صبح احاطہ ریڈ روز کے پیپل پر ایک کھریچا آن بیٹھا اور گویا الحمدو کی آواز میں بولا ___ منشی جی ہو ___ اِکھریچا پہاڑ سے اُترآوا۔ جاڑے آ گئے۔

مسٹر طاہر علی کی اراضی پر سے "گلاب باڑی" کے باسیوں کو بیدخل کرنے کے لیے بلڈوزر آ گئے تھے۔ ایک طرف پولیس کی چھولداری پڑی تھی۔ شامیانہ تان کر چند کرسیاں اور میزیں لگا دی گئی تھیں۔ اسٹوو پر رکھی چائے کی کیتلی میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پرویز اینڈ فرہاد کے اہلکار راج مزدوروں کو شیرینی تقسیم کر چکے تھے۔ پنکی، فلّی اور لیلےٰ میز کے گرد بیٹھے کاغذات دیکھ رہے تھے۔

صفیہ سلطان ایک قطعہ زمین کی پیمائش کروانے میں مشغول تھیں جس پر وہ اپنا کنڈر گارٹن بنانے والی تھیں۔

"روز ہاؤس کے آرکیڈ کے لیے" پنکی نے لیلےٰ کو مخاطب کیا "دھڑا دھڑ بکنگ جاری ہے۔ ذرا یہ سنو" انھوں نے فہرست نکالی۔ "نمبر ایک پری خانہ بیوٹی پارلر مسٹر محبوب سلمانی۔ لندن سے ہیر ڈریسنگ کی ٹریننگ لے کر آئے ہیں۔ بمبئی میں امیتابھ بچن کی زلفیں سنوار چکے ہیں۔ ان کا ایک سیلُون حضرت گنج میں بھی چل رہا ہے۔ ہماری اشتوناؤن کے پوتے ہیں۔ دس از ریل ڈیموکریسی لیلےٰ۔ اس سرمایہ دار معاشرے کے متعلق بھی کچھ امید بندھتی ہے۔"

"ویری ٹرُو ___"

"نمبر دو۔ فٹافٹ لانڈری۔ منظور احمد ولد ننھّا خاں مرحوم، جو یہیں ریڈ روز میں کام کرتے تھے۔ یہ خود جدّہ میں طویل عرصہ گزار کر واپس آتے ہیں۔ ان کی جھٹ پٹ لانڈری شہر میں چل رہی ہے۔

"نمبر تین۔ کنگ فُو چینی ریسٹوران۔ لاڈلے مرزا۔"

"نام سے تو یہ کوئی شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔" فلّی نے کہا۔

"ہاں۔ آغا میر کی ڈیوڑھی پر رہتے ہیں۔ اپنے باورچی کو منیجر بنائیں گے۔ انہوں نے ابھی پہلی قسط داخل نہیں کی۔"

"دو چار لالہ بھائیوں نے سُپر مارکیٹ، فاسٹ فوڈ اور ویڈیو گیمز ___"

"ویڈیو گیمز ـــ! یار اس آرکیڈ کو پالیکا بازار نہ بناؤ۔ چھوٹی خالہ کا اسکول اسی کے سامنے پڑے گا۔"

"بازیچۂ اطفال ـــ!" وکی میاں کی آواز آئی۔ مسکراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ پنکی فلی، لیلے فوراً کرسیوں سے اُٹھے۔ "ویلکم بڑے ماموں۔"

"بجیا تم لوگوں کا لنچ بھیج رہی تھیں۔ بچہ پارٹی میں شامل ہونے کیلئے ہم بھی ـــ!"

تینوں نوجوان ان کی آمد سے مسرور تھے۔ صفیہ واپس آئیں۔ تینوں کے چہرے اتر گئے۔

"تم یہاں باغیچۂ اطفال کھول رہی ہو؟" وکی میاں نے دریافت کیا۔

"قنبر میاں کہا کرتے تھے اپنے باغ میں ایک مدرسہ تعمیر کریں گے۔ ان کی روح خوش ہو جائے گی۔" صفیہ نے جواب دیا۔

"قنبر علی مرحوم نادار بچوں کے لیے مفت تعلیم چاہتے تھے ـــ تمہارا اسکول تو بہت مہنگا ہوگا۔ کتنی فیس رکھ رہی ہو؟ پانچ سو روپے ماہانہ فی بچہ؟ اس علاقے میں تو اب زیادہ تر پنجابی، سندھی امیر کبیر بزنس مین ہی آباد ہیں۔"

صفیہ چیں بجبیں ہو کر پھر ایک طرف کو ٹل گئیں۔

"پنکی تمہاری خالہ کا کیا پرابلم ہے؟" لیلے نے آہستہ سے پوچھا۔

"پیچیدہ۔ اب اپنے پینٹ ہاؤس کا پلان نکالو۔"

"یہی بہار کے دن تھے یہی زمانہ تھا — یہی جگہ تھی اسی جا پہ آشیانہ تھا
اے باغباں تجھے کیا کیا نشان تبلاتیں!"

ـــ کرتے بجے بھانڈ مع پارٹی گاتے بجاتے آن پہنچے۔ کورنش بجا لائے۔

"ارے بھئی ایسا اداس گانا تو اس وقت نہ گاؤ ـــ" پنکی نے کہا۔

"تقصیر معاف سرکار۔ آپ کے چوکیدار اندر نہیں آنے دے رہے تھے۔ بتاشے بلانے آئے تھے۔ ہم فرنگی بارات کی تاریخ معلوم کرنے کوٹھی پر گئے۔ معلوم ہوا آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔"

فرنگی بارات ـــ پنکی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لیلے اس اچانک تغیر پر متعجب ہوئیں۔ وکی میاں نے ملال کے ساتھ پائپ کا کش لگایا ـــ بچوں کے جذباتی مسائل۔

وہ اٹھ کر برڈ باتھ کی طرف چلے گئے۔ بٹو چچی کے چمکیلے سجے سجائے باتھ روم مٹ چکے۔ وہ پرندوں کے خاطر جو انتظام کر گئی تھیں اس کے لیے بادل پانی بھی مہیا کرتے ہیں اور چڑیاں اسی طرح نہاتی دھوتی بھی ہیں۔

لگر پر ایک تیتری آن بیٹھی۔ "ہلو۔" پھر انھوں نے لیلے پر نگاہ کی۔ فیروزہ پرواز کر گئیں۔ انھوں نے چڑیا کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ لیلے ایک خاتون بچی ہیں۔ یہ نہیں اُڑیں گی۔ لیکن ذرا تم بھی انہیں سمجھا دینا!

یکبارگی ایک غیر متعلق خیال۔ نوجوانوں کو پکارا۔

"بھئی یہ اکبر بادشاہ چوکی پہ کہاں جاتے تھے؟"

پنکی اور فلی ہنس پڑے۔ گڈ اولڈ وکی ماموں۔

"ہم نے فتح پور سیکری میں بہت ڈھونڈا۔ اکبر بادشاہ کا بیت الخلا کہاں تھا؟"

"سرکار دست قدرت نے کچھ بندوبست کیا ہوگا۔" کرتے بجے بھانڈ نے دست بستہ عرض کی ـــ راجہ صاحب کو اپنی طرف متوجہ پاکر برجستہ مکالمہ شروع ہوا۔

"کیوں صاحب سیکری کبوتروں سے خرید لیں؟"

"وہ پھر آ جاتیں گے۔"

"یہ جہانگیر باغ؟ کیا قیمت ہے؟"

"ایک شیشی عطر گل۔"

"یہاں کیا اُگاؤ گے؟"

"گل سیکڑہ۔"

"گل ہزارہ کیوں نہیں؟"

"ٹیکس لگ جائے گا۔"

"اور ــــ؟"

"لوکی ــــ! اس بلڈوزر ایسی۔"

"اتنی بڑی؟ بھلا اسے پکاؤ گے کہاں؟"

"گومتی ہیں۔ فرنگیوں کی بارات ہے جانے کتنے آدمی ہوں۔"

"جو بارات یہاں سے کلکتے جاوے گی اس کے لیے کیا سمندر میں مچھلیاں تلی جاویں گی؟"

لیلےٰ لجا کر فائیل پڑھنے لگیں۔

"کجاوے لاد کر لائیں گی۔" مکالمہ جاری رہا۔

"ہودے!"

"ہودے! اس دہیج کی مکھیہ اُپ لبدھیاں ہمیں کیا ہونے کی سمجھاونا ہے؟"

رینکی نے قہقہہ لگایا۔ "تم لوگ دوردرشن پر کیوں نہیں جاتے ہو؟"

"درشنی ہنڈی ملے گی؟ حضور کا اقبال بلند ہوا اور فیض جاری رہے ہم تو اسی فراق میں رہتے ہیں کہ آپ کے ایسے ہنر پرور کو جوش آجائے۔"

"ہاں تو پتنگے ــــ ناقہ کب پہنچے گا؟"

"ناقہ نہیں بے وقوف۔ میگڈ مبر۔"

"یہ لوگ تمہارا نام، تمہارے والد کا کاروبار سب معلوم کر چکے ہیں۔ لیلےٰ کی مناسبت سے انہوں نے بھاری جہیز کے لیے کجاوے لاد کر لانے کا محاورہ استعمال کیا۔ ہاتھیوں کی مناسبت سے دوسرے نے فوراً ہودے اور میگڈ مبر۔" رینکی نے آہستہ سے لیلےٰ کو سمجھایا۔

وکی میاں نے اپنے ذاتی خدمتگار کو ابرو سے اشارہ کیا۔ اس نے ایک طرف جا کر بھانڈوں کو انعام دیا۔ انہوں نے روایتی دعاؤں کی بوچھار کی۔

دیہاتیوں کے ایک گروہ نے جھانکا۔ کرنجے نے عرض کی: "حضور ٹھاکر مہابیر پرشاد سنگھ نے حسب فرمائش چند بھاٹ بھی ارسال کئے ہیں۔ تین کوڑی کا آخری بھاٹ تو کب کا مر چکا۔"

"ہر ہر مہا دیو ــــ" احاطے کے باہر زوردار نعرہ بلند ہوا۔ پھر مجمع کی بھنبھناہٹ۔ رینکی نے ایک کلرک سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"شاید کوئی میلہ چل رہا ہے۔"

"لوگ تو کمپاؤنڈ کے اندر آ گئے۔ ٹھہرو ہم جا کر دیکھتے ہیں۔"

احاطے کے مشرقی گوشے میں پیپل تلے ہجوم جمع تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟"

"مہا دیو گڑھی کا میلہ حجور۔"

"مہا دیو گڑھی ــــ؟ وہ کہاں ہے؟"

"یہیں حجور جہاں آپ کھڑے ہیں۔"

"یہ تو شیخ صاحب کی زمین ہے۔"

"ہمیں چودھری جی نے بتلایا کہ یہ مہا دیو گڑھی ہے اور اس کے میلے کا آج شبھ آرمبھ ہو گا۔ ہم لوگ گاؤں سے آئے ہیں۔"

"یہ چودھری جی کون ہیں؟"

"ہمارے بلاک کے نیتا۔"

رینکی نے نظر دوڑائی۔ پیپل کے تین طرف کافی زمین گھیر کر سفید اینٹوں سے حد بندی کر لی گئی تھی۔ ایک گوالے سے پوچھا۔ "یہ مندر کب بنا ــــ؟"

"پراچین کال میں جور۔"

دوسری سمت نگاہ کی۔ غربی گوشے میں مسجد کے تین طرف اسی قسم کی اینٹیں چُن دی گئی تھیں۔

پنکی نے ایک اوورسیر کو بلایا۔ "ماتھر صاحب یہ تقریباً پانچ پانچ سو مربع گز زمین ناجائز بستی والوں نے الگ سے قبضے میں کر لی ہے۔ آپ نے اب تک یہ سفید اینٹیں نوٹس نہیں کی تھیں؟"

"سر۔ ہم صبح سے اُتری سائیڈ میں مصروف تھے۔ ادھر آئے ہی نہیں۔"

فلی آن پہنچے۔ وہ تینوں مسجد کی طرف گئے۔ ایک نوعمر ملّاجی منڈیر پر بیٹھے اہلِ دَیر کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔

"السلام علیکم مولوی صاحب۔"

"وعلیکم السلام۔"

"مولوی صاحب۔ یہ چک بندی کیسی ہے؟"

"واللہ اعلم بالصواب۔"

"آپ یہاں کب سے ہیں؟"

"والد مرحوم یہاں پیش امام تھے۔ گھوسیوں نے مقرر کیا تھا۔ تبھی سے یہ جھانکڑ والی مسجد کی زمین سمجھی جاتی ہے۔ الموسوم بہ مسجد گلاب باڑی۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"جہاں آپ کھڑے ہیں۔"

"ارے ملّاجی یار کیا غضب کرتے ہو۔ یہ تو شیخ طاہر علی کی نجی جائیداد میں شامل ہے۔"

"الملکُ لِلّٰہ ـــ ہم پیدا ہی یہاں گلاب باڑی میں ہوئے تھے۔"

"گلاب باڑی تو فیض آباد میں ہے یار۔"

"یہ سامنے والا قریہ غربا و مساکین بھی اسی اسمِ معطّر کا حامل ہے۔"

دونوں عمارت ساز شامیانے میں واپس آئے۔ تھکے ہارے سے پنکی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بھاٹوں سے کہا۔ "اچھا بھئی اب تم اپنی آلہا سناؤ ـــ"

چیف بھاٹ بقرعیدی اُن حنیف خاں کے فرزندار جمند تھے۔ جو تیس سال قبل رگھبیر پرشاد سنگھ کے گل خانہ چنہٹ پر آئے تھے۔ اس وقت وہ سب خورد سال بجریدی سمیت چھ تھے۔ آج ایک جم غفیر مع اطفال۔ گویا ووٹ بنک اور افلاس میں اضافہ۔

بجریدی خان نے درخواست کی۔ "مائی باپ۔ ہمرے لڑکن کا اینٹا ڈھوئے پر لگا لیجئے۔ آپ کی دعا اور اللہ میاں کے کرم سے سات ٹھو ہمار باکی چاچا اور بھتیجن کے۔ محنت مجوری کرت ہیں۔ لوگن کا ٹی۔ وی۔ چاہی۔ آلہا ناہیں چاہی۔"

وہ سب دُبکے کھڑے رہے۔ چار سامنے آئے۔ کابکی ایکٹروں کے مانند اور دستور قدیم کے مطابق راجہ صاحب تین کٹوری کے سامنے زمیں بوس ہوئے۔

جاپانی سموُرائے اور ہندوستانی سوُرما اپنے پیچھے کیا چھوڑ گئے؟

کروڑپتی اداکار۔

اور فاقہ کش بھاٹ۔

بجریدی خان نے اکڑوں بیٹھ کر ایک سانس میں روانی سے شروع کیا ـــ اُتر گیتے گڑھ سہرا پچ۔ دکھن گیتے شاہ مدار۔ پوروی گیتے نگرا یودھیا جیہہ میں رام لہن اوتار۔

سیاستدانوں نے ایودھیا کو ایک قہرناک مسئلہ بنا دیا۔ یہ بے چارے اسی معصومیت سے اپنی بلند خوانی کے جوہر دکھلا رہے ہیں ـــ

یہ قدیم آلہا کھنڈ اس زمانے کے لیے ہے ہی نہیں۔

وکی میاں پیشانی پر انگلی رکھے سر نیہوڑاتے دھیان سے سُنا کیے۔

اتر گیے گڑھ بہرائچ۔ دکھن گیے شاہ مدار۔"

" پہلے سامع اور قاری غائب ہوتا ہے۔ پھر فنکار کی صنفِ فن۔ جب اسے فیڈ بیک نہیں ملتا تو وہ تلچھٹ پر اتر آتا ہے۔ اور کوڑا کرکٹ پیش کرنے لگتا ہے ـــــ بجریدی کے فن میں ابھی بہت جان باقی ہے۔ لیکن جب تم اپنی اولاد کی شادی بیاہ میں ان کو بلانا چاہو گے شاید یہ بھی کہیں پانی بھرتے لکڑی کاٹتے ملیں۔" مکمل تباہی کی خبرِ بد سنانے والے کسی قدیم عبرانی پیغمبر کی طرح سفید داڑھی ہوا میں لرزی۔

پنکی ہنس پڑے۔" ماموں میاں۔ اتنے پروفِٹ اف ڈُوم نہ بنیے۔ آپ کس قدر قنوطی ہو گئے ہیں۔ اچھا۔ ہم بقر عیدی خاں کو اگلے فیسٹول آف انڈیا میں بھجوانے کا انتظام کرتے ہیں ـــــ واشنگٹن ـــــ"

بقر عیدی اپنے کریر اور مستقبل سے کچھ دیر کے لیے بے فکر اپنی موروثی فنکاری میں ڈوبے ہوئے تھے اور لگاتار بے تکان سناتے جا رہے تھے۔ پچھّم گیے دیوی لا اِیتا۔ ہر ہر بہیں گومتی مائے۔ آ لہا بیٹھے ہیں جمنا پر۔ سنورے رے بھیّا ہمری بات۔ علیؑ علیؑ کرکے سید دوڑِن۔ لے علیؑ مرتضٰی کا نام سیّد حکم لگا دیہن آلہا پر۔ سنورے بھیّا ـــــ

سیّد حکم لگا دیہن آلہا پر سنورے ـــــ

دوسری صبح پنکی اپنے گھر میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے کہ خوش قدم بُوا نے ٹیلی فون لا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ بیحد سراسیمہ ماتھر صاحب دفتر سے بول رہے تھے۔" سر! مندر مسجد والوں نے راتوں رات دو دو فیٹ اونچی دیواریں کھڑی کر لیں۔"

" ان دیواروں پر ـــــ" پنکی نے حکم دیا ـــــ" بُل ڈوزر چلوا دیجئے۔ بستی خالی کروانے سے پہلے۔ اسی وقت۔ فوراً۔"

" ہلو ـــ جی ہاں ـــ ہم سلمہ ہیں۔ تسلیم۔"

" سنو سَلی بٹیا پنکی کدھر ہے؟ ہم نے شہلا کو فون کیا۔ صفیہ کو فون کیا۔ نہ وہ بتاتا نہ یہ بتاتا۔"

" بھیّا لیلٰے باجی کے ساتھ ایرپورٹ گئے ہیں۔ سنیے ـــــ پوری بات تو سُن لیجئے ـــــ مانک کھالا۔ لیلٰے باجی آپ کے ہاں سے صبح ادھر آئیں اسی وقت کلکتہ سے فون آ گیا کہ ان کے چچا میاں کی حالت نازک ہے۔ بھیّا نے ان کو پہلے ہوائی جہاز سے روانہ کر دیا۔ وہ بہت رو رہی تھیں اس لیے میاں ابا، امّی پھوپھی جنیاں، سب ان کو پہنچانے ایرپورٹ گئے ہیں۔ جی ہاں سامان نہیں لیجا سکیں۔ اتنا وقت نہیں تھا۔ اپنے گھر ہی تو جا رہی ہیں آپ کو بہت رِنگ کیا۔ آپ کا فون برابر انگیجڈ ملا۔ اور جہاز چھوٹنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا ـــــ جی ہاں چھوٹی پھپھو اوپر اپنے اسکول میں مصروف ہیں ان کو پتہ نہیں ہوگا۔ مانک کھالا۔ خیریت ہے؟"

" ارے خیریت کہاں نی۔ ادھر پنکی نے دیواروں پر بُل ڈوزر چلوا دیا۔ گوالوں، گھوسیوں نے اپنی گائیں بُل ڈوزر کے سامنے لا کر کھڑی کر دیں۔ سمجھا کیا؟

فلی نے پولیس بلالی۔ بنکی جیسے ہی آوے اس کو بولو۔"

مانک بائی فون بند کر کے حواس باختہ پوجا روم میں پہنچیں۔ "بنام یزداں مہرباں و بخشائندہ" کا زرتشتی ورد کرتی دھم سے چٹائی پر بیٹھ گئیں۔ سامنے طویل شیلف پر حضرت زرتشت، جیزس کرائسٹ، مہاتما بدھ، تمام ہندو دیوی دیوتا اور سائیں بابا آف شیرڈی کی تصاویر رکھی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف کعبہ شریف اور ہند کی مشہور آستانوں کے فوٹوگراف آویزاں تھے۔ اکثر پارسیوں کے مانند مانک بائی خواجہ اجمیریؒ سے خصوصی عقیدت رکھتی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑے اور التجا کی ——— خواجہ صاحبؒ بچہ لوگ کے لیے شانتی راکھو ——— فلی بنکی کے واسطے شانتی راکھو ———

بنکی شامیانے میں بیٹھے ایک پولیس افسر اور ایک وکیل سے بات کرنے میں مصروف تھے۔ دو کانسٹبل مندر، مسجد کے سامنے تعینات کیے جا چکے تھے۔ حد بندی کے اندر گائیں جگالی کر رہی تھیں۔ مختصر شوالے اور مسجد کے چوگرد زعفرانی اور چاند تارے والی سبز جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ "مہا دیو گڑھی بچاؤ ———" "جھانکڑ والی مسجد بچاؤ" کے پوسٹر پھاٹک پر لگا دیئے گئے تھے۔ یہی اشتہار پرانے شہر کی دیواروں پر چسپاں تھے۔

کچھ دیر بعد پولیس افسر اپنی جیپ پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ وکیل صاحب جو بیرسٹر شہلا مرزا کے جونیئر تھے۔ ہائی کورٹ جانے کے لیے اٹھے۔

امریکن کٹ ذرا ڈھیلے سے سوٹ میں ملبوس ایک منحنی اور معمر اجنبی شامیانے میں داخل ہوا۔ "السلام علیکم بنکی میاں ——— پہچانے؟"

"وعلیکم السلام۔" بنکی نے ان کو نگاہ بھر کر دیکھا۔ ندامت سے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"معراج احمد! کچھ یاد آیا؟ آپ چھوٹے سے تھے۔ ہم قنبر مرحوم کے ساتھ وکی میاں سے ملنے آپ کے ہاں آیا کرتے تھے۔"

"جی ——— جی ——— اب یاد آگیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ تشریف رکھیے۔ مگر کیا عجیب اتفاق ہے۔ ریڈ روز کیس کے دوران بادشاہ جانی نے آپ کو گواہی کے لیے بیحد تلاش کروایا۔ ادھر بے چارے ماسٹر موگرا مقدمہ ہارے ادھر آپ موجود ——— کہاں تھے؟"

عجیب اتفاق ہے! معراج احمد چونک پڑے۔ انھیں خیال آیا آتش زدگی کے دوسرے یا تیسرے روز عین اسی جگہ جہاں یہ سُرخ شامیانہ کھڑا ہے۔ گرم راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اپنے ساتھیوں سے انھوں نے کہا تھا ——— سنتے ہیں اتفاقیہ آگ لگی۔ عجیب اتفاقات ہیں بھئی۔ اتفاقیہ یہ دُنیا وجود میں آئی اتفاقیہ زندگی نمودار ہوئی۔ اتفاقیہ ختم ہو جائے گی ———"

"آپ کہاں رہے اتنے عرصے؟" پرویز مرزا کے استفسار پر وہ راکھ کی ٹیکری سے واپس آئے۔

"کیلی فورنیا۔"

"لیکن آپ تو مشہور لفٹ ونگ جرنلسٹ تھے۔ ویزا کیسے مل گیا؟"

"اسے بھی اتفاق ہی سمجھئے۔ اور کیلی فورنیا لبرل اسٹیٹ ہے۔ دراصل اس روح فرسا واقعے کا ایسا گہرا اثر ہمارے دل و دماغ پر تھا کہ ہم یہاں رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ بیوی بچوں کو لے کر چل کھڑے ہوتے۔ کچھ عرصہ انگلینڈ میں گزارا، وہاں سے امریکہ نکل گئے۔ مختلف بھاڑ جھونکے۔ ہمارے لڑکوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنا کاروبار پھیلایا۔ اب بنکی میاں دنیا کی نعمتیں ہمارے پاس ہیں لیکن احاطہ[1] شاہ و بیگم

---

[1] پرانے شہر کا ایک محلہ جس کے ایک حصّے میں قبرستان ہے۔

وہاں کہاں سے لاتے؟ لہٰذا واپس آ گئے۔"

گوالوں، گھوسیوں کی ایک "سیاسی" گائے شامیانے میں آ کر اطمینان سے گھاس چرنے لگی۔ چاند تارے کی کاغذی ہری جھنڈیوں کا ہار زیب گلو تھا۔ گوالوں کی گائے گیندے کی مالا پہنے ماتھے پر تلک لگوائے شامیانے میں داخل ہوئی۔

پنکی نے ہنس کر کہا: "ملاحظہ کیجیے۔ حریفوں نے گویا اپنے سفیر کبیر آپ کے خدمت میں بھیجے ہیں۔ ان کو شاید معلوم ہو گیا ہے کہ آپ امریکن جرنلسٹ ہیں۔"

"ہم اور امریکن جرنلسٹ کہلاتے ہیں! اللہ اکبر۔

خواب و خیال ہو گئیں ساری حکایتیں۔ احمد حسین خان زمانہ بدل گیا!"

انھوں نے آہ بھری۔

پنکی نے ان کے لیے چائے بنائی۔

"جب ہم یہاں سے گئے تھے فصلِ گُل ابھی باقی تھی۔ سُرخ گلاب کچھ کچھ کھلنے لگے تھے۔ اب آئے تو دیکھا چہار سو گیندا ہی گیندا۔ اور کھجور کے اونچے درخت۔"

"جی۔ بلکہ خالص سعودی خرما۔ اور گومتی کے خربوزے زندہ رود کے خربوزوں کا رنگ پکڑ چکے ہیں۔ باقیماندہ گلابوں میں مختلف قلمیں لگ گئیں۔"

"پنکی میاں ہماری لگائی ہوئی گلاب باڑی کو تو گدھے چر گئے۔"

"آپ لوگوں نے کھاد صحیح نہیں ڈالی تھی۔ ورنہ آج چالیس سال بعد یہ اسّی نوّے کروڑ کی آبادی روز بروز مزید کنفیوژن میں غرق نہ ہوتی۔"

"بھڑوں کا چھتّہ محض ہماری غلطیوں کی بدولت تیار نہیں ہوا پنکی میاں ہم جب سے وطن لوٹے ہیں آپ کی اس مقامی صورت حال کو بھی اسٹڈی کر رہے ہیں۔ گوالوں گھوسیوں نے تو شیخ طاہر علی کی اینٹی بٹوا دی۔۔۔" معراج احمد پرانے علیگ تھے۔ "لیکن پنکی میاں آپ نے کُل ٹو وزر چلوانے میں جلدی کی۔"

"وہ ملکی سیاست کے بڑے معاملات تھے قبلہ۔ یہ ایک نہایت لوکل، ایک شخص کی نجی جائیداد پر انکروچمنٹ کا معمولی سا واقعہ ہے۔ رفع دفع ہو جائے گا۔"

"جی نہیں۔ لیڈر رائی کا پربت بنا سکتے ہیں۔ ادھر رام جنم بھومی اور بابری مسجد۔۔۔"

"اوہ نو۔۔۔ نوٹ دَیٹ اگین۔ معراج صاحب اس کے متعلق سنتے سنتے۔۔۔"

"یہ بھی عبادت گاہوں کا معاملہ ہے پنکی میاں۔ زمینوں پر ناجائز قبضے کا آج کل سہل ترین نسخہ۔۔۔ ایک چھوٹا سا مندر یا ایک پتھر پر چونے سے لکھا ہوا کسی پیر کا نام اور چاند تارے کا جھنڈا۔ گویا۔۔۔ ان بزرگ کا چلّہ۔۔۔ رائٹ وِنگ پارٹیاں اس جھگڑے میں پھاند پڑی ہیں۔ فی الحال دونوں میں بڑا ایکتا ہے۔ لیکن کسی لمحے بھی معاملہ کمیونل ٹرن لے سکتا ہے۔"

"یہ لکھنؤ ہے معراج صاحب آپ بھول گئے۔ یہاں کمیونل ٹرن کے باوجود ہندو مسلم فساد نہیں ہوگا۔ آج تک تو کبھی ہوا نہیں۔ یہ لوگ سب۔۔۔ بنیادی طور پر ایک اجتماعی تفریح میں شامل ہیں۔ کون کس کی پتنگ کاٹے۔ بٹیر کی پالی کس کے ہاتھ رہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ ہم تو اس وقت بہت کم سن تھے۔ جب شاید سنہ اکسٹھ میں بڑی بھیا آئی تھی۔ پانی میں گھرے لوگ باگ کنکووں کے ذریعے پیغام رسانی کرنے لگے!

"چند روز قبل ہم نے یہاں کا چکر لگایا۔ چاندنی رات تھی۔ بہت سارے گھوسی منڈیر پر بیٹھے برہا گا رہے تھے۔ مو ہے ناہیں پرواہ۔۔۔ خاتونِ جنتی نیا لگاویں پار۔۔۔ حیدر ساہ بیڑا لگا دیں پار۔۔۔ نبی جی۔۔۔ ان کی اس معصوم عقیدت کا منظر دیکھ کر معراج صاحب، ہمارا تو جی بھر آیا۔ جھونپڑیاں گرا دی گئیں یہ سب بے خانماں ہو جائیں گے۔

یہ ناجائز بستی بسانے والے مقامی غریب کیا اصل وارث نہیں ؟ شاید انہی کے پرکھوں سے قنبر میاں کے جدامجد نے یہ زمین چھینی ہو ۔ وہ اسے واپس کرنے والے تھے ـــــ“ پنکی نے سگریٹ سلگایا۔ ”سنیے جناب والا۔ پہلے یہ علاقہ بانکے شیوخ لکھنؤ کی ملکیت تھا ۔ وہ بانکے کیوں کہلائے ؟ کہ تلوار کے دھنی تھے ۔ او ۔ کے ۔ ان سے برہان الملک نے چھنا ۔ بذریعہ مغل فرمان ۔ اور مغلوں نے اپنی سلطنت کس سے چھینی تھی ؟ لودھیوں سے ۔ انھوں نے سلاطین شرقیہ سے ۔ اور حضور والا ان سے قبل ـــــ تغلق، خلجی وغیرہ وغیرہ وغیرہ اور ان سے پہلے پرتھوی راج آلہا اودل سے لڑتے تھے اور سارے راجپوت مار کاٹ چھینا جھپٹی میں جُٹے تھے ۔ انھوں نے کمزور گپتاؤں کو بھگایا ۔ انھوں نے موریوں کو ۔ اور ان سے پہلے ـــــ“

معراج احمد نے گویا امان پانے کے لیے ہاتھ اونچے کیے ۔

” ایک بات سُنیے ـــــ ! ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو ہندوستان کی انٹیلجنسیا کہلاتے ہیں ۔ اصول پرستی اور ذہنی دیانت داری کے مدعی ۔ اخباروں میں احتجاجی خط لکھتے ہیں ۔ سیمناروں میں پیپر پڑھتے ہیں لیکن عملاً اسی نظام کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں ۔ بلکہ کل پُرزے ۔

” ہم چونکہ شیروُوڈ اور کولمبیا وغیرہ میں پڑھے ۔ لفٹسٹ وچار دھارا میں نہیں کُودے ۔ لیکن دائیں کنارے پر بھی نہیں پہنچے ۔ منجدھار میں ڈُبکیاں لگا رہے ہیں ۔ فی الحال تو YUPPIE ہیں گو PUPPIES سے مقابلہ نہیں کرسکتے ۔“

” اور میاں یہ یپی کون ہیں ؟“

” پنجابی اَپ ورڈلی پروگریسو پروفیشنل ۔ آپ پچیس برس بعد وطن لوٹے ہیں ۔ یہاں منظر نامہ یکسر بدل چکا ہے جب ریڈ روز میں آگ لگی سیاسی مافیا اور شہری دہشت گردی کا آغاز نہیں ہوا تھا ۔ آج کل کا زمانہ ہوتا تو یہ افواہ پھیلتی کہ قنبر علی

کو چند سنسنی خیز اور خوفناک اور عالمگیر اہمیت کے سیاسی راز معلوم ہوگئے تھے ۔ جو انھوں نے اپنے تینوں پرچوں میں شائع کردیئے ـــــ وہ پرچے چھاپہ خانے سے آگئے تھے اور اول وقت نیوز اسٹینڈز پر پہنچنے والے تھے ۔ چنانچہ راتوں رات مخالفین نے ایک برقعہ پوش ایجنٹ کے ذریعے ٹائم بم رکھوا دیا ۔ وہ پراسرار نقاب پوش شام کے پونے چھ بجے ندی کے پُل پر قنبر میاں کے ساتھ آتی دیکھی گئی تھی ـــــ مزید برآں وہ راز آپ ہی نے ـــــ یعنی مسٹر معراج احمد چیف رپورٹر ریڈ روز نے حاصل کیے تھے ۔ لہٰذا آپ جلد از جلد یہ ملک چھوڑ کر سمندر پار جا بسیے !“

” سبوتاژ کا شبہ ظاہر تو کیا گیا تھا ۔ مگر متفقہ فیصلہ تھا کہ اتفاقیہ ـــــ قنبر علی بے چارے کے کوئی دشمن ہی نہیں تھے وہ تو اتنے مرنجان مرنج آدمی تھے کہ اپنی بی بی ہی سے پٹا کرتے تھے ۔ اچھا وہ بے چاری برقعہ پوش تھی کون ؟ بعد میں کچھ پتہ چلا ؟“

” چاندنی باجی ۔ ان کا المناک قصہ سُن کر آپ کیا کیجیے گا ۔ اس وقت بھی جب اخباروں میں ’ ایک مہمان خاتون ‘ چھپا تو ہمارے گھر والے بوجوہ خاموش رہے ۔ ہم اسکول سے لوٹے تو پتہ چلا چاندنی باجی چلی گئیں ۔ ان کو قنبر علی یہاں لے آئے تھے ۔“

” یہاں ؟ یہاں تو ویرانہ ہے ۔“ معراج احمد نے چونک کر کہا ۔ پنکی نے فکرمندی سے ان پر نظر ڈالی ۔ جھینپ کر بولے ۔ ” معاف کرنا پنکی میاں ہم ذرا ڈِس اوریئنٹڈ ہو رہے ہیں ۔“

” معراج صاحب ۔ بڑے ماموں بتلاتے ہیں کہ قنبر میاں ایک سچّے کلاسیکل آئیڈیلسٹ تھے ۔ اپنے آدرشوں کی خاطر سارا ذاتی سرمایہ الیکشن اور رسالوں میں ختم کر بیٹھے پھر بھی ہمت نہ ہاری ۔ ایسے لوگ اب بالکل نظر نہیں آتے ۔ ایک روز وکی ماموں ہم سے کہہ رہے تھے کہ ساری دنیا میں

ہر سمت اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہیں۔ چند سر پھرے یاجوج ماجوج کی طرح مستقل مزاجی کے ساتھ ان دیواروں کو چاٹتے رہتے ہیں لیکن وہ اور اونچی ہوتی جا رہی ہیں۔

"وکی ماموں خود ان سر پھروں میں شامل ہیں۔ قنبر علی بھی ان ہی میں سے تھے۔ ہمارے ماموں بے چارے اپنے آئوری ٹاور ہی میں بیٹھے رہ گئے۔ قنبر میاں نے اس کم عمری ہی میں بہت کچھ کرنے کی کوشش تو کی۔ کاش ——— یہ احاطہ جب ہی رفاہِ عام کے لیے وقف کر دیا ہوتا۔ اتنی مہلت نہ ملی۔

"یہ بھی وقت کی ستم ظریفی ہے کہ ان کی زمین پر سے غریبوں کو بیدخل کر کے ایک سرمایہ دار کا اپارٹمنٹ ہاؤس تعمیر ہوگا۔ دس دس لاکھ کے چالیس فلیٹ۔ اور سب ابھی سے بک گئے!"

"ہاں!" معراج صاحب پھر چونکے۔ "لوگوں کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آگیا ہے؟" خاموش ہو گئے۔

"تو ہم کہہ رہے تھے کہ یہ آگ کا حادثہ آج کل کے دور میں ہوا ہوتا تو بڑا ہولناک منظر نامہ اس کی وجوہ کے متعلق تیار ہو جاتا۔ مگر نہرو ایرا تھا، 'استعفیٰ شانتی پور وک تھی'! کمیونل فسادات بھی اتنے نہیں ہوتے تھے۔"

"ہاں یہ کیا بات تھی؟ ——— سوری ہم ذرا ڈِس اورینٹڈ ———"

رینی نے سگریٹ پیش کیا۔ انھوں نے انکار ———

"معراج صاحب آپ کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

"نہایت عمدہ۔ اللہ کا شکر ہے ——— کل شام ہم آپ کے ہاں گئے تھے۔ دیر تک بارہ دری میں وکی میاں کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ ہمیشہ کے پروگریسو آدمی ہیں۔ مگر آپ کے چھوٹے ماموں نے اُڑا دی تھی کہ جاگیر کے خاتمے نے سودائی بنا دیا۔ ان کی حالت دراصل نئی بے ضمیری نے غیر کی تھی۔ کل شام کہہ رہے تھے راہ مفاہمت پر چلنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں۔ ہمارے

لیے اب لامحالہ ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔ اور وہ عیش باغ کی سمت جاتا ہے۔"

"معراج صاحب آپ سینیر لوگ ایسی منفی باتیں کیوں کرنے لگے ہیں؟ احاطہ ستارہ بیگم۔ عیش باغ! مولوی انوار کا باغ!"

"اور کیا کریں؟ ہم نے ہی کیا کدّو میں تیر مار لیے۔ وسیٹ کو بُرا کہا اور وہیں گئے۔ اپنے لڑکوں کو ہم نے بھی امریکہ ہی میں بسایا!"

ماتھر صاحب مع ایک وکیل آتے دکھلائی دیئے۔

"اس زمین کے وبال کھاتے نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے بابا نیم چمیلی نے دھرتی پہ رہنا ہی چھوڑ دیا۔ پچاس سال سے برگد کی شاخ پر مقیم ہیں!"

"بالا گنج والے یوگی؟ ابھی زندہ ہیں؟"

"جی ہاں مسز ڈھونڈی پابندی سے ان کے درشن کو جاتی ہیں۔ ایک دفعہ ہمیں کھینچ کر لے گئیں۔ ہم سے کہنے لگے بچہ سورہ مُزمّل پڑھا کرو۔ ہم حیران کہ ان کو سورہ مُزمّل کیسے معلوم ———"

"سنا ہے وہ مہلک امراض کا راکھ کی چٹکی سے علاج کر دیتے ہیں۔"

رینی نے تعجب سے معراج احمد کو دیکھا۔

قصرِ شیریں۔ بریکفاسٹ رُوم۔

"ادھر دیکھو فلّی۔ مسٹر ٹائر بھائی ہاتھی والا اتنا بڑا سیٹھ ہے جنگل۔ ایلیفینٹ۔ مگر اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اس کو ایلیفینٹ اینڈ کاسل[1] بھی ہونا۔"

---

[1] لندن کا ایک ریلوے اسٹیشن

"واہ ـــــ واہ ـــــ ممی تمھارے وِٹ اینڈ ہیومر کا جواب نہیں"۔
"غریب پیٹی ماسٹر سے جیتا تو کیا جیتا۔ اپنی ٹکر کے آدمی کو ہراتا تو بات تھی"۔

"ممی۔ ہاتھ آئی جائیداد کوئی آسانی سے نہیں جانے دیتا۔ اچھا تم ایک کام کرو دل بہار بوا نے گرینی کی اتنی خدمت کی۔ ساری عمر انھوں نے ہم لوگوں کی سیوا میں گذار دی۔ اس کے عوض تم ان کو وہ سرونٹ کوارٹر بخش دو۔ جس میں وہ ـــــ کتنے سال سے مہناز ـــــ ؟ پینتالیس[۴۵] سال سے رہ رہی ہیں۔ ان کے ناتی پوتے تم کو دعا دیں گے"۔

"تمہارا گرینی ایسا بولتا تو بر و بر"۔

"کیا پتہ انھوں نے اپنی وِل میں لکھدیا ہو اور تم نے وہ کاغذ چھپا دیا!"

"توبہ۔ توبہ۔ فلی بوائے ـــــ دستور زادی کے لیے ایسا بات بولتا؟ اور سنو۔ اگر ہمارے ڈِل میں آگیا تو ہم الکا سرونٹ کوارٹر ان کو بخش جائے گا جب تم شیرین ٹاور کو فی بوڈل کے موتیف سے سجاؤ گے وہ گنتا پری والا ہوٹل کہلائے گا۔ فرینچ اسٹائل۔ فائیو اسٹار۔ ہم آسمان سے دیکھ دیکھ کر خوش۔ ابھی چینوٹ کے راستے ہی میں ہوں گی ادھر بل ڈوزر آجائیں گے۔ خیر۔ بٹ پر ومِس بُوا کے ٹبّر کو ایجکٹ مت کرنا"۔

"ارے ممی ہم تو مذاق کر رہے تھے"۔

"ہمارے سنگ مسخری کرتا ـــــ فرامروز ڈھونڈی"؟

لے دینِ زرتشت کا پل صراط جس پر اس قدیم عقیدے کے مطابق متوفی کی روح موت کے تیسرے دن پہونچتی ہے۔ نیک بندوں کے لیے ایک خوشگوار گزرگاہ جس کے سرے پر فردوس ہے۔ گنہ گاروں کے لیے تلوار کی دھار سے زیادہ تیز وہ اس پر چلتے ہوئے نیچے دوزخ میں گرتے جاتے ہیں۔

تین کٹوری ہاؤس۔ بارہ دری۔

"لیلیٰ تم نے کلکتے میں دیر لگا دی۔ اور آ کر بھی کیا کر لیتیں۔ ان لوگوں نے عدالت سے حکم امتناعی STAY ORDER حاصل کر لیا ہے۔ ہماری تعمیرات معطّل۔ شیعہ سُنّی جھگڑا دبنے کے بعد سے بہت سے لیڈر بے کار بیٹھے تھے وہ کام سے لگ گئے ـــــ 'مہادیو گڑھی' الگ ایک ایشو بن گئی ہے۔ روزانہ پوسٹر اور اخباری بیانات۔ عدالت سے یہ ساری زمین حاصل کر کے اس پر برج دھام گئو شالہ بنے گا اور انٹرنیشنل ویدک سینٹر۔ ایک روز وہاں چند گورے سنیاسی بھی اپنے کتابچے تقسیم کرتے نظر آئے۔ مسجد والے ایریا میں بین الاقوامی عربی مدرسہ کی تعمیر کا اعلان ہو چکا ہے۔ ایران اور عراق کی حمایت میں الگ الگ جلسے وہیں ہونے لگے ہیں۔ مندر کے لیے اطلاع دی گئی ہے کہ یہ دیواستھان یہاں لاکھوں برس سے موجود ہے"۔

"لاکھوں برس پہلے تو یہاں سمندر تھا"۔ لیلیٰ نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن ندی سے نکال کر وہ گول پتھر اس پیپل کی کھوہ میں کب رکھا گیا ـــــ ؟ ادھر مسجد والے لیڈر کہہ رہے ہیں کہ شیخ اظہر علی و طاہر علی کے پردادا نے یہ زمین زبردستی حاصل کر لی تھی۔ دراصل یہ ساری اراضی حکمرانِ وقت نے اسی مسجد کے لیے وقف کی تھی اور یہاں ایک سرائے بھی تھی"۔

"تو سُنّی وقف بورڈ سے اس کی دستاویزیں نکلوائیں۔ ڈیڈی بتلا رہے تھے پہلے یہ دستور تھا کہ صاحبِ حیثیت لوگ اپنا مکان بنوانے سے قبل اس کے احاطے میں مسجد ضرور تعمیر کرواتے تھے"۔

"لیکن تمھارے کون سے پُرکھے نے یہ مسجد اور کنواں بنوایا؟ اب اپنی یہ کیس لڑیں گی۔ مندر مسجد کمیٹی نے چندہ کر کے ایک بڑا وکیل کھڑا کیا ہے"۔

"شیوجی کے سمبل کی کاربن ڈیٹنگ نہیں ہو سکتی ؟"

"ندی کی تہہ سے نکلا ہوا پتھر جیولوجیکل ٹائم سے تعلق رکھتا ہے ۔ اور ساری دیومالا جیولوجیکل ٹائم پر مبنی ہے ۔ مسجد لکھوری اینٹوں کی ہے ۔ صریحاً اٹھارہویں صدی اور غالباً ۱۸۵۷ء سے قبل ___ عہدِ شیخ زادگان ۔ تمہارے پرکھے بھی تو شاید شیوخ لکھنؤ کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ۔"

"اچھا وہ ۔ ڈیڈی بتلا رہے تھے کہ ان کے بزرگ قلعہ مچھی بھون کی تباہی کے بعد کرسی میں جا بسے تھے ۔ پنکی میں یہاں بلڈنگ کنسٹرکشن کے لیے آئی تھی نہ کہ تاریخ کے گڑے مردے اکھیڑنے ___ ڈیڈی ایک تو چچا میاں کی رحلت سے اس قدر غمگین ہیں اوپر سے یہ ناگہانی آفت ۔"

"فکر نہ کرو ۔ وکی ماموں کو ہم نے عہدِ شیخ زادگان کی ریسرچ پر لگا دیا ہے وہ کچھ نہ کچھ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے ۔"

ان دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا ۔ سامنے کتب خانے کا دریچہ روشن تھا ۔

"اور سنو لیلے ! کسی سے کہنا نہیں کہ تم دراصل کرسی کی رہنے والی ہو ۔ وہ قصبہ اپنے بیوقوفوں کی وجہ سے مشہور ہے ۔ حمق آباد ۔"

"ڈیڈی نے کہا ہے تمام خاندانی کاغذات اظہر علی چچا کی تحویل میں تھے ۔ وہ جل گئے ۔ ان کے پاس نسب نامہ ہی ہے جو استاد موگرے کے خلاف اپنا حق وراثت ثابت کرنے کے لیے کورٹ میں پیش کیا تھا ۔ اس میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ مسجد وغیرہ کون سے بزرگ نے بنوائی تھی ۔"

"تمہارے والد کی طبیعت کیسی ہے ؟"

"اچھی نہیں ۔ چچا میاں اور ان کے مصائب یاد کر کے رویا کرتے ہیں ۔ بے حد رقیق القلب ہو گئے ہیں ۔ چچا میاں کو ستون سے باندھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی بیوی اور بیٹوں کو گولی مار دی تھی ۔ دونوں جوان لڑکیوں کو اٹھا لے گئے

فریدہ اور فرحانہ ۔ ان کا آج تک سراغ نہ ملا ۔ چچا میاں کو اسی غم نے گھلا گھلا کر مار ڈالا ۔ پندرہ سال پورے پندرہ سال وہ اس کرب میں جیے ۔ رات کو سوتے سوتے فریدہ فرحانہ چلا اٹھتے ۔ کہا کرتے تھے جس طرح رزق کے دانے دانے پر مہر ہے آج کل بندوقوں کی گولی گولی پر خلقِ خدا کا نام لکھا ہے ۔"

شور مچاتی چڑیاں درختوں کی طرف آ رہی تھیں ۔

"وکی ماموں کہتے ہیں پرندوں میں بھی پیغمبر آتے ہوں گے ۔"

"انھیں پیغمبروں کی ضرورت نہیں ۔" لیلے نے پلکوں پر انگلیاں پھیریں ۔

"میں جنگلوں میں بہت رہی ہوں ۔"

"جب ہم کارلٹن میں تم سے پہلی بار ملے تمہیں ایک سخت مزاج خاتون سمجھے تھے ۔ سنو ۔ تمہارے ہاں ساون کی چنریاں دیکھ کر اس مرتبہ کہہ رہی تھیں کہ ہماری ایکسپرٹ خوش قدم بوا سونا کلی وغیرہ سے رنگوا کر غیر مقیم انڈین پاکستانیوں کے لیے ایکسپورٹ کرو گی ۔ اور چٹاپٹی کی رضائیاں ۔ غرارے ۔ حیدرآبادی رامپوری بھوپالی گھٹنے ___ لیلے آبوتیک ___ بمبئی ۔ دلی ۔ لندن ۔ ٹورانٹو ___"

"جہنم میں جائے لیلے بوتیک ۔ پنکی میرا مذاق مت اڑاؤ ۔"

صفیہ سلطان مکان سے برآمد ہوئیں ۔ ٹہلتی ہوئی بارہ دری تک پہنچیں ۔ لیلے فوراً اٹھی ۔ منہ دھونے کی غرض سے اندر گئی ۔

"ویسے تو یہ بڑی کرّی ہیں ۔ میرے کنڈرگارٹن کے زمین کے دام میں ایک نیا پیسہ کم کرنے کو تیار نہیں ہوتیں ۔ اس وقت کیوں منہ تھتھائے بیٹھی تھیں ؟ کہیں گھاٹا ہو گیا ؟"

"چھوٹی خالہ ۔ چچا کا غم تازہ ہے ۔ ان کا چالیسواں بھی نہیں ہوا اور اس نئے جھگڑے کے چکر میں ان کو پھر یہاں آنا پڑا ۔"

"ہاں نقصان تو بہت ہوا۔ دونوں بھائی مل کر اُدھر کے ہاتھی اِدھر کرتے ہوں گے اِدھر کے اُدھر۔ مانک بائی انھیں کیا پکارتی ہیں۔ مسٹر ٹائر بھائی ہیں بھی ڈنلپ۔ بھائی کی موت سے ہوا نکل گئی۔ خفیہ ہاتھی اور نیپال بارڈر سے حشیش۔ بڑا سخت خسارہ ہوا بے چاری کا۔ ورنہ بچا کی موت پر کوئی یوں نہیں روتا۔ بوڑی مریں گے تو وِکی کی اولاد اس طرح سوگ منائے گی؟"

"چھوٹی خالہ — پلیز — آپ تمام عالم سے بدگمان ہیں۔"

وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "میں اسی وجہ سے تم لوگوں کی محفلوں میں نہیں بیٹھتی — باقی یہ کہ وہ زمین ہی منحوس ہے۔ اس کا خیال چھوڑ دو۔ جس روز تم نے اس پر کام شروع کروایا اس کے پورے پندرہ دن قبل آواز نے بار بار کہہ دیا تھا — منع کر رہے ہیں۔ تو وہی ہوا۔ اتنی بڑی اڑچن پڑ گئی — الٹی کا پلوا ہو گیا۔"

وہ سیڑھیاں اتر کر پائیں باغ میں چلی گئیں۔ پنکی نے سگریٹ جلایا۔

لیلے واپس آئیں۔

پنکی نے حیرت سے سوچا — اس نصف بنگالی لڑکی کی شخصیت میں فیروزہ کی کتنی جھلک ہے! ماحول اور پس منظر کے فرق کے باوجود — ! دونوں تھوڑی سی باغی اور خود رائے۔ جدید مشرقی خواتین!! لیکن ان کی اس خود اعتمادی میں ان کی کلاس اور مغربی تعلیم کا کتنا دخل ہے؟

صفیہ روش پر جا رہی تھیں۔ ہوا نے پلو اُڑایا۔ فوراً بازو پر دوبارہ لپیٹ کر بسرعت آگے بڑھیں۔

"ارے — !" لیلے کے منہ سے نکلا۔

"کبھی ظاہر نہ کرنا۔ وہ بیحد حساس ہیں۔"

"اب میں شاید ان کو سمجھ سکتی ہوں۔"

"یہ معذوری ان کا پروبلم نہیں۔"

"پھر —؟"

"لٹل سرایکو۔"

"وہ کون ہیں؟"

"لٹل سرایکو۔ ساکن ریڈ روز۔ یہ ایک غیر حاضر کا غیر موجود پتہ ہے جو عالم مثال میں موجود ہے!"

"پنکی۔ تم بھی دیوانے ہو۔ کہے دیتی ہوں تمہارے متعلق مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑے گی!"

"ارے رے نہیں بھئی۔ یہ غضب نہ کرنا۔"

"کیا تم لوگ سیدھے سبھاؤ بات ہی نہیں کر سکتے سوائے معموں کے؟ میں کیوں ایک ابنارمل خاندان میں شامل ہوں —؟" وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

"کم آون لیلے!"

"انھوں نے آج تک مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ اس روز میں شہلا آپا سے کہہ رہی تھی کیا تمہاری خالہ کا ایگو اتنا بڑا ہے کہ یہ لوگوں سے بولتی ہی نہیں۔ شاید میرا ریمارک بھی سُن لیا۔ تب سے اور اینٹھ گئیں — میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟"

"لیلے — پلیز۔"

"مجھے ان کا معاملہ بتاؤ۔ شاید میں ان کے لیے کچھ کر سکوں۔ تم جانتے ہو میں جنگلیوں قبائلیوں سے بھی سروکار رکھتی ہوں اور بزنس مینجمنٹ میں ہر قسم کے انسانوں سے برتاؤ کرنا سیکھ چکی ہوں۔" سبک رومال میں ناک سُنکی — "اسٹین فرڈ میں۔"

پنکی مسکرائے۔

"ہنسو مت۔"

"او۔ کے — پہلے یہ بتاؤ۔ ٹھیکرے کی مانگ جانتی ہو؟ بنگال میں ہوتی ہے؟"

"معلوم نہیں۔"

"قنبر میاں کی دادی نے ٹھیکرے میں اشرفی ——"

"ایک اور پہیلی ؟"

"ارے یار۔ پیدائشی منگنی۔ پردہ نشین بیگمات کے لیے تفریحات محدود تھیں۔ سوا ریت رسموں کے۔ چنانچہ قنبر میاں کی دادی اور ہماری پرنانی مرتے دم تک رسمیں ادا کرتی رہیں۔ وہ دونوں دنیا سے رخصت ہوئیں اور تیرہ سال کی تھیں جب صفیہ خالہ کو پولیو ہو گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ٹریجک ہیروئن سمجھنے لگیں کیونکہ اس طرف سے خاموشی سی اختیار کر لی گئی۔

ہمارے نانا نانی کا خیال تھا بیرسٹر اور بیگم علی پولیو کے نقص کے باوجود وضعداری نبھائیں گے۔ غالباً وہ ایسا کرتے لیکن بونی ماموں کی پہلی شادی کے موقعہ پر ہمارے لالہ کالی چرن ان کے منشی بھوانی شنکر سے ملے۔ گول گول الفاظ میں پوچھا۔ انھوں نے بھی مبہم جواب دیا کہ بھیّا نہیں مانتے۔ منع کر رہے ہیں۔ لالہ نے آن کر نانی اماں کو اطلاع دی۔

"منع کر رہے ہیں —— یہ جملہ صفیہ خالہ تک پہونچ گیا۔ بولیں۔ ہم لُولے بھی تو ہیں۔ اپنا کمرہ بند کر کے پہروں روئیں۔ اس روز کے بعد سے سب سے بے تعلق سی ہو گئیں۔ گھر والے ان سے نادم تھے۔ ان کو مزید خجالت سے بچانے کے لیے دن رات پڑھائی میں جٹ گئیں۔ مار ایک کے بعد ایک ایم۔ اے۔ اور ڈاکٹریٹ اور رجانے کیا کیا۔

" اکثر قصباتی گھروں میں یہی نقشہ تھا۔ زمینداروں کے نونہال نوعمری میں منسوب کر دیے جاتے تھے یا منکوح —— اس کے بعد وہ یونیورسٹیوں میں پہنچ کر اشتراکی دانشوری اختیار کر لیتے تھے۔ اور اپنے گھروں کے قدامت پرست ماحول سے نکل بھاگتے تھے۔"

"ہاں۔ میں نے سنا ہے ہمارے ہاں بنگال میں بھی ایسا بہت ہوا۔"

"پھر یہ لوگ یا غیر روایتی قسم کی شادیاں کر لیتے تھے یا رومینٹک انقلابی بنے گھوما کرتے تھے۔

"قنبر میاں کا کنبہ دقیانوسی نہیں تھا۔ یعنی تم لوگ۔ انکے والدین پروفیشنل کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ماں باپ دونوں روشن خیال۔ وہ بیٹے کی زبردستی شادی نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان کو اس کا احساس بھی تھا کہ بے چاری صفیہ سلطان کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ جس کی اصل ذمے دار ان کی دادی اور ہماری پرنانی تھیں بے چاریاں —— اور قنبر میاں نے اسی انسانی دردمندی ہی کے ناتے ماں باپ کی وفات کے بعد ایک میراثی کی لڑکی پلّے باندھ لی۔ اور صفیہ خالہ کے سلسلے میں مزید ستم یہ ہوا کہ قنبر میاں مرحوم کے ذہن میں جو ناکارہ نک چڑھی امیرزادی کا ایمیج موجود تھا وہ سنا ہے ہمیشہ طنزیہ انداز میں تذکرہ کرتے تھے۔

"حالانکہ درحقیقت —— بے چاری چھوٹی خالہ نے اپنے اپاہج پن کے باوجود اپنے حساب ایک کریر وُومن۔ بن دکھایا۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ سارا انھوں نے ایک ہاتھ سے ٹائپ کیا۔ اسکول چلاتی ہیں۔ بالکل انڈپنڈنٹ اور ایفی شنٹ۔"

" مجھے ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کرنا پڑے گی۔"

"معاملات سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہمیں اپنی رائے بدلنی چاہیئے۔ لیکن عموماً ہم ایسا کرتے نہیں۔ کیونکہ اس طرح ہم اپنے نظریات غلط ثابت ہونے کی توہین برداشت کرنا نہیں چاہتے ——"

"شوتیہ ہے، چھوٹے گروجی ——!"

"بڑے ماموں نے ان کی بہت دلجوئی کرنا چاہی اور دوستی۔ لیکن وہ

لوگوں سے رابطہ توڑ چکی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک روز اچانک ــــ لٹل سرایکو ــــ
نمودار ہو گئے ــــ"

"کوئی انگریز ــــ؟"

پھر فیروزہ ــــ! وہی تمام دانشمندی کے باوجود اچانک بھولپن کے سوال۔

"ہاں بنکی بتلاؤ نا ــــ چپ کیوں ہو گئے؟ آگے چلونا۔ ایم۔سی۔سی۔ کا
کوئی ٹھنگنا انگریز کھلاڑی رہا ہوگا جو یہاں ٹیم کے ساتھ آیا ہوگا ــــ دیکھو میں
نے کیسا بوجھا ــــ کرُسی کی ہونے کے باوجود ــــ!!"

"جب ہماری پروین خالہ ازابلا تھوبرن کالج میں پڑھتی تھیں ــــ ایک مشہور
امریکن سینما اسٹار تھی ــــ جوڈی گارلینڈ ــــ"

"اچھا ــــ"

"اس کا ایک گیت بہت مقبول ہوا تھا۔

LITTLE SIR ECHO, HOW DO YOU DO! HELLO, HELLO!
LITTLE SIR ECHO, COME DANCE WITH ME,
HELLO, HELLO!!

"اچھا ــــ اوہ ــــ آئی سی۔"

"قنبر میاں کی سنسنی خیز شادی کے بعد سرایکو پہلی بار سنائی دیے۔ مگر خالہ
نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ریڈ وروز کی آگ کے بعد وہ زور شور سے ظاہر ہو گئے۔ ایک
دن ہم صبح کو سو کر اٹھے تو گھر میں سناٹا۔ معلوم ہوا چند روز سے چھوٹی خالہ نہایت
منفی قسم کی پیشین گوئیاں کرنے لگی ہیں اور وہ اتفاق سے صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔
گزشتہ رات انھوں نے اعلان کیا تھا کہ کل تیسرے پہر تک یہاں سے ایک جنازہ
نکلے گا۔ اور شام کو لوڈن کی ماں بے چاری چل بسیں۔ اب سب لوگ صفیہ خالہ
سے سہمے سہمے پھر رہے تھے۔

"بتاشن بوا بولیں ــــ سایہ ہے ــــ اوجھے سیانے بلوائیں۔ انھیں
امی نے جھاڑا۔ اسی دوران پروین خالہ چار روز کے لیے آن پہونچیں ــــ قاہرہ
سے آئی تھیں اور ٹوکیو جا رہی تھیں۔ تبھی انھوں نے صفیہ خالہ کی اس پُراسرار آواز
کا نام لٹل سرایکو رکھ دیا۔ جو نہایت موزوں تھا اور صحیح ــــ

"وکی ماموں نے حسب عادت فلسفیانہ تبصرہ کیا۔ ہم سب اہل مشرق لٹل سرایکو
کے جال میں گرفتار ہیں۔"

"مسز ڈھونڈی نے کوئی رائے نہ دی؟"

"ان دنوں وہ چاندنی بیگم کی ٹریجڈی کی وجہ سے بیحد ناراض تھیں اور ملنا
جلنا ترک کر رکھا تھا۔

"نیورولوجسٹ نے بتلایا۔ شدید صدمات کے اثر سے ان کے دماغ کے
وہ اعصاب جن کا تعلق براہ راست سماعت سے ہے۔ وہ متاثر ہو گئے ہیں
اور اس وجہ سے جب بھی ان اعصاب پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے ان کے تحت الشعور
میں پوشیدہ خیالات کان کے نقص کی وجہ سے ان کو سنائی دینے لگتے ہیں۔

"نانا میاں کے ایک کارندے پنڈت درگا پرشاد نے جین فلسفے کی قسم کی
بات کہی ــــ بٹیا کے چِت کے بارے میں جو کچھ جو سوچتا ہے وہ بھی صحیح ہے!!

"ڈاکٹر نے جو دوائیں ان کو دیں وہ انھوں نے اس ڈر کے مارے نہ کھائیں
کہ کہیں الٹا اثر نہ کریں ــــ ہم لولے تو ہیں، آپ لوگ چاہتے ہیں بہرے بھی
ہو جائیں۔ اہل دنیا پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا تھا ــــ (پھر انھوں نے کنجوسی پر
کمر باندھ لی) کالی چرن اور نانی اماں نے ساز باز کر کے ایک عامل بلوا ہی لیا۔
اب بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ بتاشن بوا نے ان سے کہا۔ انھوں نے
ڈانٹ کر بھگا دیا۔ چنانچہ وہ بڑے میاں شاگرد پیشے کی ایک خالی کوٹھری میں
بیٹھے ــــ تماشا دیکھنے ہم بھی پہونچے۔ وہ کچھ سلگا کر ہل ہل کر کچھ کچھ پڑھ رہے تھے
ــــ لوہ بن دھار بن دھار باندھوں ــــ کیا گرایا۔ بھجا بھجایا باندھوں ــــ

دم دم زندہ شاہ مدارؒ —— ہمیں یہ نظارہ بہت بھایا۔ کھیلتے کودتے مکان میں واپس آتے اور چلاتے پھرتے کیا کرایا بھیجا بھجایا باندھوں دم دم زندہ شاہ مدارؒ ——

"امی گیلری میں آرہی تھیں انھوں نے پکڑ کر ایک چھانپڑ رسید کیا۔ ہم لڑکپن میں بے انتہا شرارتی تھے۔

" —— اب لٹل سرایکو مدتوں غائب رہتے ہیں پھر دفعتاً سنائی دے جاتے ہیں۔ ہمیں خالہ کے چہرے کی دہشت سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگی رہتی ہیں۔"

"ہاؤ ڈریڈ فل —— لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے قنبر چچا کو اپنے اعصاب پر اتنا مسلط کیوں کیا؟ منگنیاں ٹوٹتی ہی رہتی ہیں۔"

"بچپن کی نسبت کا رومانس! بوڑھی مامائیں بتلایا کرتی ہیں کس طرح تیج تہوار پر قنبر میاں کے ہاں سے سینیاں اٹھائے خادموں کی قطاریں وارد ہوتی تھیں۔ کھلونے۔ مٹھائیاں۔ جوڑے۔ تحفے تحائف۔ گانا بجانا۔ یہاں سے اسی طرح اُدھر —— سیانی ہوئیں تو قنبر میاں پار بسنے والے ہیرو نہ بنتے؟

"رومینٹک انگریزی ناولوں اور رومینٹک فلموں کے دور میں پروان چڑھی تھیں —— تم اور ہم تو CYNICISM کے پروردہ ہیں ہماری زندگیوں سے رومانس کب کا رخصت ہو چکا۔"

"جان لیوا رومانس تھا بھئی۔"

"ارے ہماری پروین خالہ تو سنا ہے جب کالج میں پڑھتی تھیں اسی بارہ دری میں اپنی سہیلیوں کو بلا کر دلیپ کمار کی سالگرہ منائی تھیں۔"

"واقعی ——؟" لیلے نے قہقہہ لگایا۔

"وہ بڑی معصوم جنریشن تھی اور ہمیں قنبر میاں تھوڑے سے یاد ہیں۔ دُبلے، پتلے، دبُّو سے، ہکلاتے بھی تھے۔ لیکن سُنا ہے ایک انقلابی دانشور کا

ہالہ اپنے گرد رکھتے تھے۔ لڑکیوں میں بہت مقبول تھے۔

"مزید برآں۔ چاندنی بیگم کے متعلق احساس جرم بھی شاید خالہ کو بہت ستاتا ہے۔ کم از کم انہیں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوتا تو وہ اس کس مپرسی کے عالم میں ریڈ روز نہ جاتیں جہاں اسی رات ——"

"تمہارے باقی گھر والوں کو یہ احساس جرم نہیں ——؟"

"سوائے وکی ماموں کے شاید کسی کو نہیں۔ دراصل یہ موضوع ہمارے ہاں ان کہے طور پر ممنوع ہے۔ وکی ماموں کو تو مہینوں چُپ لگی رہی اسی وجہ سے نانی نے ان کی شادی آتو صاحب کی نواسی سے طے کر دی۔ ایک میکینکل گڈّے کی طرح انھوں نے خاموشی سے اس کے لیے حامی بھر لی۔

"نانی، امی، پروین خالہ یہ بیگمات جان بوجھ کر ظالم یا بے رحم نہیں تھیں۔ محض بے حس اور بے پرواہ اور اپنے آپ میں مگن۔ ورنہ صدیوں تلک ان کے طبقے کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ بھوکے ننگے کسانوں کی محنت پر انہیں عیش کرنے کا کیا حق ہے؟ اور ہمارے نانا میاں کو محل خانے کے معاملات کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ نہ پرواہ۔ میگی ممانی کے ساتھ بھی یہی ہوا ——"

"رنجی ——" لیلے نے ذرا توقف کے بعد پوچھا: "صفیہ خالہ کی آواز غیب داں کیسے ہے؟ میری امی تو یقیناً کہیں کوئی جن وِن ہوگا۔"

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ندی پر تیرتا کہرہ باغ کی سمت بڑھا۔

"ڈونٹ بی سِلی۔ وکی ماموں بتلاتے ہیں، ایک روز انھوں نے اپنے منشی پنڈت درگا پرشاد سے فرمائش کی کہ چاندنی بیگم کا زائچہ بنا دیں انھوں نے نظر بھر کر ان بے چاری کی پیشانی کو دیکھا اور بات ٹال دی۔ تو کیا ان کی شکل دیکھتے ہی

پنڈت جی کو علم ہو گیا تھا کہ وہ بہت جلد مرنے والی ہیں؟ نونسنس ــــ چند سال قبل چھوٹی خالہ بمبئی گئیں۔ وہاں ایک ڈنر پر ہرمیندر ناتھ چٹوپادھیائے سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت ہرین دا پر موڈ آیا ہوا تھا۔ وہ گویا ایک بچہ ہے جو اچانک ان پر آجاتا ہے اور وہ بچوں کی سی آوازیں بولنے لگتے ہیں اور طفلانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ دراصل ایک منجھے ہوئے پرانے اداکار ہیں۔ یا شاید وہ ایک ALTERNATE PERSONALITY کے مالک ہیں۔ شامت اعمال خالہ کو اسی ڈنر میں جانا رہ گیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ واپس آئیں کہ یہ خود بھی ایک متبادل شخصیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس صورت میں ان کو خود اس دوسری آوازیں بولنا چاہیئے تھا۔ اور ان کی حرکتیں بھی مختلف ہو جاتیں جنّات کے اثر والیوں کی طرح۔ پھر انھوں نے سوچا یہ کسی کی روح ہے۔ ان کو بہت سمجھایا کہ اگر یہ کسی کی روح ہے تو آپ سے جاپانی یا تامل میں بات کیوں نہیں کرتی؟ آپ ہی کی طرح کیوں بولتی ہے؟ اچھا اس سے پوچھئے کہ ریڈروز میں آگ کسی نے لگائی یا حادثہ تھا۔ اور حادثہ بھی کس طرح وقوع پذیر ہوا؟ اس کی وجہ کیا تھی؟ آواز اس سوال کے جواب میں ہمیشہ خاموش رہی کیونکہ خود صفیہ خالہ کو معلوم نہیں کسی کو بھی معلوم نہیں۔"

کہرہ بارہ دری کے گرد منڈلانے لگا۔

"فلی نے کہا کم از کم کرنل دو بوا تو نہیں ورنہ آپ فرنچ ہی سیکھ جاتیں! اس پر یہ خوب ہنسیں۔ یہ سال میں ایک دو بار ہی ہنستی ہیں۔ لیکن شکر ہے بھوت پریت آسیب کے پھیر میں زیادہ نہیں پڑیں۔"

کان بجنے کے مسئلے پر لیلے نے "اڈّا" جاری رکھا ــــ

"سنو ــــ ٹام صاحب کہتا تھا ــــ انسان کی کھوپڑی کے اندر پانچ ذہن ہیں جن میں سے وہ عموماً صرف ایک استعمال کرتا ہے ــــ"

"یار آدمی کے ایک ہی دماغ نے آفت مچا رکھی ہے تم پانچ پانچ لے آئیں۔"

"اور ٹام صاحب نے کہا کہ ہر انسان کا ایک چوتھا ڈائمنشن بھی ہے ــــ اس کا رشتہ آدمی سے سمندر اور ساحل جیسا ہے۔ اور اس کی لہریں انسان پر آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان لہروں میں ماضی اور مستقبل دونوں موجود ہیں۔ کبھی کبھی ان کا کوئی پیغام انسان کو اندر ہی اندر سنائی دے جاتا ہے۔ اور یہ چوتھا ڈائمنشن آدمی کی ساری عمر کی TIME-BODY ہے ــــ"

"ضرور ہوگی۔ گول کرو۔ اور یہ ٹام صاحب کون بزرگوار ہیں" بنگی نے کان کھڑے کئے۔

"مشہور مصوّر اور ہونے والا مشہور مفکّر ــــ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ بھی کیلی فورنیا کے پہاڑوں سے اترا تھا ــــ"

لاریب فن گفتگو یوپی کے اُردو والوں ہی کی خاص کاٹج انڈسٹری ہے۔ مگر بنگالی کم تقریباً نہیں۔ ابھی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا چاہیئے۔ ورنہ بیاہ کے بعد یہ بولا کریں گی اور ہم سنا کریں گے۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کھنکار کر ذرا سا للکارے ــــ "سنو بھائی لیلے۔ ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معاملہ ابھی ارتقا کی بھول بھلیاں میں پڑا ہے ــــ" آہا بیٹا قیس ــــ لاجواب کر دیا۔

بھول بھلیاں ــــ!! سوچ کی انڈر گراونڈ ٹرین پر سوار وہ چھن بھرا امام باڑہ آصفی پر رکی آگے نکلی سلاطین دکن کے غمناک اُجاڑ لرزہ خیز جنوبی قلعے پیچدار تاریک سرنگیں تیز رفتار مشعل بردار رہبروں کی صدائے بازگشت ــــ ایکو ــــ ایکو ــــ ریپل سر ایکو

ہاؤ ڈو یو ڈو — ہلو — ہلو — لٹل سر ایکو کم ڈانس وِد مِی ۔ ہلو — ہلو —

جی بھر آیا پھنگیا سے آنکھ کا گوشہ خشک کیا ۔ پُوور ڈیر صفیہ خالہ —

اندھیری سُرنگ کے باہر اچانک تیز دُھوپ قلعۂ دولت آباد کی خندق کے سبز پانی پر پھیلی سبز کائی آبی پودے حیات اوّلیں کے نقوش اور اوپر جاتی شکستہ قدیم سیڑھیاں ٹھنڈے سایہ دار درختوں کے نیچے براجمان نوادر فروش دولتمند گورے سیاحوں کو بیچتے وزنی موٹے ٹیڑھے میڑھے عربی فارسی ٹھپّوں والے شاہان کہن کے، چمکیلے انگلش حروف والے گول سڈول ایسٹ انڈیا کمپنی کے گویا شہر ایمان سے عہدِ ڈارون تلک کے سکّے — جو ہلواہوں کو کھیتوں کی مٹّی میں ملا کیے — جیسے سنا ہے جمّا دھوبی ریڈ روز میں ہل چلاتا تھا تو — ٹرین ایک خواہ مخواہ کی برانچ لائن پر چل پڑی — واپس آئی ۔

"رائیٹ پنکی ۔ شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔"

مرزا نے باچھیں کِھلائیں ۔ کر دیا قائل ۔ شاباش بٹیا قیس ۔ چہرے پر بقراطیت طاری کر کے دوبارہ کھنکارے ۔ "دیکھو لیلےٰ بیگم ۔ ایسا ہے کہ —" دوسرا سگریٹ سُلگایا ۔ "کہ خالہ کی یہ آوازان کی سائیکی کے اندھے کنویں کی گونج ہے جو محض انھیں سنائی دی جاتی ہے — جیسے سیپ میں سمندر کی گنگناہٹ۔"

اندھا کنواں — !!

"لیلےٰ اوّلین انسان تو بولنا ہی نہیں جانتا تھا ۔ فرض کرو ہمارا ارتقا اس اسٹیج پر پہنچ جائے جب ہمارے اندرونی خیالات بھی دوسروں کو سنائی دینے لگیں ۔ ہمارے تصورات سینما اسکرین کی طرح نظر آئیں —"

"ارتقا کی اگلی منزلوں کے لیے ابھی لاکھوں برس باقی ہیں! ہاں پنکی ۔ وہ

ریڈ روز والا اندھا کنواں میں نے آتے ہی مٹّی سے پورا پٹوا دیا تھا ۔ وہاں بھنگ اُگ آئی تھی ۔ وہ اُکھڑوا پھینکی ۔ سنا ہے پہلے وہاں پرہیجڑے جمع ہوا کرتے تھے۔"

پنکی نے صفیہ کو آواز دی — "چھوٹی خالہ ۔ سردی ہوگئی اب اندر آجائیے۔" پھر لیلےٰ کو مخاطب کیا — "بات محض یہ ہے کہ جب یہ کسی وجہ سے بہت زیادہ مضطرب یا فکرمند ہوتی ہیں ان کے دبے ہوئے خوف کان کی انبارمل خرابی کی وجہ سے آواز بن جاتے ہیں ۔ پچھلے دنوں یہ تمہاری زمین پر اپنے کنڈر گارٹن کی تعمیر کے سلسلے میں بہت اکسائیٹڈ تھیں ۔ وسوسے پھر سنائی دینے ۔ منع کر رہے ہیں منع کر رہے ہیں ۔ اب وہ اس فقرے کو مندر مسجد کے جھگڑے سے جوڑ رہی ہیں ۔ ابھی کہہ رہی تھیں یہ زمین ہی نحوست زدہ ہے۔"

لیلےٰ نے آہستہ سے کہا "پنکی یہ وہم تو میرے دل میں بھی پڑ گیا ہے ۔ ڈیڈی نے شاید ان غریب میراثیوں کی حق تلفی کی، مقدمہ لڑتے لڑتے وہ بیچارے پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے ۔ اور ہم اب اس جھونپڑپٹی کو اجاڑنے والے ہیں۔"

پنکی نے سگریٹ کا طویل کش لیا ۔

"لیلےٰ یہ وہم نہیں ۔ تمہارے ضمیر کی آواز ہے ۔ کیا تم اس آواز کو سننے کے لیے تیار ہو — ؟ کیا تم روز ہاؤس کی جگہ ان جھونپڑی والوں کے لیے سستے کوارٹر بنا دو گی ؟"

صفیہ واپس آتی دکھلائی پڑیں ۔

"جہاں تک خالہ کے اوہام کا تعلق ہے اگر ایک —"

فوراً چُپ ہو گئے کیونکہ وہ حوض کے قریب پہنچ چکی تھیں ۔

"کیا — ؟" لیلےٰ نے چپکے سے پوچھا ۔

"ایک عدد چھوٹے خالو —"

صفیہ کے کان بہت تیز تھے۔ زور سے ڈانٹا — "بکومت —" اور کوٹھی کی طرف چلی گئیں۔

"گھومنے جاتیں۔ سیر و سیاحت۔"

"کنجوس ہیں اور ہوائی سفر سے ڈرتی ہیں۔ آج تک ملک سے باہر نہیں گئیں۔ سوائے کراچی —"

گرم چادر لپیٹے خوش قدم بُوا نمودار ہوئیں۔ "بھیا۔ خاصہ چنوائیں؟"

"ہاں بُوا کیا کیا پکوایا ہے؟"

"لیلےٰ بِٹیا کے لیے خاص تین قسم کی مچھلی — کھنڈلے اور سالن اور کباب —"

دُھند میں ٹارچ چمکی۔ بجری پر قدموں کی چاپ۔

"آہا — معراج صاحب!" پنکی کرسی سے اُٹھے۔ "آداب۔"

"جیتے رہیے۔" سر سے مفلر لپیٹے معراج صاحب اندر آئے۔ "ابھی سے ٹھنڈ پڑنے لگی۔"

"دسمبر آگیا معراج صاحب!"

لیلےٰ نے سلام کیا۔

"مس سروش — ! آپ بنگال سے کل آئی ہیں —"

"جیتی رہیے — ہمارے زمانے میں یہاں ایک بھولے سے شاعر ہوا کرتے تھے۔ سلام مچھلی شہری۔"

"وہی جن کے لیے مجازؔ نے کہا تھا کہ شاعروں کے ایٹم بم ہیں وہ ہیروشما پر گرا تھا۔ آپ ہماشما پر گرتے ہیں!"

معراج احمد نے قہقہہ لگایا۔ "آپ کو کیسے یاد رہا۔"

"ہم لڑکپن میں وکی ماموں کے ساتھ ادبی محفلوں میں جایا کرتے تھے۔"

"یہ ان کی ایک نظم کی پہلی لائن تھی۔ آپ بنگال سے کل آئی ہیں! بی بی ہمیں آپ کے چچا میاں کی وفات کے متعلق معلوم ہوا۔ افسوس ہیروشما کا ایک ہی فال آؤٹ تھا۔ ختم ہوگیا۔ ہمارے قومی المیوں کے فال آؤٹ بے شمار ہیں بجانے کب تلک جاری رہیں گے۔"

"اتفاق سے اچھے موقعے پر امریکہ سے آئے معراج صاحب! آپ یہ گواہی دے سکتے ہیں کہ پیپل والا مندر کوٹھی کے احاطے میں شامل تھا —
— ارے بُوا۔ بس؟ کم از کم سات قسم کی مچھلی تو ہوتی۔"

"بالکل۔ درخت کی کھوہ میں ایک مہادیو جی رکھے ہوئے تھے۔ منشی بھوانی شنکر سوختہ نے اس کے گرد ایک چبوترہ بنا لیا تھا۔ اس پر بیٹھ کر گیان دھیان کرتے تھے۔ ہم نے برسوں یہ منظر دیکھا۔"

"جنت مکانی کی زندگی میں سات قسم کی بھی پکتی تھی!"

"وہ کون صاحب تھے؟" لیلےٰ نے چپکے سے دریافت کیا۔

"نانا میاں۔ اپنے وقت کے نامور ترین گورمے — جی معراج صاحب — آپ یہی بیان دیدیجئے۔"

"پبلک کا اس وقت جو موڈ ہے، ہمارا بیان مانا جائے گا؟ پنکی میاں آج برسوں کے بعد ہمارے اندر خوابیدہ پریس رپورٹر جاگ اٹھا۔ ہم صبح سویرے ہی آپ کی سائیٹ پر پہنچے وہاں ایک عجوبہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ بات معمولی ہے مگر بیحد علامتی — سنیے۔ ہم لوگوں نے ایک ریڈ روز پارٹی بنائی تھی۔ اس کے ٹکٹ پر قنبر میاں الکشن لڑے۔ درانتی کے اندر گلاب اور ہتھوڑا ہمارا نشان تھا۔ ہم ہی نے اس کا بلاک بنوایا۔ پیتل کے دو سائن بورڈ برآمدے میں رکھے تھے۔ یہ لوگو تینوں رسالوں کے سرورق پر بھی چھپتا تھا۔ برسوں بعد جب جمّا دھوبی کو ہل چلاتے ہوئے وہ دونوں پلیٹیں ملیں۔ انہوں نے مٹی سے

نکال کر مسجد کی دیوار سے ٹکا دیں۔ آج یہ بات ہمیں وہیں معلوم ہوتیں۔ اب جناب والا مندر والوں نے ایک تختی پر سے ہتھوڑا اور گلاب کھرچ کر درانتی کو ترشول بنا دیا ہے۔ دوسری پر سے مسجد کمیٹی والوں نے ہتھوڑا مٹا کر درانتی کو ہلال اور گلاب کو ہشت پہلو ستارے کی شکل دیدی ہے۔ دونوں بورڈ آمنے سامنے نصب کر دیئے گئے ہیں۔ ہم پھر یہی کہیں گے کہ یہ معاملہ اسی ترشول اور اسلامی سمبل کے چکر میں جوالامکھی بن سکتا ہے۔"

خوش قدم بوا واپس گئیں۔

گواہی کی بات پر لیلے پھر سوچ میں پڑیں۔ کسے معلوم ان تینوں کی جان کتنی اذیت سے نکلی۔ قنبر۔ بیلا۔ چاندنی۔ بے ساختہ منہ سے نکلا —

"کوئی گواہ نہیں —"

"مسجد بھی بچی تھی۔" معراج احمد نے کہا۔

"گواہی —! گرم ڈریسنگ گاؤن اور کنٹوپ پہنے وکی میاں سامنے کھڑے تھے۔ "ہم شیخ زادوں کے متعلق گواہی دینے آئے ہیں۔"

معاً دورندی کے اس پار پولیس لائنز میں شام کا بگل بجا۔ ایڑی پر گھوم کر اس کی بیحد مدھم آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔

"غور سے سنو — لا — لا — لا — لا — لا — لا — ڈی — ڈا — برطانوی باستان شناسوں نے قدیم رومن نوٹیشن کھود نکالے ہیں۔ اور رومن ساز — اور ان کے نغمے کمپوز کیے ہیں۔ ہم نے سُنے۔ اور ان میں سے چند سکنڈ کی ایک دُھن — اور یہ نوٹ پہچانے — تو ہم نے سوچا یہ رومن ایمپائر کی چھاؤنیوں میں بگل پر بجائی جاتی ہوگی اور رومن برطانیہ میں —"

شام کے ساؤنڈ اسکیپ میں وہ چاروں اپنی اپنی جگہ تنہا اور خاموش، کہرے کو دیکھا کیے جو بے آواز سُروں کی طرح متحرک تھا۔

پھر وکی میاں نے کہا: "یہ سب ابتدا سے کیسے ہوا۔ اور کیوں ہوا۔ ع آدمی کوئی ہمارا — ؟"

"پچھلے دس ہزار سال میں —" معراج احمد نے کہا — "کبھی کبھی بات بدل بدل بھی تو گئی ہے۔"

"لیکن مستند گواہ بھی ڈھونڈنے سے مل سکتے ہیں۔" پنکی نے کہا۔

وکی چونکے۔ "رومن ٹرمپٹ اور بیگ پائپ اور بربط اور بطخوں اور بھیڑوں کی ہڈیوں سے بنی وائیکنگ بانسریاں۔"

"ہڈیوں کی بانسریاں ؟ وہ متواتر بج رہی ہیں۔ جب سے انسان پیدا ہوا اور مرا۔" معراج احمد نے کہا۔ وہ سب پھر چُپ ہو گئے۔

کسی نے کُتب خانے کا دریچہ اندر سے بند کر دیا۔

"ماموں میاں — کچھ معلوم ہوا ؟" پنکی کی آواز دھندلکے میں ملفوف تھی۔

"ہاں — مگر مکمل طور پر نہیں۔ نمعلوم کتنی تکلیف میں تھے جب وہ مچھی بھون سے نکالے گئے۔"

"میری چچی اور کزن — ان کے آخری خیالات آخری الفاظ کیا تھے جب وہ مارے گئے۔" لیلے نے کہا۔

"لیکن بی بی۔" معراج احمد بولے۔ "ہم خوش ہیں کہ آپ کے ہاں درانتی اور ہتھوڑے کی سرکار نے کم از کم ایک قسم کی مارا ماری تو ختم کروا دی۔"

"جی ہاں لیکن اب ایتھنک۔ جی۔ ایل۔ ایف نے وار جلنگ میں —"

"— ؟ معاف کرنا۔ ہم بہت عرصے بعد واپس آئے ہیں۔"

"گورکھا لبریشن فرنٹ۔"

"اور نکسل باڑی والوں کا کیا حال ہے ؟"

"ہمارا کاروبار تو نکسل باڑی ہی میں پھیلا ہوا ہے اور دوا آرز کے ورکر CITU میں شامل ہیں۔"

"اور بی بی یہ CITU کیا ہے ___؟"

وہ چاروں باتیں کرتے بارہ دری سے نکل کر مکان کی سمت بڑھے۔

"انشاء اللہ میں میسور اور وارجلنگ جا رہی ہوں۔ کلکتے سے آپ کے لیے کیا بھجواؤں؟" لیلےٰ نے کھانے کی میز پر نہایت اخلاق کے ساتھ صفیہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ۔ شکریہ۔"

"ارے چھوٹی خالہ۔ بنگالی ساری بھی نہیں؟ ہمارے لیے تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ بھجوا دینا ___" شہلا نے کہا۔

"اچھا تو ڈھکئی؟" لیلےٰ نے پھر دریافت کیا۔

"ڈھکئی؟ میں تو اتنی باریک جھنگ تار اساریاں نہیں پہنتی، تھینک یو۔"

زرینہ سلطان نیچی آواز میں بچی سے پوچھ رہی تھیں۔ "معراج صاحب بار بار احاطہ ستارہ بیگم کا ذکر کیوں کرتے ہیں ___؟"

"امی۔ امریکہ میں ڈاکٹروں نے کینسر تشخیص کیا ہے۔ وہاں علاج کروانے کے بجائے چپکے سے گھر لوٹ آئے۔ ابھی بتلا رہے تھے ان کے لڑکے پکڑ کر واپس لے جانے کے لیے عنقریب پہونچنے والے ہیں۔"

طویل میز کے سرے پر وکی میاں معراج میاں سے مخاطب تھے ___

"بھائی ہم نے تو اپنا کتبہ بھی لکھ لیا ہے ___ یہ تو ہو گیا ___ اب اس کے بعد ___؟"

---

(۱۳) ٹیپو سلطان بار

ٹالی گنج کلب کلکتہ کے فرنگی سکتر، کہ چہرے مہرے، چال ڈھال سے خالص پکّا تھے، عقبی ہیں برآمدے میں کھڑے "نیو ایئر زایو" کی تیاریاں ملاحظہ کر رہے تھے۔ راج کی باقیات الصالحات میں سے تھے، جس دور کی جھلک ان کی موجودگی کی وجہ سے ایک خوشگوار اداس، رومان انگیز برطانوی فلم ریل کی طرح آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ وہ ایک فرد کے بجائے ایک کیفیت سی معلوم ہوتے تھے۔ منفرد برٹش سنس اف ہیومر کی بدولت انہوں نے سگِ عزیز کا نام وکٹوریہ میموریل رکھ چھوڑا تھا۔ بیرے کا بندوق۔ جو جبل الطارق کے مانند جلو میں استادہ تھا۔

کلب کا "فار پولین" جگمگا رہا تھا۔

COME FLEETLY COME FLEETLY, MY HOOKABADAR,
FOR THE SOUND OF THE
TOM-TOM IS HEARD FROM AFAR.
"BANOOLAH! BANOOLAH!" THE BRAHMINS
ARE NIGH,
AND THE DEPTHS OF THE JUNGLE RE-ECHO
THEIR CRY.
PESTONJEE BOMANJEE!
SMITE THE GUITAR.
JOIN IN THE CHORUS, MY HOOKABADAR.

جس انداز سے سکڑ صاحب برآمدے میں کھڑے تھے اس طرح شاید کوئی بچا کھچا رومن نتے نئے مسیحی برطانیہ کی کسی باقی ماندہ رومن عمارت کے ستون سے ٹکا غروب آفتاب کا نظارہ کرتا ہوگا۔ یا بنی اُمیّہ کا کوئی مؤرّخ تازہ بتازہ کیتھولک غرناطہ میں کسی محراب کے پیچھے ڈوبتے ہلال کو دیکھتا ہوگا۔ کیا معلوم۔

بھارت ورش میں گنتی کے چند ولایت نژاد ابھی موجود ہیں کہ ہر سال کرسمس پر ملک کے انگلش اخبارات میں وہ بڑے دن یاد کرتے ہیں جو انہوں نے دورافتادہ اضلاع میں اپنے والدین کی وسیع کوٹھیوں میں مناتے جب ہال اینڈ اینڈرسن کلکتہ، مرے کمپنی اور آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے منگواتے ہوئے کریٹ اتار کر برآمدے میں رکھے جاتے تھے وہ ٹمٹم پر بیٹھ کر چرچ جاتے اور ان کی خوش مزاج دادی خفیہ خاندانی نسخے سے وائن بنا کر مہمانوں کو پیش کرتی تھیں۔

امپیریل تہذیبوں کے پسماندگان کے لیے وقت صبر آزما ہے۔

ان قدیم خواتین وحضرات کو مغربی فلمساز راج کے متعلق پکچر بنانے کے لیے بطور صلاح کار ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور مشہور ہندوستانی اداکار نہایت فخر کے ساتھ خانساماں، بیرے، آیا، کلرک اور مضحکہ خیز "نیٹو" کرداروں کے رول ان فلموں میں ادا کرتے ہیں۔

جس طور پر بنگال کلب میں اب تک اگاتھا کرسٹی کے ناولوں کی سرخ چمڑے سے جلد بندی کی جاتی ہے، ٹالی گنج کلب میں بھی کولونیل ماحول برقرار ہے۔

کہتے ہیں برطانیہ صرف دو حریفوں سے لرزا۔ اُس طرف پرشا یعنی جرمنی۔ اِدھر حیدر علی اور ٹیپو۔ ان باپ بیٹے کے تدبر اور دلاوری سے مرعوب، معترف اور خائف۔

ٹیپو انکا "باغی" نہیں تھا۔ بے پناہ ذہین طاقتور، اور جری ہمسر دشمن تھا۔ چنانچہ ویلزلی کمسن شہزادوں کے ساتھ بڑی پدرانہ شفقت سے پیش آیا۔

اٹھاون برس بعد دلی اور لکھنؤ کے پشتینی پنشن یافتہ، فرضی حکمرانوں کے لیے ان کا رویّہ بدل گیا۔ مغل شہزادوں کو "بغاوت" کے جرم میں قتل کیا۔ جو زندہ بچے انہیں ذلیل وخوار۔ نا اہلوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ کورس میں گاؤ اے حقّہ بردار

HEED NOT THE BLAST OF THE DEADLY MONSOON.

NOR THE BLUE BRAHMAPUTRA THAT GLEAMS
IN THE MOON,

STICK TO THY MUSIC, AND OH, LET THE SOUND

BE HEARD WITH DISTINCTNESS A MILE
OR TWO ROUND.

JAMSETJEE, JEEJEEBHOY!

SWEEP THE GUITAR.

JOIN IN THE CHORUS, MY HOOKABADAR.

ART THOU A BUDDHIST, OR DOST THOU INDEED

PUT FAITH IN THE MIGHTY MOHAMMEDAN CREED?

ART THOU A GHEBIR - A KINDLY PARSEE?

NOT THAT IT MATTERS AN ATOM TO ME.

CURSETJEE BOMANJEE!

TWANG THE GUITAR.

JOIN IN THE CHORUS, MY HOOKABADAR.

آزادی کے بعد بنگال کی ڈو مرتبہ اکھاڑ پچھاڑ کے باوجود جو آوازیں ہنری لیہہ کو گزشتہ صدی میں گھنے جنگلوں سے بلند ہوتی سنائی دی تھیں وہ ہیں کہ اب بھی آئے چلی جا رہی ہیں۔

عالیشان اور منور مسجد ٹیپو سلطان کے سامنے سے گذرتے ہوئے طاہر علی سروش فیل فروش کے ڈرائیور عبدالمجید نے کلب کے باہر کار روکی۔ شیخ صاحب برآمد ہوئے۔ انکے گنجے سر کے گرد آویزاں سفید بالوں کی جھالر ہوا کے جھونکے میں یوں اُڑی کہ وہ ایک اسطوری مخلوق نظر آئے۔ یا غضبناک مرّیخ —— ایک ٹیلیگرام طیش اور پریشانی کے باعث انکی انگلیوں میں لرزاں تھا۔

ٹیپو سلطان بار کی طرف مُڑے۔

ستّار بیرہ راستے میں ملا۔

"ارشد میاں جیسے ہی آویں ادھر بھیجدینا۔" بار میں جا کر ایک اسٹول پر بیٹھ گئے۔

وکٹوریہ میموریل ٹہلتا ہوا اندر آیا چکّر لگا کر چلا گیا۔

چند منٹ بعد ایک اور جنٹلمین داخل ہوتے: "آداب عرض۔ بھائی جان"۔ شیخ صاحب نے تار انکو پکڑا دیا: "کھل رائے۔ شبرو تو چکر دیتی۔ ترون گھوش۔ اور یہ خاکسار۔ سب کے گودام اور بنگلے نذر آتش —— جنگلوں میں مورچے"۔

"بھائی جان۔ آپکو بھی اسی علاقے میں اپنا کام پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"دنیا میں کون سا خطہ محفوظ ہے؟ بہرحال لیلے اپنے منگیتر کی پارٹنر شپ میں نئی پروجیکٹ میسور میں شروع تو کر رہی ہیں۔ خاتون بیبی"۔

"آہا —— صندل کے جنگل —— ! افسانوی کاروبار!"

شیخ صاحب تیوری پر بل ڈالے بیٹھے رہے۔ قدرے سکوت کے بعد گویا

ہوتے۔ "سنو ارشد میاں"۔ بائیں کی آنکھ سے ایک مُنّا سا آنسو ٹپکا: "میرا چھوٹا بھائی مظہر علی اپنی مکمّل بربادی کے بعد جا بجا دھکّے کھاتا پھرا۔ تین ملک بن گئے۔ ایک پُرانا۔ دو نئے۔ پھر بھی لوگوں کو چین نہیں۔ قرار نہیں۔ سکون نہیں۔ مارے مارے پھرتے ہیں۔ مارے جاتے ہیں۔ زمین گھوم گئی —— مظہر علی نے سلہٹ میں خریدی۔ وہ انکے پاؤں تلے سے نکلی۔ دوار زمیں میری کل گئی۔ جدّی جو لکھنؤ میں ملی اسمیں فتور پڑ گیا"۔

وکٹوریہ میموریل پھر اندر آیا۔

"محض وکٹوریہ میموریل کو استقامت حاصل ہے۔ ہلو —— وِک ——"

موصوف نے دُم ہلائی۔

"ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمیں اپنے آبائی گاؤں ہی سے نہیں نکلنا چاہیئے تھا"۔

"بھائی جان۔ لیلے کسوقت آئیں گی؟"

"آتی ہونگی۔ نیو مارکیٹ گئی ہیں۔ سنو ارشد میاں۔ ہمارے بزرگ شیخ زادے تھے۔ ان کو کوئی نہیں جانتا کیونکہ مفتوح تھے۔ شاہان اودھ کی دھوم مچی ہوئی ہے کیونکہ فاتح تھے۔ کیا وہ شیوخ بانکے لوگ نہیں تھے۔ کیا وہ لکھنؤ کے اکبری دروازے پر تلوار نہیں لٹکاتے رکھتے تھے کہ کوئی فیل نشین انکے سامنے سے بغیر سر جھکائے نہ نکل سکے؟ کیا وہ بانگڑو تھے؟ اجی صاحب مدرسہ فرنگی محل ان کے دور میں قایم ہوا۔ مچھی بھون اور پنج محلہ انہوں نے بنوایا۔ اور جانے کیا کیا ہوگا۔ مگر تاریخ فاتح لکھواتا ہے ——"

"جی۔ بھائی جان ——"

"لیکن ارشد حسین تم کو معلوم ہے زمین کا اصل مول کیا ہے؟"

"بھاؤ اتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ —— لوگ باگ کروڑوں میں بات کرتے ہیں"۔

"جی نہیں۔ لیلےٰ ابھی لکھنؤ کے بھانڈوں سے معلوم کرکے آئی ہیں۔ زمین کی قیمت ہے محض ایک شیشی عطرِ گل — سبحان اللہ — سبحان اللہ۔"

ایک آنسو اور گرا۔

"بھائی جان سُنا ہے مارواڑی بنگالیوں کو چا۔بگان سے بیدخل کر رہے ہیں۔"

"سرمایہ دار سرمایہ دار کو — نیتا نیتا کو۔ بادشاہ بادشاہ کو سب ہمیشہ سے ایک دوسرے کو بیدخل کرتے آتے ہیں۔ ارشد میاں جب نواب برہان الملک نے مچھی بھون پر حملہ کیا شیخ زادے انکے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے ہمارے لڑکے چیچک میں مبتلا ہیں۔ قلعہ خالی کرنے کے لیے چند روز کی مہلت دیجئے۔ نہیں صاحب اسیوقت تہس نہس کر ڈالا مچھی بھون۔ مغل فوج نے لُوٹ مار مچائی۔ پورے ایک سو بیئس برس بعد اہل فرنگ نے اسیطرح واجد علیشاہ سے لکھنؤ خالی کروایا۔

"ہم نے لیلےٰ سے کہا مظہر علی تو گئے۔ انکی قسمت میں نہ تھا کہ فریدہ فرحانہ کو دُلہنیں بنا دیکھتے —" اشک بہت تیزی سے رواں ہوتے — "ہم بھی جانے کس لمحے اٹھ کر چلتے بنیں۔ تم اب بچا کے سوگ سے نکلو اور اپنا جہیز بناؤ۔ تاکہ ہم تمہیں اپنے سامنے ڈولی میں بٹھال سکیں۔ چنانچہ لیلےٰ پرسوں مٹیا برج گئی تھیں درزیوں کے پاس۔ شاہی امام بارے میں ایک عجیب دلدوز منظر دیکھا۔ بادشاہ کی تربت کے سامنے ایک سینی میں سکے پڑے ہوتے تھے۔ ایک غریب برقعہ پوش منّت ماننے میں مصروف تھی۔ تو صاحب جانعالم بھی پیر بن گئے۔"

"بھائی جان۔ کہتے ہیں واجد علیشاہ نے ساری عمر نماز فجر قضا نہیں کی۔ انکو انگریزوں نے بدنام بہت کیا ہے آپ ابھی فرما رہے تھے کہ تاریخ فاتح لکھواتا ہے۔ اور کیا پتہ وہ مرحوم پہنچے ہوئے بزرگ رہے ہوں۔ یہ روحانی معاملات ہیں۔"

"بے شک۔ تمہاری مطلقہ بیوی رومیلا کا بھی تو یہی کہنا تھا کہ تم اسکی چتر کار آتما نہیں پہچان پاتے اور وہ تمہاری لیدر بزنس کی اسپرٹ نہ سمجھ سکی۔ یہ سب روحانی معاملات ہیں۔ اچھا۔ لیلےٰ بتلا رہی تھیں کہ تم پھر سیٹل ہونا چاہتے ہو — ہلو۔"

ایک اور جنٹلمین آن کر اسٹول پر بیٹھے۔

"چکرورتی۔ یہ میری بیوی کے کزن ہیں۔ مسٹر ارشد حسین۔ کانپور کے لیدر کنگ۔"

"ارے کہاں بھائی جان — ہم شمسی برادری سے کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔"

"اوہو — ہلو — یہ تمہارا شالا ہے!" چکرورتی نے باچھیں کھلائیں۔ بیگم طاہر جل پائی گوڑی کی رہنے والی تھیں۔ ارشد حسین کو ہم وطن بنگالی سمجھ کر چکرورتی نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور فوراً بنگلہ میں گفتگو شروع کر دی۔

"یہ محض آدھے بنگالی ہیں۔" طاہر علی نے وضاحت کی۔ "بنگلہ نہیں بول سکتے۔ انکا فادر لینڈ صوبہ بہار ہے۔"

"صاحب۔" ستار بیرے نے حاضر ہو کر چکرورتی کو مخاطب کیا۔ "لیڈی گھوش تشریف لے آئیں۔ آپکو سلام بولا ہے۔"

"جاؤ چکرورتی تم لیڈی گھوش کے ساتھ برج کھیل کر اپنا غم غلط کرو۔" طاہر علی نے کہا۔ وہ صاحب ارشد حسین سے معذرت طلب کرکے اُٹھ گئے۔ طاہر علی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "لیڈی گھوش راج کی باقیات الصالحات میں سے ہیں۔ اسّی کے اوپر نکل گئیں مگر پابندی سے تاش کھیلنے کلب آتی ہیں۔ اور زمین چکرورتی کے پاؤں تلے سے دوبارہ نکل گئی۔ اسکے والدین ۴۷ء میں ڈھاکہ سے یہاں آتے تھے۔ اس نے دوار زمین کاروبار جمایا۔ تو وہ سب کل پرسوں برباد ہوا۔ یہ ٹالی گنج کلب جہاں تم بیٹھے ہو ساڑھے چار مربع میل کا علاقہ ویلزلے نے ٹیپو کے لڑکوں کو دیا تھا۔"

"ارے اتنی بڑی سلطنت خداداد انکے باپ سے چھینی تو یہ اتنی سی زمین بھی ان یتیم بے آسرا بچوں کو نہ دیتے۔"

"میاں ابھی ایک روز ہم ایک رکشا پر بیٹھے۔ معلوم ہوا رکشا والا ٹیپو میسور کی اولاد میں سے ہے۔ کیا وہ ایک جیٹ پائلٹ نہیں بن سکتا تھا؟ کیا چیز مانع تھی؟"

"افلاس۔"

"افلاس بوجہ اسراف — کیا غریبوں کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتی۔

—— اہلِ ہنود کو دیکھو۔ سُنو ارشد حُسین۔ راجہ رام موہن رائے اور ٹیپو سلطان ہم عُمر تھے۔ اور دونوں نئے ہندوستان کے پیغامبر۔ شالی گنج میں میٹرو اسٹیشن تعمیر ہوا ہے رام موہن رائے کے نام لیواؤں نے کلکتے کی زمین کے نیچے ریل چلادی۔ ٹیپو کی اولاد اسی زمین پر رکشا کھینچ رہی ہے۔ پونے دو سَو سال کلکتے جیسے علمی مرکز میں رہنے کے بعد" طاہر علی نے رومال نکال کر آنکھیں خشک کیں۔

ارشد حسین نے گھڑی دیکھی "اچھا۔ تو بھائی جان اب ہم ——"

"یا وحشت۔ ابھی سے کہاں چلے شاہ صاحب؟"

"قبلہ ہمیں کلکتہ آئے چار روز ہوا۔ اور دس اخبار میں دو ہی اسٹوری پڑھا۔ ہر جگہ محض دو تذکرہ ہے۔ گورکھا گردی اور ان کے شامل دلاور اور انور۔ بلا کشان بلادِ کلکتہ ——"

"اوّل الذکر تباہ کن۔ موخرالذکر عبرتناک" شیخ نے سر ہلایا۔

"سنتے ہیں ان دونوں صاحب زادگان فاقہ کش کی رکشا کشی محض ایک رقت آمیز افسانہ ہے۔ فریقِ ثانی کے خلاف پبلک کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے۔ کیوں کہ ٹرسٹ کے دگرگوں معاملات ایک بار پھر پریس میں آگئے ہیں۔ سُنا ہے آلِ ٹیپو کی دولتمند شاخ کے مطابق یہ مفلس کنبہ بے ضابطہ و غیر مصدقہ عائلی روابط کی وجہ سے قانوناً حقِ وراثت نہیں رکھتا"

مکنا ہاتھی نے کان پھٹپھٹا کر تین لنگڑی چیونٹیاں سونڈ سے جھاڑیں۔

تین عدد بدحال نفر سر جھکائے لکھنؤ کی عدالتِ عالیہ سے باہر نکل گئے۔

لمبوترے چہرے والے فرس سوار نے اپنی روپہلی ایال جھٹک کر ساغر اٹھایا۔

"میاں صاجزادے! آج تم نہایت چرمناک نظر آتے ہو"

"ہوسے بھی تو بہت تیز ہے۔ یہ میرے ہی کارخانے کا جیکٹ ہے!"

گج پتی آبِ احمر میں بہت پی چکا تھا۔ کنارے پر واپس آن کر گڑگڑایا۔

"رنگے سیار کا یہ بھٹ —— جب شیر کے بچوں نے اپنی کچھار بنایا ——"

"منے —— ؟" ایک نوجوان موڈرن مارواڑی نے استفسار کیا۔

"بالفاظ دیگر نیل کے ایک فرنگی پلانٹر سے آلِ ٹیپو نے یہ کوٹھی خریدی ——"

"کیا وہ اپنے ساتھ بہت مال ویلور سے لاتے تھے؟"

"نہیں۔ محض ہمتّ خداداد جس کی بدولت شہزادہ غلام محمد ابن ٹیپو سلطان نے بیوپار میں ہُن برسایا۔ اور ہُن کہ سکۂ سلطنت وجیانگرم کا تھا، سکۂ دولت وکٹوریہ میں ڈھل چکا تھا" شیخ نخلستان بعالمِ سرور دریائے لطافت و بلاغت و علیت کی لہروں میں ڈبکیاں لگاتا تھا۔

"ہُن —— ہُوں ہُوں!!" موڈرن مارواڑی اپنی لاتن کی بات سُن کر مخمور ہوا۔ سارا سنہرا سنسار لال کپڑے میں لپٹی ایک وشال، مہان بہی کھاتہ۔ پوتھی۔ باقی سب بیکار کا طُومار جو بیوقوف لوگ مختلف زبانوں میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رسم الخط مڑیا ہے۔ جس میں بہی قلمبند کی جاتی ہے۔ دیکھو کہ بنگال کی لال سرکار بھی لال پوتھی ان سے چھین نہیں سکی۔

"پرنس غلام محمد ٹرسٹ کی ملکیت ——"

"جی صاحب آدھا کلکتہ پکڑو" مارواڑی نے بات کاٹی۔

"شہر کے اندر۔ شہر کے باہر۔ گولف کورس۔ ریس کورس۔ یہ کلب۔ وہ کلب۔ سینٹر میں اتنی جیّد ریل اسٹیٹ —— کتنے ارب؟ کتنے ارب؟"

لمحے بھر کے ڈرامائی توقف کے بعد شیخ بیل پیکر نے خود ہی حاضرینِ محفل کو جواب دیا —— "لیکن —— بسبب افتراق و چپقلش خاندانی مابین متولیانِ اوقاف شہزادۂ میسور ——"

اکثر کامیاب انسان اپنے لیے ایک خاموش آڈینس چاہتے ہیں۔

غالباً اسی وجہ سے ان کے تینوں لڑکے رسّی تڑا کر تڑی ہو گئے۔ مکان پر رہ گئیں بے چاری آپا جان۔ موم کی مریم۔ اور بیٹی لیلے۔ نئی پیڑھی کی چھوکری پھاوڑے کو پھاوڑا پکارنے والی۔ باوا کی سر چڑھی اور لاڈلی۔ انکی لچھے دار گفتگو سنتی ہے اور کٹھ حجتی بھی کرتی جاتی ہے۔ بعد میں بتلاتی ہے۔ رشّو ماموں۔ ڈیڈی بات عموماً پتے کی کہتے ہیں۔

جب سے مسٹر حسین نے مدراس اور بمبئی کی فلم کمپنیوں کو گھوڑے مع ساز وچابک سواراں فراہم کرنا شروع کیے تھے شو بزنس کی مقتدر ہستیوں کو بھی لگاتار اور بے تکان بولتے سن چکے تھے۔ عادی تھے۔ لیکن اس وقت دوبارہ بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

بہنوئی نے ابرو اٹھا کر پھر سوالیہ نظران پر ڈالی "عزیز من۔ اتنی عجلت کس واسطے؟"

"بیگم کے ہیرے۔ بھائی جان"

"——؟؟"

"ملکہ دل افروز کا نولکھا ہار ایک کوّا لے اُڑا۔"

"تم بھی بہک گئے رشّو میاں۔ کیا بک رہے ہو؟"

"شکرا دستیاب نہیں ہوا۔ کیوں کہ راجستھان سے بیشتر شکرے عرب شہزادے اُڑا لے گئے"

"شاہ ارشد حسین —کیا بوٹی پینے لگے ہو —؟"

"بعد ازاں سپہ سالار جہاں زیب کی شمشیر زنی کے عجائب۔ کنیز پھلجھڑی کی عیاری۔ بیگم دل افروز ملکہ بہارستان کی وفادار سہیلی پھول شگوفہ ثریا بانو ایک رخش تازی ہیلی کوپٹر پر لاد کر عین میدان کارزار میں اترے گی۔ ہم خوش ہوئے۔ جتنا حمق بھریں اتنے ہی زیادہ ہمارے گھوڑے انھیں درکار۔ مع ایک عدد تربیت یافتہ کوّا۔"

شیخ نے ایک طویل سانس بھری "ٹھیک کہتے ہو شاہ صاحب دوسروں کی بیوقوفی میں اگر اپنا فائدہ ہے تو انھیں بیوقوف ہی رہنے دو۔"

"وہ فلم ساز دلّی پہنچ گیا ہے۔ ابھی ابھی جب ہم کلب روانہ ہو رہے تھے۔ اس کا تار ملا کہ فوراً آئیے۔ اب ہم جواباً اسے کیا یہ ٹیلی گرام بھیجیں کہ اپنے ذہن کی اصلاح کرو۔ بیگم کے ہیرے نہ بناؤ اور فرانز کافکا پڑھو، ہماری بیوی روؔ میلا بوس جسکا مطالعہ کرتی تھیں؟"

"وکٹوریہ میموریل" نے دروازے پر دستک دی۔

"اسمارٹ اور مہذب"، کسی نے اظہار خیال کیا۔

"انگلش مَین کا کتا ہے۔"

"انگلش مَین کے ایڈمرلیشن میں مرے جاتے ہیں۔ چرچل کہہ گیا تھا۔ ایک وقت آئے گا جب بہت جلد یہ احمق ہمیں یاد کر کے روئیں گے"

وہ شیخ کے قدموں میں تمکنت سے بیٹھ گیا۔

"یہ سفید فام خواجگان سگ پرست ہی اس بے زبان کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ اسمارٹ ڈوگی!" انھوں نے مزید جذبے سے کہا اور جھک کر اس کے ریشمین سر پہ ہاتھ پھیرا۔ "لیکن یہ اور اس کا آقا دونوں باخبر ہیں کہ —— بازار میں مدت سے نیا سکّہ رواں ہے"

"ایک دفعے میں دو مہین تیغ!" برادر نسبتی توصیفاً مسکرایا۔

فار کو یلین میں اناؤنس کیا جا رہا تھا۔ دین شاہ بڑوچا۔ گٹارسٹ۔

بومن جی پیسٹن جی چھپڑو۔ گٹار۔

"زوبن مہتہ کلکتہ آنے والے ہیں" کسی نے کہا۔

زوبن مہتہ ——؟ ایک مرعوب خاموشی طاری ہوئی۔

زوبن مہتہ "حُسین دی ماسٹر" روی شنکر۔

قلۂ کوہ پر پہنچ کر کیا ہوتا ہے؟

آدمی ٹوتھ پیسٹ کے متبسم اشتہار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

شیخ جام پر نظر جمائے رہا۔
"کیا کہیے ہمیں کیا یاد آیا —— صاحبو" وہ پھر گویا ہوا۔ "ہم الیفنٹ بوائے کہلاتے تھے اور کبھی کبھی حضرت آرزو لکھنوی کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ یہاں۔ ٹالی گنج۔ نیو تھیٹرز۔ تبھی کانن دیوی نے گایا لیکے کمنڈل چھوڑ کے منڈل —— اب چھوڑ کے منڈل کہاں جائیں؟ میور بن میں مور چیے —— کیا تم کو معلوم ہے کہ آدم زاد سے قبل دنیا پر جنّوں کا راج تھا اور ان سے قبل گھوڑوں کا ——؟"
"قطع کلام معاف" ارشد حسین نے اسی سنجیدگی سے بات کی "دروازے کے اوپر وہ کیسی چھوٹی سی تختی لگی ہے"
"ٹیپو سلطان بار؟ جنّوں کے زمانے کی —— ہاں اور وہ ملک گیر جہانباں وکشور کُشا جنھیں ذوق خدائی بخش گیا تھا، وہ اپنے گمرے ہاؤنڈز کو بھی اکثر اسی نام سے پکارتے تھے" ایک آنسو اور گرا۔
"اچھا تو بھائی جان قبلہ" ارشد حسین اسٹول سے اٹھے "اب ہم ——"

ڈیرِ ٹونکی۔ پرسوں میسور سے لوٹی۔ امی اور ڈیڈی بھی گئے تھے۔ ڈیڈ تمہاری پروجیکٹ سے متفق ہیں۔ تم بھی ایک چکر لگا لو۔ چلے بھی آؤ کہ صندل کا کاروبار چلے۔ یا پہلے ٹونی کو بھیج دو۔
یہ سطریں نیو مارکیٹ کی ایک دوکان سے گھسیٹ رہی ہوں۔ ساریاں خریدتے ہوئے ایک اور برین ویو آئی۔ چھوٹے خالو! یاد ہے جو تم نے اس شام بارہ دری میں بات کی تھی۔ امی کی ایک پھوپھی کی شادی پٹنہ میں ہوئی ہے۔ انکے صاحبزادے مسٹر ارشد حسین۔ زیادہ تر کانپور اور فرینک فرٹ میں رہتے ہیں۔ ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں صفیہ خالہ کے لیے عین مناسب۔ پہلی بیوی بنگالی آرٹسٹ رومیلا بوس —— طلاق۔ نو کِڈز۔ بہت برسوں سے بے گھرے گھوم رہے ہیں اور اب سیٹل ہونا چاہتے ہیں۔
میں سمجھتی ہوں ذرا سی کوشش کی جائے تو راضی ہو جائیں گے۔ وہ خود کانپور میں ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ صفیہ خالہ بہترین رفیقہ ثابت ہونگی۔
کل صبح ڈیڈی ارشد ماموں کو بسلسلہ مندر مسجد کیس لکھنؤ بھیج رہے ہیں۔ ساریاں انکے ہاتھ بھجواتی ہوں۔ خالہ سے ضرور ملوا دو۔ خالہ کے ساتھ تم سب کو ڈپلومیٹک ہونے کی ضرورت ہے اور ذرا دلجوئی اور پاسداری جو تم لوگ بالکل نہیں کرتے۔ ایک مُنّا سا چندن کا نیا کیلنڈر بھی بھیج رہی ہوں۔ یعنی صفیہ خالہ کے لیے ارشد ماموں کے ہاتھ سے نئے سال کا معطر کیلنڈر —— نیک شگون!
اب میں ٹیوب ٹرین پکڑ کر کلب پہنچی ہوں۔ ماموں کہیں بہت دور ٹھہرے ہیں۔ اگر کلب سے نکل گئے پھر انکا ہاتھ لگنا مشکل ہے۔
تم سب کو سال نو مبارک۔
خدا حافظ۔

کاغذ دوکاندار سے لے لیا تھا۔ سادہ لفافہ نہیں ملا۔ خیر کلب میں ہوگا۔ ساریاں

ایک بار پھر سے گئیں کہ ہونے والی سُسرال کا معاملہ تھا۔ پنگی کی امی۔ (ڈکٹیٹر)۔ شہلا (ٹھیک ٹھاک)۔ رانی دلہن اور سلیمہ (نو پروبلم)۔ صفیہ خالہ (بیحد پروبلم) آمنہ (جو بمبئی ہیں۔ نجانے کیسی ہیں) — یہ برائے مہناز۔ اور یہ انکی والدہ۔

بل ادا کیا۔ دوکان کے ایک چھوکرے نے بیگ اٹھایا۔ بھاگم بھاگ اسپلینڈ ٹیوب اسٹیشن۔

بیتابی سے ٹرین کا انتظار۔ ٹرنگ کی دیواروں پر بنے کوونیل کلکتہ کے فریسکو زیر نظر دوڑائی۔

ہر واقعہ اور منظر گذر جانے کے بعد افسانہ بن جاتا ہے۔ بگھی پر سوار صاحب لوگ۔ کمپنی کے نیٹو گماشتے۔ صاحب اور اسکی نیٹو بُوبُو۔ بھونپو والا گراموفون سنتی ایڈروڈین میم — آنند مٹھ، تقسیم بنگالہ اور اہنسا اور اہنسا وادی جدّوجہد کے طویل دور میں یہ سب تنفر انگیز مناظر تھے اب ایک دلآویز داستان بن گئے اور انکی نقاشی ہم بنگالیوں کی ذہنی پختگی کا ثبوت۔ برطانوی یادگاریں مٹانے کے بجائے ہم نے انکو آرٹ میں ڈھال لیا۔ ذرا فخر سے مسکرائیں۔

یہ سین ایک کہانی ہیں اور اب لگتا ہے اسی سرعت سے آتے اور گذرے جس طرح گڑگڑاتی ہوئی ٹیوب ٹرین آئی اور نکلی۔ اسٹیشن زائیں زائیں آتے اور گذرتے گئے۔ پارک اسٹریٹ۔ اسپورٹس کے مناظر سے مزیّن میدان۔ ٹیگور کی مصوّری اور نظموں کے بلو اپ سے آراستہ رابندر سدن۔ بھوانی پور۔ جتن داس پارک — کالی گھاٹ اسٹائل تصاویر سے سجا کالی گھاٹ۔ رابندر سروور۔ ٹالی گنج۔

پلیٹ فارم پر اتر کر تیزی سے اوپر آئیں، کہیں ارشد ماموں چلے نہ گئے ہوں۔ دعائیں مانگتی اسٹیشن کے پڑوس میں واقع ٹالی گنج کلب پہنچیں۔ دوکان کے چھوکرے کو رخصت کیا۔ ڈیڈ بار میں ہونگے۔ متصل لاؤنج میں جا بیٹھیں۔

ستّار نے جھانک کر سلام کیا۔ اندر جا کر کہا "بی بی آ گئیں۔"

ٹیلیگرام ہاتھ میں لیے طاہر علی نمودار ہوتے۔

"کیا بات ہے؟ کیا دوڑتی ہوئی آ رہی ہو —؟"

"چورنگی سے — بگٹٹ — ! یہ پیکٹ ارشد ماموں کو دینا ہے۔"

"اوہو — وہ تو ابھی ابھی نکل گئے۔"

"ارے — کل صبح جا رہے تھے۔"

"انکا فوری کام نکل آیا۔ یہاں سے سیدھے ڈم ڈم — رات کی فلائٹ سے دلّی۔ پرسوں لکھنؤ۔" طاہر علی ایک لمبا سانس لے کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ تب لیلےٰ نے انکی رقت آمیز سراسیمگی نوٹس کی۔

"ڈیڈی۔ اب کیا ہوا؟ خیریت؟"

انہوں نے اپنے منیجر کا طویل ٹیلیگرام حوالے کیا۔

لیلےٰ نے مضمون دو بار پڑھا، چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ چند سکنڈ تک خاموشی طاری رہی۔ ستّار چاء لا کر میز پر رکھ گئے۔

"بہادر ایلیفنٹ گرل! چیراپ!" چند روز قبل لکھنؤ میں پنگی نے مندر مسجد کیس کی پیچیدگی سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

بہادری کی مختلف اقسام ہیں۔ اور متنوع محرّکات و مقاصد۔ ہم لوگوں کو اپنا سرمایہ اور جائیداد بچانے اور اسکے نقصانات سہنے کا حوصلہ درکار ہے۔ وہ سربکف لڑکیاں اور لڑکے جو باغی، انقلابی، چھاپہ مار اور مجاہد کہلاتے ہیں ہم انکی دلیری نہیں سمجھ پاتے۔ انکا مقابلہ کرتے پولس اور فوج کے جوان بھی کتنی بے خوفی سے موت کے منہ میں جاتے ہیں۔ "ڈیڈی میں ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

لیڈیز روم میں پہنچ کر دفعتاً پنگی کے نام خط آیا۔ ارشد ماموں تو چلے گئے۔ یہ پرچہ کسی کے ہاتھ نہ پڑ جائے۔ پرس سے نکال کر پھاڑا۔ صندل کا کیلنڈر ٹٹولا۔ محفوظ تھا۔ خط کے

پُرزے ٹوکری میں ڈال دیے۔ ابھی گھر پہنچ کر پنکی کو ٹرنک کال کرنا ہے صفیہ خالہ کے متعلق اپنی پروجیکٹ بھی سمجھا دونگی۔ کرسچین آیا "ملکہ کا بُت" بنی بیٹھی تھی۔ میم لوگ کے زمانے میں اسکی ماں اسی جگہ بیٹھتی تھی۔

اس نے مسکرا کر صاف تولیہ اور صابن پیش کیا۔

نیا صندل سوپ بھی لانچ کرنا چاہیئے۔

لاؤنج میں والد اسیطرح سر جھکائے فروکش تھے۔ بھائی کی موت کے بعد سے بے انتہا رقیق القلب ہو گئے تھے۔ پھر آبدیدہ ہوئے۔

"بک اپ ڈیڈ۔"

"بیشک۔ بیشک۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کل سویرے ہی جاتا ہوں۔ چکر ورتی بھی چل رہا ہے۔"

"میں بھی۔"

"تم — ؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"کیا میں ہمیشہ کی نڈر جنگل گرل نہیں ہوں ؟"

"ٹھیک ہے۔ لیکن تم یہاں اپنی ماں کے پاس رہو گی۔"

"میں تو گھر پہنچتے ہی پنکی کو فون کرتی ہوں کہ جا رہی ہوں۔ علاوہ ازیں ہری کہتا ہے حالات بہتر ہیں۔ یہ دیکھئے۔" تار سرکایا۔

"اگر پنکی اجازت دے۔ تم اس صالح نوجوان سے منسوب ہو چکی ہو۔"

"پنکی۔ ؟ یہ کیا دقیانوسیت ہے پوپ۔ ؟ کیا اپنے ٹھیکوں کے سلسلے میں وہ صالح نوجوان مجھ سے پوچھ کر آتا جاتا ہے ؟ میں تو مڈل ایسٹ کی خوشبو مارکیٹ اسٹڈی کرنے بھی جاؤں گی۔"

"ڈاٹر ابھی سے دار پا تھ پر نہ چلو۔ رومیلا بوس کی خودسری کا انجام دیکھ چکی ہو۔" پھر جیب سے رومال نکالا۔

چاء ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ستّار ہزی ہیہ کے حقہ بردار کی سی وفاداری اور فکرمندی کے ساتھ دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ لیلے نے پکارا۔ فوراً اندر آئے۔ چاء دانی اٹھا کر لے گئے۔

روشن کمروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ آزادی کے بعد سے "کلکتہ سیزن" کی رونق دوبالا ہو چکی تھی۔ متنوع ذرائع تفریح کی بہتات اور فائیو اسٹار الیکٹرونک کلچر کے غلبے کے باوجود، سابق یوروپین کلبوں کی رُکنیت نئے امیروں کے لیے دلکش اور اہم تھی۔ شیخ طاہر علی تمدّن کے باقیماندہ خصوصی حصار دیا پردیشیوں کی یلغار سے بھی نالاں تھے۔ لیکن اسوقت انکی تشویش اور رنج کی وجوہات قطعی مختلف تھیں۔

چند منٹ بعد انہوں نے سر اٹھایا۔

"ڈاٹر۔ تم سے ایک بات کہنا ہے۔"

لیلے کا دل دھک سے رہ گیا۔ میری بحث سے خفا ہو گئے۔ اچھا اگر انڈپنڈنٹ ہی رہنا چاہتی ہو رہو۔ بطور سزا ارشاد ہو گا۔ عقد فی الحال ملتوی۔ اپنی بہادری دکھاؤ اور کجلی بن کا خسارہ چندن بن سے پورا کرو۔

بیاہ تو بہرحال کچھ عرصے کے لیے ملتوی۔ کیا میں ایسے نازک حالات میں اپنی خوشی کی خاطر لکھنؤ چل دونگی۔

اور وہ تینوں لوفر جو بوڑھے باپ کو ان مسائل سے نپٹنے کے لیے اکیلا چھوڑ کر اپنی خوشی کی خاطر امریکہ سے چپکے بیٹھے ہیں ؟

لیکن بیٹیاں ہی تو ماں باپ کا ساتھ دیتی ہیں۔ میں بھی یہی کرونگی۔

"ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے دادا کو اپنے آبائی گاؤں ہی سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔" والد نے کہا۔

ٹالی گنج کلب میں یہ دادا کہاں سے آگئے۔ ٹنشن یکلخت کافور ہوا۔ ہنسی آئی۔

"دیکھو ہمارے اجداد اپنے دیہات میں جیے۔ وہیں مرے۔ کیا سُکھ چین کی زندگیاں بتائیں۔ اور عورتیں بھی انکی سب فرمانبردار پردے میں محفوظ"
لیلےٰ محبت سے مسکرائیں۔ گڈ اولڈ ڈیڈ۔

"نجانے ہمارے کونسے ناعاقبت اندیش بزرگ تھے جنہوں نے شہروں کا رخ کیا"
"شیخ عبدالرحیم!"
"اوہو ڈاٹر۔ تم تو بہت جان گئی ہو"
"دِکی ماموں نے بتایا۔ ایک پریشان حال آدمی شیخ عبدالرحیم بجنور سے چل کر قسمت آزمائی کے لیے اکبر کے دربار میں پہنچ گئے تھے۔ اکبر نے انکو صوبیدار اودھ بنا دیا"
"پھر دیکھو اولاد کا کیا حشر ہوا۔ ارے نہ چھوڑتے بجنور۔ انکے علاوہ بھی۔ کون گاؤں قصبے سے نکلتا تھا"
"کیوں؟ لوگ باگ پردیس نہیں جاتے تھے؟ بغرض تجارت۔ دیبا و حریر خوشبویات۔ صندل۔ مصالحے۔ گولکنڈہ کے ہیرے۔! اور مہم جوئی الگ۔!"
"پھر انکو طے کرنے پڑتے تھے ہفت خواں"
"اور لشکر لے کر بادشاہ ——!"
"یہی تو غضب ہوا ڈاٹر۔ فوجیں لیکر فتوحات کے لیے چل پڑے۔ بہت بُرا ہوا"
ڈیڈی اسوقت سخت قنوطی ہورہے ہیں۔ ہونا بھی چاہیئے۔
"اور ہمارے بزرگ سقوط لکھنؤ کے بعد کُرسی جا بسے ارے اسی گوشہ عافیت میں بیٹھے رہتے"
"ڈیڈی۔ پنکی کہہ رہے تھے کُرسی میں بیوقوف بستے ہیں۔ آپ بھی آئندہ یہ بات کسی کو بتلائیے گا نہیں"
شیخ صاحب نے مسکرا کر بیٹی کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ "پنکی —— بچی! ہم بہت جلد

تمہیں مستقل طور پر لکھنؤ بھیجنے کا انتظام کرتے ہیں۔ اور پنکی کو یہ بھی بتلا دینا کہ عبدالحلیم شرر کرسی کے شیخ زادے تھے"
"او۔ کے"
"اور ہمیشہ پرویز مرزا سلمۂ کی تابعداری کرنا۔ تم رومیلا بوس ——
ارے بھئی ستار ——"
"حضور"
"تم اپنا گاؤں چھوڑ کر کیوں آئے؟"
"حضور ہم تو پیدا ہی کلکتے میں ہوتے تھے"
"تو غلط پیدا ہوتے تھے"
"ڈیڈ اب گھر چلیے"

وکٹوریہ میموریل باہر ایک سیڑھی پر متمکّن مشاہدہ عالم میں مصروف تھا۔
"گڈ نایٹ وِک" لیلےٰ نے کہا۔
پٹرسن کے صاحب لوگ والے کُتّے کی طرح جو کہ وہ تھا، اس نے اخلاقاً ہلکی سی 'بخ' کی۔

کلب کے طویل راستے پر موٹروں کی قطاریں۔ بڑھیا سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان "ہپی" اپنی گاڑی سے اترا۔ "نمستے شیخ صاحب۔ ہلو مس علی"
"ہلو چڈّہ" اس سے دو چار باتیں کرنے کے بعد وہ آگے بڑھے۔

ایک کار کی روشنی ایک قدیم درخت کے تنے پر پڑی۔ کار گذر گئی۔ شیخ صاحب ادھر لپکے۔
"ارے ارے ڈیڈ ادھر اندھیرے میں مت جائیے"

"۶ر فروری ۱۷۹۲ء" شیخ نے پڑھا۔ "یہ تحریر آج دکھلائی دی۔ کیا اکاس بیل میں چھپ گئی تھی؟ —— کوئی مردود فوجی افسر رہا ہوگا —— کلکتہ تھیٹر سے لوٹتے ہوئے ادھر سے گذرا چاقو سے یہ ——"

"کرنل ٹالی اور اپنا ماریا ٹالی —— ؟" ان سرسراتے اندھیرے درختوں کے نیچے کھڑے ہوتے اچانک یاد آیا۔ قمر شیریں میں فلی سے کہا تھا ہم کلکتے کے قدیم انگریز بھوتوں کے عادی ہیں!

"۔۔ زوری ۱۷۹۲ء" شیخ صاحب نے دہرایا۔ "فتح سرنگاپٹم کی پہلی سالگرہ۔ بڑے جشن منائے گئے کلکتہ تھیٹر میں۔ بال۔ ضیافت۔ ایسا چراغاں کہ نیٹو خلقت دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑی۔"

"نیٹو خلقت بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ شاید ہمیشہ سے۔"

"کمپنی کے جھنڈوں کے نیچے ٹیپو کا پرچم سرنگوں کیا گیا تھا، تمام لیڈیز نے ساٹن کے سفید گاؤن پہنے۔ ان پر بھی ۶ر فروری ۱۷۹۲ کاڑھا گیا تھا —— اور لارڈ کارنوالس کے ساتھ ہز ہائی نس نواب سعادت علیخان بھی جشن میں شریک ہوتے۔ بطور چمچہ۔"

لیلے مسکرائی "وہ کون تھے؟"

"چمچے۔ ہائے۔ ہائے۔ ٹوڈی بچہ ہائے۔ ہائے۔"

اسوقت بیحد مضطرب ہیں۔ شام سے بیٹھے لگاتار پی رہے تھے۔

"ہندوستان جنت نشان کے مسلمان حکراں ٹیپو کے خلاف انگریزوں سے مل گئے۔ ڈاٹر۔ اس ملک کی تاریخ کا تاریک ترین دن کون سا تھا؟ —— ۶ر مئی ۱۷۹۹ء۔" رومال سے ناک پونچھی۔

چند موٹریں پاس سے گذریں۔

"کرنل مک ڈاول نے شمشیر علیحدہ کی۔ کرنل والٹن نے جیبی گھڑی —— دوربین جسے لیکر وہ غازی میدان جنگ میں گیا تھا۔ اور ایک جڑاؤ میڈیلین —— اس پر اسد اللہ الغالب کندہ تھا۔"

"مرزا غالب؟"

"نہیں۔ بیوقوف۔ حضرت علیؓ شیر خدا کا لقب ہے۔ اور سونے کی موٹھ والی چھڑی اور کلغی اور جواہرات اور جڑاؤ بروچ اس فوجی افسر نے محل سے لوٹے۔ اور انگوٹھڑوا کر اپنی بیوی اور بیٹی کے زیور بنواتے۔ اسکا نادر کتب خانہ لوٹا۔ سب لندن لے گئے۔ سُنو۔ وہ اپنی کتابیں انتہائی احتیاط سے صندوقوں میں رکھتا تھا۔"

کلب سے پیانو کی آواز بلند ہوئی ——

"اور محل سے انہیں ایک آرگن باجہ ملا۔ جس میں ایک یورپین کو ایک شیر نے زیر کر رکھا تھا اور اسے بجاؤ تو شیر کی گرج اور فرنگی کے کراہنے کی آواز نکلتی تھی۔" طاہر علی کی آواز آرگن کے گمبھیر نیچے سُروں کے مانند سنائی دی اور کلب کے پیانو میں کھو گئی۔

"لندن کے میوزیم میں یہ ساری چیزیں دیکھی ہیں۔ ویری سیڈ —— لیکن ڈیڈی۔ کس حکمراں کو مرنے کے بعد اتنی عقیدت اور محبت ملی ہے؟ ہزارہا تو کرناٹکی ہندو دیہاتی روزانہ ان کے مزار پر نذریں چڑھاتا اور منتیں مانتا ہے۔"

"ولی تھا۔ جو خواب دیکھتا تھا۔ صبح کو قلمبند کرتا تھا۔ مع شب و تاریخ۔ اوپر لکھتا تھا یا کریم۔ یا کارساز۔ یا حافظ۔ اس احتیاط سے لکھتا تھا خواب نامہ کوئی دیکھ نہ لے۔ مقفل رکھتا تھا۔ اور سوتے میں بھی جنگ کے نقشے بناتا تھا اور انگریزوں کو شکست دیتا۔ اور حضورؐ کو اکثر دیکھتا تھا اور حضرت علیؓ کو ——

"اور ہفت خواجگان خرقہ پوش کو۔ سب کے نام اس نے لکھے ــــ خواجہ یوسف ہمدانی۔ خواجہ بایزید بسطامی۔ خواجہ ابوالحسن خرقانی۔ خواجہ بہاءالدین نقشبندی خواجہ ــــ"

"ڈیڈی سُنیے ــــ"

"ہیبر بینٹسن نے اسکی فرانسیسی رائیٹنگ ٹیبل کی دراز توڑی۔ خواب نامہ ہاتھ لگا۔ کورٹ اف ڈائریکٹرز کے چیرمین کو بھیجدیا ــــ یہ حیرت انگیز ڈائری ارسالِ خدمت ہے۔ ٹیپو سلطان رات کو سوتے میں بھی ہم سے لڑتا تھا ــــ"

وہ ٹہلتے ہوتے اپنی مارُوتی کے قریب پہنچ گئے۔

"ٹیپو اور غلام محمد دو علامتیں ہیں ــــ" انھوں نے اعلان کیا۔ "ہندوستان کی ملٹری سوسائٹی کی شکست اور برٹش کمرشل ازم کی جیت۔" بنچ پر بیٹھ گئے۔

"غلام محمد روحِ عصر کو پہچان گیا۔ اور فاتحین کی تجارتی ایمپائر میں شامل ہوا۔ وہ ہندوستان کے اولین 'YUPPIES' میں سے تھا۔ گویا آج کا ارب پتی!

لاکھ۔ کروڑ۔ ارب۔ کھرب۔ سنکھ۔ مہاسنکھ۔ پدم۔ مہاپدم۔

ایک القاموس والیاڈوشس کے محل کا ٹھیکہ مل جائے تو پرویز اینڈ فرہاد اس میں فرنچ پرفیوم کی نہریں بنوائیں۔ میں صندل کے فرش۔ یاکریم۔ یا کارساز۔

"ٹیپو سلطان یونیورسٹی۔ کتنے ٹکنیکل کالج۔ اس ٹرسٹ سے بنتے۔"

والدصاحب اس وقت مولنا حالیؔ ہورہے ہیں۔

"لیکن ڈارلنگ۔ ہم ایسے آؤٹ آف کیریکٹر کام کیوں کریں گے۔ ہم رکشا کھینچنے کا ماحول تخلیق کریں گے۔ بس اس کے مزار کو درگاہ بنادیا ــــ"

"پوپ۔ شہلا اپی کہتی ہیں ترکے کے مناقشوں میں غیر مصدقہ عقد کی شق اکثر نکالی جاتی ہے۔ اسی بنا پر ہم بھی تو اپنا چھوٹا سا کیس جیت گئے! اور محض جائداد کیوں ابا جان ــــ ملکوں، دریاؤں، پہاڑوں، برفستانوں کے بٹوارے میں کون کتنا مستحق ہے یا نہیں ہے۔ آپ کو حضرت رابعہ بصریؒ کا واقعہ یاد ہے؟"

"نہیں مخدومہ۔ تمھیں ارشاد کرو۔"

"وکی ماموں راوی ہیں کہ رابعہ بصریؒ نے ایک درہم ایک آدمی کو دیا کہ بازار سے ان کے لیے چادر خرید لائے۔ وہ کچھ دور جاکر لوٹ آیا اور پوچھا ــــ کس رنگ کی؟

"انھوں نے سکہ واپس لے کر دجلہ میں پھینک دیا اور کہنے لگیں ــــ بس ــــ ملکیت کا خیال آتے ہی تفریق پیدا ہوگئی؟"

شیخ طاہر علی کچھ دیر سوچا کیے۔ پھر بولے۔ "وکی میاں تو یوٹوپیا میں رہتے ہیں۔ تم بھی اپنا پاسپورٹ گنگا میں پھینک دو۔"

"باباجانوف۔ آپ کی نفاق پسند ملّتِ بیضا نے تو دیوبند میں دو دارالعلوم بنالیے۔ بلکہ دو دارالعلوم بنالیا۔ بقول ارشد ماموں۔ ان کے سلسلے میں مجھے فوراً سے پیشتر لکھنؤ ٹرنک کال کرنا ہے۔ خفیہ۔ آپ کو نہیں بتلاؤنگی ننا امی کو۔ یہ عبدالمجید کہاں غائب ہوگئے ــــ"

"تم بہت پڑھے لکھے مسلم نوجوان یا لفٹسٹ ہوجاتے ہو یا ملت سے بالکل بے تعلق یا کٹرپنتھی ــــ"

"جی ۔ اور شکاگو شریف کے ٹرپ ۔ یہ سب روحِ عصر ہے ابا حضور۔"

"درمیانی راستہ تم لوگوں کو سجھائی ہی نہیں دیتا۔" پھر ٹہلنے لگے ــــ رُک کر بہت زور سے چلاّتے "یا حافظ ــ یا کریم ــ یا کارساز۔"

ازسرِنو تقریر شروع کی ــــ

"۷۳ء سے آج تک کیرالا میں گلف کی آمدنی سے بے شمار 'دینار ہاؤس' اور ہزاروں ہزار نئی مسجدیں بن گئیں ۔ ان میں کتنی سہ منزلہ اور ایرکنڈیشنڈ ۔ برائے حق العباد شفاخانے اور مدرسے بھی اگر ــ"

"پوپ ۔ آپ قمر چچا مرحوم کی طرح سیاست میں آجائیے ۔ لیکن آپ لیڈر بن بھی گئے تو سی ۔ پی ۔ ایم تو ظاہر ہے جوائن کرینگے نہیں ۔ آپ بھی ہندوستان کے بہت سے مسلم لیڈروں کی طرح موجودہ سچویشن برقرار رکھنا چاہیں گے ۔ ورنہ آپکی قیادت خطرے میں پڑ جائے گی ۔ کلچر کو بھدرا لوگ کی میراث کس نے بنایا ہے ؟"

"ہم دیکھتے ہیں ڈاٹر کہ تم پر پنکی مرزا کے علاوہ انکے ماموں وِکی کا بھی کافی اثر ہوگیا ہے ۔ اور تم اردو بھی بہت اچھی بولنے لگی ہو !"

"شکریہ ۔ ابا حضور !"

خوب ہنسے، آنسو پونچھ کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ "عبدالمجید شاید عشاء پڑھنے چلے گئے ــ" چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "زندہ ہے ملت بیضا ــ ہم کلب جاتے ہیں وہ مسجد ۔ لگتا ہے اکبر نے میرے لیے ہی کہا تھا ــ کیسی نماز بال میں ناچو جنابِ شیخ !"

"ایک اور کشمکش پوپ ؟ آپ ہی نے تینوں لڑکے مغرب پہنچائے ۔ انکو دیوبند کیوں نہ بھیجا ؟"

"بیشک ۔ بیشک ۔ اگر وہ امریکہ سے نہ لوٹے تو میرے بعد اس پگوڈا اٹری کو جھاڑتے رہنے کی مختارِ کُل تم ہوگی ۔ اس پر باغیوں کا قبضہ تم کو سچے دل سے مسرور کرے گا ؟ یا زیڈ روز بستی والوں سے واپس نہ لی جائے ؟"

"پنکی نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا۔"

"تم نے کیا کہا ؟"

"ڈیڈ بہت سے بنیادی سوالات ایسے ہیں جنکا جواب دینے سے ہم عمر بھر بچتے رہتے ہیں ۔ میں ابھی سے آپکو کیا بتا سکتی ہوں ؟"

عبدالمجید ڈرائیور بھاگتے ہوئے مسجد ٹیپو سلطان سے واپس آئے ۔

ٹالی گنج انڈر گراونڈ اسٹیشن کی بیرونی شو ونڈو کے سامنے پرانے اوورکوٹ اور بدرنگ اسکارف میں ملفوف ایک "دیکیل کٹا ہاف کاسٹ" ضعیفہ چُپ چاپ کھڑی تھی ۔ اس نے اپنا سُوکھا جھرخ سفید ہاتھ پلیٹ گلاس دیوار پر رکھا ہوا تھا اور وہ اندر سجی برائے فروخت جدید ترین بنگالی تجریدی تصاویر کو حیرت سے دیکھ رہی تھی ۔ یا شاید کہیں اور دیکھ رہی تھی ۔ وہ بوڑھی یوریشین عورت بھی اس پکچریسک برطانوی دور کی بچی کھچی یادگار تھی جسکی نقاشی نئے بنگالی مصوّروں نے اتنی چابکدستی سے اسپلینیڈ میٹرو کی سرنگ میں کی تھی ۔ پارک کے روشن گلوب فضائی آلودگی سے بوجھل دھندلکے میں زیادہ پیلے معلوم ہو رہے تھے ۔

لیک پر کہرہ تیرنے لگا ۔ سارا کلکتہ شہر بھانت بھانت کی فضائی اور ذہنی کثافتوں سے زرد ہوگیا ۔

بنت الجبل (۱۴)

چودھویں کی رات - پورنماشی - بدر کامل -
سرو کے درختوں میں سے جھانکتا چاند نقلی مخمل پر چھپا وہ رومینٹک منظر معلوم ہو رہا تھا جسے شوقین لوگ مڈل ایسٹ سے لا کر اپنی دیواروں پر سجاتے ہیں -

صفیہ سلطان اسکول کے سنسان برآمدے میں ٹہل رہی تھیں - ڈیسک بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے تھے - دو شفٹ کلاسوں کے لگتے تھے پھر بھی اب گنجائش باقی نہیں تھی اور درخواستیں تھیں کہ وزیروں کی سفارش کے ساتھ آئے چلی جاتی تھیں - صفیہ سینٹ صوفیہ کانونٹ کی ایک شاخ اب ڈالی باغ میں قائم کرنے والی تھیں - کوٹھی کرائے پر لے لی تھی - ریڈ روز کا معاملہ کھٹائی میں نہ پڑتا تو وہاں انکے سینٹ روز اکنڈرگارٹن کی دیواریں اٹھ گئی ہوتیں - آج صبح انہوں نے ڈالی باغ والے اسکول کا سائن بورڈ لکھوانے کے لیے پینٹر بلوایا تھا لیکن اس کے لیے نام نہیں سوچ پائی تھیں -

عوامی محاورے بہت دیرپا ہوتے ہیں - برطانوی دور کے کانونٹ اسکول چلانے والی فرنگی راہبات کو خلقت بھگتن پکارتی تھی اور انکے کانونٹ "بھگتن اسکول" - آزادی کے بعد کھلنے والے جعلی کانونٹ بھی عوام کے لیے بھگتن اسکول ہی رہے - جسطرح دیسی گورنروں اور انکی بیویوں کو گورنمنٹ ہاؤس کا عملہ اب بھی لاٹ صاحب اور لیڈی صاحب ہی پکارتا تھا -

توصفیہ سلطان بھی ایک سخت گیر مدر سپیریر سے کیا کم تھیں - مگر کل رجسٹریشن

بھی کروانا تھا اور اس کے لیے نئے بھگتن اسکول کا نام سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا -
بہن بھائیوں یا انکی اولاد سے کسی تعاون کی امید بیکار تھی — وہ تو "سینٹ صوفیہ کانونٹ" ہی سے بے طرح جھینپتے تھے - انہوں نے صفیہ کو انکے حال پر چھوڑ دیا تھا - کان کا علاج نہ کروائے وہ تو وہی گھاٹے میں رہی تھیں -

خیر میرے ایسے لوگوں کی زندگی بھی کٹ ہی جاتی ہے - لکھنوی طرز کی اونچی محراب والی برساتی کی چھت پر جا کر انہوں نے سامنے نگاہ دوڑائی - تیز چاندنی میں ڈوبا مانوس منظر - باغات - موتی محل کا سفید گنبد - گومتی -
ناک کے عین نیچے وِکی میاں اور شہلا کی موٹریں کھڑی تھیں - اسی پھاٹک سے گذرتی بیلا اور چاندنی کی رکشا اندر آئی تھی - بتاشے نے بے بضاعت مہمان کا اسباب اتار کر باہر ہی پڑا رہنے دیا تھا -

"بٹیا" نُورن نے اوپر آکر سلسلہ خیالات منتشر کر دیا - "بشیر پینٹر بہت دیر سے آئے بیٹھے ہیں -"
"اب آتے ہیں آدھی رات کو؟ کل سویرے ہی ڈالی باغ جا کر بورڈ لگوانا ہے -"
"صبح آتے تھے - آپ نے کہا سانجھ کو آؤ -"
"اچھا - خیر - ٹھیک ہے - ابھی بلاتے ہیں -"

نُورن واپس گئیں - صفیہ سنگی بالکنی میں جا کھڑی ہوئیں - رومن کیتھولک سینٹ ابتک تو تقریباً سارے ہی دوسرے پرائیوٹ اسکولوں نے اُچک لیے - ابھی پروین باجی نے بتلایا لاہور میں ایک گلنار کانونٹ اینڈ اکیڈمی کھل گئی ہے ایک سن جوزف اسکول - سن یعنی سورج - کمال ہے - اس روز بیلا اسی بات پر کیسے طنز سے ہنسی تھی -

ہم لوگ امّاں کے کمرے میں جمع تھے۔ چاندنی کو کم حیثیت سمجھ کر پیڑھی پر بٹھالا۔ بیلا نے چاندنی کو ایک دوبار مُونی ــــ مُونی بھی پکارا تھا ــــ امّاں نے پوچھا بھلا یہ مُونی کون نام ہے ــــ

مُونی ــ مونا ــــ سانتا مونیکا۔

فیروزہ نے ایک دفعہ سانتا مونیکا کیلی فورنیا سے پکچر پوسٹ کارڈ بھیجا تھا۔

وہ اجنبی، غیر اہم، مہمل سی لڑکی تین مہینے اس گھر میں مہمان رہی۔

کون کسکا مہمان تھا ؟

وہ کیسی لڑکی تھی۔ نادار۔ بے خانماں۔ حیرت زدہ۔ نیپالی سے چہرے والی۔ موٹی عینک لگائے۔ مشین پر جھکی تیزی سے ہینڈل گھماتی۔ یا انگنائی کے نل پر بیٹھی وضو کرتی۔ اسکے یہی دو کام تھے ــــ سلائی۔ اور نماز۔

سفید پلاسٹک کی چوڑیاں۔ گلابی ربر کے چپل۔ موٹی جھوٹی ساریاں۔ معمولی کالی شال۔

جیسے دھوبن چڑیا۔ جیسے جاڑے آتے ہیں تو کھر۔ نیچا پہاڑ سے اتر آتا ہے۔ اور پھر اُڑ جاتا ہے۔

اسے کس نے یہاں بھیجا تھا ؟ وہ ایبرڈ سی لڑکی۔ لایعنی زندگی۔ مہمل موت۔ تو بھلا موت بامعنی کب ہوتی ہے ؟

وہ تھی کون ؟

بنت الجبل۔ پہاڑوں کی طرف سے آئی تھی۔

بنت الجبل ــــ یعنی عظیم دکھ۔ مصیبت۔ کرب و بلا۔

بنت الجبل ــــ یعنی آواز بازگشت۔

وہ کاہے کی آواز بازگشت تھی ؟

ندائے کوہسار۔

وہ بھولی سی پہاڑی لڑکی۔ خاموش۔ ذہین۔ بردبار۔ اور جب ہنستی تھی تو بچّوں کی طرح ہنستی تھی۔ کتنی مظلوم اور ستم رسیدہ اور کیسی صابر و شاکر۔

سینٹ چاندنی ــــ سینٹ مُونی ــــ سینٹ مُونیز کانونٹ۔ ڈالی باغ۔

"نُورن ــــ" زور سے پکارا۔ "پینٹر کو بھیجو۔"

"آداب۔ بٹیا صاحب۔"

صفیہ نے سر ہلکا سا خم کر کے گویا سلام کا جواب دیا۔ جو بڑے لوگوں کا قاعدہ ہے۔ "وہ بورڈ اٹھا لیجیے۔ ہم لکھ کر دیتے ہیں۔"

بشیر پینٹر نے کرمچ کے بیگ سے سفید روغن اور برش نکالے۔ بلب کے نیچے اکڑوں بیٹھ گئے۔

صفیہ نے ایک ڈیسک میں سے پنسل برآمد کی۔ کاغذ پر جلی حروف میں لکھا ــــ

ST. MOONIE'S CONVENT, DALI BAGH

"بٹیا ــــ گھر سے تیار کر کے کل سویرے لے آویں ؟"

"ٹھیک ہے۔"

وہ بورڈ اور بیگ اٹھا کر زینے سے اتر گئے۔

اب مجھے آخر کار چاندنی بیگم سے ریلیشن حاصل ہو گیا۔ آزادی۔ چھٹکارا۔ اطمنان کی گہری سانس لی۔ پھر جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئیں۔ بہت دنوں سے آواز بھی سنائی نہیں دی۔ پگلی کا تجزیہ۔ ڈاکٹر کی تشخیص سب سو فیصدی درست۔ محض خفقان۔ مراق۔ تحت الشعور کی شرارت۔

وہ نیچے جانے کے لئے زینے کی سمت بڑھیں۔ دفعتاً "آواز" نے کہا ۔

"السلام علیکم !"

دم بخود —— سیڑھیوں پر پہنچیں۔ نیچے اندھیرا تھا۔

زینہ اس طور سے طے کیا — گویا اندھے کنویں میں اترتی ہوں۔ گیلری میں سے گذریں۔ شہلا کے دفتر میں تیز روشنی نظر آئی۔ وہ کامیاب اور مطمئن بیرسٹر حسبِ معمول اپنے موکلوں سے بات چیت میں مشغول تھی۔

پچھلے برآمدے میں پہنچ کر صفیہ انگنائی میں آئیں۔ کونے میں نلکا ٹپکے جا رہا تھا جس کے کنارے بیٹھ کر چاندنی وضو کرتی تھی۔ ہرے خوشبودار پتوں میں چھپے امرود چاندنی میں چمکے۔ جیسے کسی بچے نے شوخ ہرے اور زرد رنگوں سے تصویر بنائی ہو۔ الف سے امرود۔ ب سے بیلا۔ چ سے چاندنی،

نل ٹپکے ہی چلا جا رہا ہے۔ کل مستری بلوانا چاہیے۔

ماماؤں کا دالان مسمار کروا کے وِکی میاں نے اپنے بڑے لڑکے ٹونی کے لیے ایک خوبصورت کاٹیج بنوالیا تھا۔ الاچی خانم، بتاشن بُوا، وزیرن مر گئیں۔ خوش قدم بُوا اور سونا کلی اوپر اسکول کے ایک کمرے میں سوتی تھیں۔ نورن اپنے شوہر بتاشے کے ساتھ باہر سکونت پذیر تھی۔

صفیہ آہستہ آہستہ ڈیوڑھی کی جانب بڑھیں۔ اسی میں سے نکل کر میگی زنجوں کے ساتھ بھاگ نکلی تھیں۔

””دروازہ بند ہے۔“ لِٹل سر ایکو نے اطلاع دی۔ چند قدم اور چلیں۔

”منع کر رہے ہیں۔“ سر ایکو نے پھر کہا۔ ”دروازہ بند ہے۔“

ڈیوڑھی میں پہنچیں۔ کائی آلود دیواروں کی دراڑیں سرسوں اور پیپل کے چند تر و تازہ ہرے پودے اُگ آئے تھے۔ بھاری سیاہ پرانے کواڑوں میں تالہ پڑا تھا۔ بہادری سے مسکرائیں۔ پیش گوئی محض اس دروازے ہی کے لیے تھی۔ میں کون سا اس میں سے نکل کر فرار ہونے والی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس جا کر ٹیبل لیمپ جلایا۔ ڈالی باغ اسکول کا نیا نویلا

رجسٹر نکال کر بیٹھ گئیں۔ دریچہ باہر کے رُخ پر کھلتا تھا۔ برساتی میں ایک موٹر اسٹارٹ ہوئی۔

ایک موکل تو روانہ ہوتے۔ ایک ابھی موجود تھے۔ کیونکہ شہلا دفتر سے ابھی نہیں نکلی تھیں۔

اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے صفیہ سارے گھر والوں کی حرکات و سکنات سے آگاہ رہتی تھیں۔ کوئی دروازہ بھڑ سے بند ہوا سمجھ لو زرینہ بجیا کا موُڈ خراب ہے وِکی کے قدموں کی چاپ۔ پنکی کی آمد و رروانگی۔ رانی دلہن کی کنجیوں کا چھناکا۔ انکے تینوں لڑکوں کی طوفانی رفتار۔ سلیمہ کی خوش خرامی۔ شہلا کی پھرتی —— نوکرانیوں کی چال۔ صفیہ کو سب پتہ رہتا تھا کون ان سے کتنے فاصلے پر ہے اور کیا کر رہا ہے۔

آج شام دو موکل آئے تھے۔ ایک تو چلے گئے۔ ایک ابھی موجود تھے یکلخت

””آواز“ نے کہا —— ”چھوٹے خالو۔“

سُن سی رہ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد اچانک اور خلافِ معمول شہلا انکے کمرے میں آئیں۔ عموماً اہلِ خانہ سے صفیہ کی ملاقات دن میں تین چار مرتبہ محض کھانے کی میز پر ہوتی تھی۔ سب اپنے اپنے کام میں جوتے مصروف تھے۔ وہ خود بھی تو اپنے اسکول میں لگی رہتی تھیں۔ بڑی بھانجی نے جھجکتے ہوئے مخاطب کیا۔

”چھوٹی خالہ ——“

””کہو۔“

””ذرا باہر چلی چلیے۔ ہمارے ایک نئے موکل سے مل لیجئے اور بتلائیے آپ کو کیسے لگتے ہیں۔“

آواز نے پھر دہرایا۔

چھوٹے خالو۔

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ اس شام بارہ دری میں بِنکی نے لیلٰے سے
یہی الفاظ تو کہے تھے جو انہوں نے سُن لیے تھے۔ کچھ تذبذب کے بعد کھڑی ہوئیں۔
بھانجی کے ساتھ چیمبر میں پہنچیں۔

ایک خوش پوش، گھنے کھچڑی بالوں والا خوبرو آدمی چرمی کرسی سے
اٹھا۔ تسلیم عرض کی۔

"چھوٹی خالہ۔ سید ارشد حسین۔ مسٹر طاہر علی سروش کے برادرِ نسبتی۔ یعنی
لیلٰے کے ماموں۔ آپکو معلوم ہے نا مندر مسجد کیس کی پیروی اب میں کر رہی ہوں۔
یہ اسی سلسلے میں یہاں آتے ہیں۔"

"تشریف رکھیے۔" ارشد حسین نے اسطرح کہا گویا وہ میزبان تھے اور یہ
مہمان۔ صفیہ کو انکی یہ خود اعتمادی بھی بھلی معلوم ہوئی۔ بیٹھ گئیں۔

"ارشد صاحب۔ ہماری خالہ ماہر تعلیم ہیں۔ ڈبل ایم اے اور پی ایچ ڈی۔"

"ہُوں ہُوں۔" ارشد حسین نے پایپ سمیت متبسّم ہنکارا بھرا۔

"خالہ آپ نے ایک ایم اے تو عربی میں کیا تھا اور دوسرا؟"

دفعتاً وہ چڑ گئیں۔ کیا میرا انٹرویو ہو رہا ہے۔ اور اس چھوکری کو یہ بھی معلوم
نہیں کہ خالہ نے دوسرا ایم اے کس مضمون میں کیا تھا؟ چہرے پر تکدّر کے آثار
نمایاں ہوئے۔ خاموش رہیں پھر بولیں۔ "یہ سب بتانے کی کیا ضرورت ہے بھئی۔"

"نہیں چھوٹی خالہ یہ کلکتے والے ہم لوگوں کو بیحد دقیانوسی تصوّر کرتے ہیں ——
یہاں آکر شوتوجیت رے ایک پرانی محلسرا دیکھنے گئے تھے اسکی بیگمات کو فراٹے
کی انگریزی بولتے سُن کر بہت حیران ہوتے۔ شاید ان کا خیال تھا، ہم لوگ ابھی
"شطرنج کے کھلاڑی" ہی چلے جا رہے ہیں —— ارشد صاحب ہماری خالہ نے
ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کیا ہے!"

"ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ یہ سینٹ صوفیہ اسکول آپ ہی کا ہے!"

یہ قطعاً غیر متوقع سچویشن تھی۔ خطرناک۔ انوکھی۔ اور اتنی ہی مضحکہ خیز بھی۔
خیر۔ آواز نے کچھ دیر قبل ہی انہیں اس خوشگوار صورت حال کا سامنا کرنے کیلئے
خبردار تو کر دیا تھا۔ تھینک یُو آواز۔ ہونٹوں پر خفیف سا تبسّم نمودار ہوا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ ہم بھی ارادہ کر رہے ہیں کہ اپنے فیکٹری ورکرز کے بچوں
کے لیے کانپور میں ایک اسکول کھولیں۔ آپ چل کر جگہ دیکھیے گا۔ آپکے مشورے
بہت قیمتی ثابت ہونگے۔"

"ضرور۔"

"ارے خالہ تو ایک کنڈرگارٹن بھی شروع کرنے والی ہیں۔ اور ایک انکا
اسکول ڈالی باغ میں کل ہی سے ——"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ مبارک ہو۔ ڈاکٹر صاحب۔ اسوقت ہمارے ساتھ
ڈنر کے لیے تشریف لے چلیے۔"

صفیہ نے گھبرا کر بھانجی کو دیکھا۔

"چلیے نا چھوٹی خالہ۔ ارشد صاحب کہہ رہے ہیں۔ ہم سب جائیں گے۔"

"وِکّی اور بجیا بھی؟"

"سب۔ بِنکی سیدھے کالٹن آجائیں گے۔ اللہ چلیے بھی میری اچھی چھوٹی خالہ!"
تو یہ ڈنر پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔

"اب آپ بھی جا کر جھٹ پٹ تیاری پکڑیے۔ سوری آپ کو پہلے نہیں
بتلایا ہم اور ارشد صاحب اس مقدمے کی بات میں لگ گئے تھے۔"

جب وہ کمرے سے باہر گئیں شہلا دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ
انکے گھسے ہوئے کولہاپوری چپلوں پر ارشد حسین کی نظر نہ پڑی ہو —— گونڈہ
بہرائچ کی ساری دھول اور کیچڑ میں اٹنے کے بعد بھی صفیہ نے ان چپلوں کو چھٹی
نہیں دی تھی۔

خالہ کی وفاداری اور دفاع میں کھسیانی ہنسی ہنس کر شہلا نے کہا۔ "اکیڈمیک لوگ اپنی ہی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں!"

"ہاں بھئی۔ یہ ایک مخصوص ٹائپ ہے۔ کوائٹ ڈیلائیٹ فُل ——"

"بس آپ انکو ڈاکٹر صاحب کہہ کر کبھی مخاطب نہ کیجئے گا۔"

"نہیں کریں گے۔ مگر کیوں؟"

"یہاں لوگوں نے 'ڈاکٹر صفیہ کا اسکول' پکارنا شروع کر دیا تھا —— جیسے 'ڈاکٹر سیفی کا منجن!' انہیں اور ہم سب کو بہت کوفت ہوئی —— علاوہ ازیں انکا کہنا ہے کہ آجکل پی۔ ایچ۔ ڈی ٹکے سیر ہو گئے ہیں۔"

"ڈاکٹر سیفی کا منجن —— ! ہا ہا ہا —— یا وہ 'پروفیسر سوندھی کا میرج بیورو۔ رشتے ہی رشتے'!"

"جی ہاں۔" شہلا خوب ہنسیں۔ "لیکن مجھے لگتا ہے انہیں اس رشتے کا آئیڈیا پسند آیا!"

"آئی ایم گلیڈ!! سمجھدار خاتون ہیں۔ بس لوگوں سے شاید کمیونی کیٹ نہیں کر سکتیں۔"

"رومیلا بوس تو اسی قسم کی نہیں تھیں؟"

"ارے نہیں بھئی۔ وہ بیحد باتونی تھیں۔ حالانکہ انہیں عرفان ذات ہو چکا تھا اور اس عرفان کے بعد انسان خاموشی اختیار کر لیتا ہے!"

"بغیر عرفان ذات ہی کے خالہ چُپ رہتی ہیں۔ البتہ ہمیں یقین ہے آپ کی ان سے خوب پٹے گی۔ انہیں ایک سچے غمخوار کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کو کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملی —— اچھا جناب والا۔ اب آپ ذرا بڑے ماموں کے پاس چل کر بیٹھئے۔ ہم امّی اور ممانی دلہن سے کہیں جلد تیار ہوں۔"

صفیہ اپنے ڈریسنگ روم میں آئیں۔ ابھی سناٹے میں تھیں ہاتھ پاؤں سرد۔

آواز نے اٹھائیس سال میں آج پہلی بار خوشخبری سنائی تھی

وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھ گئیں۔ یہ انکی والدہ کا جامہ خانہ تھا جو وہ اب خود استعمال کرتی تھیں۔ ان مخدومہ کا سامان اسیطرح موجود تھا۔ ایک نقشیں ڈیون پورٹ کے اوپر انکا ناگردان سجا ہوا تھا۔ اسکے اندر صفیہ وارڈروب کی کنجی رکھتی تھیں اٹھ کر وہ نکالی۔ یاد آیا انکے مرحوم ماموں نے مرنے سے پہلے انکے لیے "بہات" بھجوائی تھی۔ وہ سارے تحائف احتیاط سے گودام میں مقفل تھے۔

پھر مسکرائیں۔ الماری کھولی۔

کون سی ساری پہنیں۔

پردہ ہٹا۔ شہلا اندر آئیں۔

"چھوٹی خالہ —— کیسے لگے؟"

"خاصے۔"

"ارے بس خاصے۔؟ پہلے یہ بتلائیے آپکو پسند بھی آئے؟"

"ہاں آں —— ٹھیک ہیں۔"

"ٹھیک نہیں چھوٹی خالہ بہت اچھے ہیں۔ اور کمال دیکھیے اتنے نزدیک کانپور میں موجود لیکن کبھی یہاں ہم لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا ——"

"کرتے کیا ہیں؟"

"سروش صاحب کو مانک کھالا مسٹر ہاتھی والا کہتی ہیں تو یہ سمجھئے —— مسٹر گھوڑا والا۔ کانپور میں لیدر فیکٹری ہے۔ شہسواری کا ساز و سامان بنوا کر جرمنی اور کینیڈا بھیجتے ہیں۔"

"شادی ابتک کیوں نہ کی؟"

"ارے کی تھی۔" شہلا نے وارڈروب کے سامنے جا کر ساریوں کا جائزہ لیا۔ "بول میرج، ایک بنگالی آرٹسٹ سے۔ رومیلا بوس۔ وہ بقول مانک کھالا چٹانوں پر چلی گئی۔ طلاق۔ نو کِڈز —— لیجئے خالہ یہ وینکٹ گری پہن لیجئے۔ یہ والی ——

ہری۔ لال کنارا۔ بڑی آرٹسٹک ساری ہے۔ تمام ساریاں رکھے رکھے گل جائیں گی۔ آپ انہیں پہنتی کیوں نہیں؟ — جُوڑا ڈھیلا بنا لیجیے گا۔ ذرا ارشد صاحب پر رعب پڑے ہماری کتنی اسمارٹ خالہ ہیں۔ آپ بالکل ٹیچروں والا جُوڑا کس لیتی ہیں۔ تو آپکو اچھے لگے۔"

"ہاں۔"

"سب کو پسند آتے۔ بس آپ ہی سے پوچھنا باقی تھا۔"

"آداب عرض ہے۔ ہا ہا ہا —" ہلکا سا قہقہہ۔

سنگھار میز کا کنارا مضبوطی سے پکڑا۔

شہلا نے ایک ویلکٹ گرگابی نکال کر کرسی پر رکھی۔" اور اسکے ساتھ ہری شال۔ خدا کے لیے وہ اماں حوا کے دقتوں کا عنابی دوشالہ نہ اوڑھ لیجیے گا۔ امی بھی آپکو ٹوک چکی ہیں۔

"سب کو پسند آتے۔ چلیے شکر ہے آپ نے بھی اپرو کرلیا۔ لوبی ماموں سے ملوانے کل لے جاؤں گی۔ انکو کل فون کیا تھا۔ بہت خوش ہوتے۔ وہ تو دونوں شادیوں میں شرکت کے لیے بھی تیار ہیں۔"

"او ہو —! دوسری کس کی —؟"

"پنکی اور لیلے۔ آپکو تو معلوم ہے —! سنیے لوبی ماموں کو دو بار ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ اب آپ لوگ پرانی رنجشیں بھول کیوں نہیں جاتے؟ وِکی ماموں تو انکی عیادت کے لیے کئی بار جا چکے ہیں۔ " HUMAN LIFE IS SO SHORT

"یہ ڈسکوری تم نے آج کی۔"

"چھوٹے ماموں بے چارے کا بائی پاس بھی ہونے والا ہے۔"

"پوری زندگیاں ہی بائی پاس ہو جاتی ہیں۔"

یا اللہ۔ یہ تو بہت ہی زیادہ جھلی ہو گئی ہیں۔ اس وقت تک تو خیریت رہی۔ ڈنر پر ارشد صاحب سے خواہ مخواہ نہ الجھ پڑیں۔ وہ ایک جہاندیدہ اور ڈپلومیٹ آدمی — انکا مزاج فوراً ہی پہچان گئے۔

"اچھا اب ہم جا کر ممانی دلہن کو کھٹکھٹائیں۔ وہ سجنے میں بہت دیر لگاتی ہیں۔"

چوڑے کنارے کی ساؤتھ انڈین ساری۔ ڈھیلا جوڑا۔ گلے میں کندن کا جگنو۔ صفیہ سلطان نے قدِ آدم آئینے میں سراپا پر نظر ڈالی۔

اسکول کھولنے کا ارادہ ہے۔ آپکے مشورے بہت قیمتی —

بے بس، سرد طیش اور بے پناہ ندامت سے لرزتے ہوتے وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ ہرے سینڈلز دکھلائی پڑے جو شہلا انکے لیے نکال کر رکھ گئی تھیں۔ انکو ٹھوکر ماری۔ مزید انتقام کی غرض سے وہ بوسیدہ عنابی دوشالہ بھی اوڑھ لیا۔ جو ہمیشہ گھر والوں کے زیرِ بحث رہتا تھا۔ اور انکے بچپن میں انکے لیے خریدا گیا تھا۔ باہر نکلیں۔

سارے گھر میں اچانک بڑی گہما گہمی سی محسوس ہوئی۔ غالباً آج شام ہی شہلا نے سب کو بتلایا تھا۔ خادمائیں بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں۔ کواڑ کھلتے تھے۔ بند ہوتے تھے بند ہوتے تھے پھر کھلتے تھے۔ ہر طرف سے خوشبوؤں کی لپٹیں آرہی تھیں گویا زرینہ، رانی دلہن، شہلا، سلیمہ سب نے مل کر فرانسیسی عطریات کے کنٹر بہا دیے ہوں۔ نورن گنگناتی ہوئی برآمدے سے گذری۔ ڈرائنگ روم سے ارشد حسین اور وِکی میاں کے قہقہے بلند ہوتے۔ صفیہ اپنے کمرے میں جا کر دریچے میں کھڑی ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد شہلا کی کار روانہ ہوئی۔ ارشد حسین سامنے۔ سلیمہ، بی آور جی پچھلی سیٹ پر۔

صفیہ پھر گیلری میں آئیں۔

زرینہ اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں۔ اُودا ریشمیں غرارہ۔ پشمینے کی شال۔ چہرہ دلی مسرّت سے جگمگا رہا تھا۔ صفیہ پر نظر پڑی۔ ”ریڈی؟ شاباش! مگر پھر وہی بوسیدہ دوشالہ اوڑھ لیا۔ صفیہ۔ کچھ تو خیال کرو۔ غیر آدمی داماد بننے والا ہے۔ کیا سوچے گا۔ ایسی بھی کیا خِست ——— ایسا حلیہ نہ بناؤ کہ لوگ تم کو بالکل پیپل سے اُتری سمجھیں۔ ایں؟ اور کوئی شال نہیں ہے؟ لاؤ میں دیدوں ——— نورن ———“

”نہیں۔“ صفیہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

”ٹھیک ہے سر پہ دو سینگ بھی لگا لو اور فُل بُوٹ پہن لو۔ اچھا جاؤ۔ کار میں بیٹھ کر ہارن بجاؤ تبھی دلہن نکلیں گی۔“

صفیہ خاموشی سے برساتی کی طرف چل دیں۔

زرینہ نے بہار آرا بیگم کو پکارا۔ جن کی وِکّی سے شادی انکے گھر والوں کے لیے ایک معجزہ ہی تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ غریب ماں باپ نے پھولوں کا زیور پہنا کر وداع کیا تھا۔ نواسی کی رخصتی کے بعد الاچی خانم گاؤں سے واپس نہ آئی تھیں۔ انکے لیے پنشن مقرّر کر دی گئی تھی۔

اللہ کی قدرت!

نورن کو آواز دی۔ ”ارے رانی دُلہن کو بلاؤ بھئی۔“

”آتے ہیں بجیا۔“

باہر آئیں۔ بنفشئی غرارے کا جوڑا۔ شاہ توش کی شال۔ کانوں میں ہیرے کے بُندے۔ کلائیوں میں سرخ کانچ کی چوڑیاں۔

نند بھاوج در میں جا کھڑی ہوئیں۔

گھر کا بھیدی چاند سُن گن لینے کی خاطر سامنے آ گیا۔ زرینہ سلطانہ کی آنکھوں میں انبساط کے آنسو تھے انکو ایسا محسوس ہوا جیسے چاند نے مسرور شرارت سے انکو وِنک کیا

”تمہارے میاں کا سنگھار پٹار ختم نہیں ہوا؟“

رانی دلہن ہنسنے لگیں۔ ”دارجلنگ سے لیلےٰ بات کر رہی ہیں۔“

”او ہوا۔ جب سے میسور سے واپس گئی ہیں نہ خط نہ پتر۔ فون بھی آج کیا۔ پندرہ دن بعد۔ پنکی تک کو نہ لکھا۔“ زرینہ نے ابھی سے ساس والا رویّہ اختیار کر لیا تھا۔

سیاہ شیروانی، چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس وِکی میاں شاداں و فرحاں برآمدے میں آتے۔

”کیا ہوا ———؟“

”ارے بجیا ——— وہ لوگ دارجلنگ کی بدامنی کی وجہ سے بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ بیحد مالی نقصان ہوا۔ شکر ہے جانیں بچ گئیں۔“

”ارے تو اطلاع تو کرتے ———“

”لیلےٰ کہہ رہی تھیں انہوں نے دو آر زروانہ ہونے سے پہلے کلکتے میں رات کو کئی بار کوشش کی۔ لائن نہیں ملی۔ پھر انکے والد اپنے بیٹوں کو امریکہ ٹرنک کال کرنے میں جُٹ گئے۔ وہ تینوں مختلف شہروں میں رہتے ہیں۔ اب بہن کے بیاہ اور معاملات کی دیکھ بھال کے لیے تینوں فوراً واپس آ رہے ہیں۔“

”شکر ہے۔ اکیلی لڑکی ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔“ رانی دلہن نے کہا۔

”لیلےٰ نے بتلایا شورش کی وجہ سے وہ علاقہ بالکل کٹ آف ہو گیا تھا۔ ہم نے خوشخبری سنائی تو وہ بھونچکی۔“

”کچھ کہہ رہی تھیں؟“ زرینہ نے دریافت کیا۔

”بارہا پوچھا کس سے ———؟ کس سے؟ ہم نے چلّا کر شہلا کا نام بتایا۔ ایک تو لائنز خراب ——— اور شاید وہ متوقع نہیں تھیں۔ انکے ماموں اور شیلی دونوں کنفرمڈ قسم کے بیچلر اور یوں جھٹ پٹ فیصلہ۔ بس سمجھو کلک کر گئے۔ بجیا شاہ صاحب عجلت چاہتے ہیں۔

انکو جلد یوروپ جانا ہے۔ اب شیلی اور ننکی — آگے پیچھے دونوں کی تاریخیں۔"
باتیں کرتے کرتے وہ تینوں تخت پر بیٹھ گئے۔

صفیہ نے بیدلی سے ایک دو بار ہارن بجایا پھر کار کی کھڑکی سے لگ کر شب ماہ کے نظارے میں کھو گئیں۔

شہلا کے دفتر میں فون کی گھنٹی بجی ٹونی نے بات کی: "جی ہاں۔ شکریہ۔ جی بس فیملی اور فیملی فرینڈز۔ سب کارلٹن جا رہے ہیں وہیں تشریف لائیے۔ جی۔ میاں ابا ابھی پہنچتے ہیں —"

پچھلی سیٹ پر صفیہ آرام سے بیٹھ گئیں۔ پاؤں پھیلاتے۔ چپل اتارے۔ انگوٹھے ہلاتے۔ پھر چپل پہنے۔ فیملی اور فیملی فرینڈز۔ انگیجمنٹ ڈنر۔ ایک مہذب، نفیس، باضابطہ زندگی۔ باقاعدہ سماجی کارروائیاں۔ حد یہ ہے کہ وکی بھی کتنے ہوشمند ہو گئے۔ مقطع چقطع۔ "لڑکی" کے بزرگ اور سرپرست۔ ذمے دار۔ پابند وضع۔ "اسکوائیر"۔ صورت۔ آواز۔ لہجہ۔ قدموں کی چاپ وہی گمبھیر ہنکارا۔ ایکدم میاں ابا۔ انہی کیطرح برآمدے میں انہی کی آرام کرسی پر بیٹھ کر انتظامات کے لئے احکام صادر کریں گے۔

شہلا ارشد۔ ننکی لیلے۔ فیروزہ برائین۔

گو — فیروزہ آخر آخر میں گورے کے متعلق ذرا گو مگو —

پہلو بدلا۔ ناک کھجائی۔

لطف آ جاتے اگر ادھر سے پروین اطلاع دیں نور چشمی نے براتے ننکی مور لینڈ کو گڈ بائی کیا — اور یہاں پہنچ چکا ہو محمل لیلے۔ مزا آ جائے۔

ہا ہا ہا — آواز نے مدھم سا قہقہہ لگایا۔

ایک چنڈول بھی چلاتا ہوا اوپر سے گذرا۔

مزید راگ رنگ۔ عنقریب۔

ایک خشک ڈوڈ ڈروزٹپ سے رنگین چبوترے پر گرا۔ برساتی سے آویزاں اسکی بیل ہواہیں لرزی — دھوپ میں بیل کے زرد گلاب مرجھا کر پلائی ڈوڈ سے تراشے پھول معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کی قدرت۔ انکی بھی عجیب عجیب قدرتیں ہیں چوبیں گلاب وکی پکا پان ہو گئے مگر بناتات میں فلسفیانہ دلچسپی سدا بہار۔ خالی آدمی کیا کرے۔ فلسفے بگھارے — جبر و اختیار۔ فلانہ ڈھماکہ۔ آئیں بائیں شائیں۔

بجیا رخصت ہوئیں۔ پھر واپس آ گئیں۔ نہ جبر۔ نہ اختیار۔ محض خاوند کی ڈھٹائی۔

گڑھی سے وداع ہوتی تھیں۔ کیسی شان و شوکت کے ساتھ۔ بے چاری۔ پھاٹک پر اودھے۔ رتھ، چوڈولے۔ ہاتھی۔ مہمانوں کی بنٹیلے اور کون کون موٹر کاریں۔ نہ ان مہمانوں کے نام اب کسی کو یاد ہیں نہ انکی موٹروں کے۔ برٹش راج غائب۔ چیزیں غائب۔

ننکی کی گھوڑا چڑھائی۔ زرد جوڑا۔ شاہ میناؒ صاحب سلام کے لیے لے جاتے گئے۔
جلسہ — اسی چبوترے پر۔ بادی مہاراج کا رقص۔ اسوقت یہاں انگور کی بیل تھی۔

کیسا دور آیا کہ پروین کا عقد بذریعہ ٹرنک کال۔ دولہا کو این۔ او۔ سی۔ نہیں ملا۔ اس برساتی سے روتی بلکتی رخصت ہوئیں۔ چھنکی اور پارو نے انہی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر کا ہے کو بیاہی بدیس الاپا تو ہنسی پڑ گئی اب اسی برساتی میں پروین آ کر اترتی ہیں تو ایک مختلف ہستی۔

کیسی بدیس۔ ALL CHANGE AT THE NEXT STATION

لاوڈ اسپیکر پر انا ونسمنٹ متواتر جاری ہے۔

بوبی۔ ڈیر بوبی۔ کیسے بدے۔ MY BONNIE IS OVER THE
OCEAN, MY BONNIE IS OVER THE LEE,
BRING BACK, O BRING BACK, O BRING BACK
MY BONNIE — MY BOBBY TO ME
TO ME

ایک آنسو گرا۔ بھلنڈرے۔ محبت والے۔ لڑکپن میں تینوں بہنوں کو کیسی تفریحیں
کرواتے تھے۔ انگلش پکچرز۔ سیر سپاٹے۔ ہُو حق۔
ایک بار بسمل کی آرزو کی شوٹنگ دکھلانے بھی تو لے گئے تھے۔ اختری فیض آبادی۔
آئیڈیل فلمز۔ متصل اے۔ آئی۔ آر۔
اختری۔ اور انکے دور کی متھ بن گئی۔ قنبر علی کی بھی۔
دھیرے بہو ندیا۔ ہم تو اس پار نہ جا سکے۔ قنبر کی بھتیجی کیلئے صندل فروش ریڈ روز ز
روز ہاؤس سے رخصت ہو کر اس پار آ جائیں گی۔ شہلا آپی ـــــ آپ کی چھوٹی خالہ کا
ایگو بہت بڑا ہے ـــــ

میرا ایگو ـــــ ؟ میرا ـــــ ؟
ایک بڑا سا آنسو گود میں رکھے پرس پر ٹپکا ـــــ وُوڈ روز کی طرح۔
اس بیل کے زرد گلاب جیسا نازک پھول موسم تبدیل ہوتا ہے تو گل چوبیں بن جاتا ہے۔
نہیں بدلی تو بس صفیہ سلطانہ۔ وہی صوفیانہ رنگوں کی ساریاں۔ وہی مدرسہ۔ وہی
ٹائم ٹیبل۔ وہی اسٹاف۔ وضعداری ہو تو ایسی۔ شاباش۔
پیروں پر نگاہ کی۔ فل بوٹ۔ ناک میں بڑے کا بُلاق بطرز زُولو۔ سر پہ ناگا سینگ۔
وہ چھیلا چرما فروش پوستین پوش مجھے جو جاگر دیتا ہو نہ دے۔
ایکسنٹرک ـــــ ڈیم ایڈتھ سٹ ویل ـــــ دی کنگ آف چائناز ڈاٹر ـــــ
انڈر دی نٹ مگ ٹری۔
دور گجر بجا۔ سرما کی سست رفتار رات۔ شام سے اب تلک اتنا کچھ ہو گیا اور ابھی محض
دس بجا ہے۔ یہ لوگ اندر کیا مسکوٹ کر رہے ہیں۔ یہ مکان رازوں سے لبریز ہے ـــ گویا
اگلے وقتوں کا فری میسن لاج۔ عوام جسے جادو گھر پکارتے تھے۔ میاں ابا بھی فری میسن
تھے۔ یہ مکان بھیدوں سے پُر ہے۔ جیسے سیب سے لدے گھنے درختوں میں چھپی کوئی پرانی
پہاڑی خالی کوٹھی۔ یہ سب مشتبہ کیریکٹر ہیں ـــــ اب وہاں کینڈل لٹ ٹیٹ نائٹ

ڈنر ہو گا۔ پُوس کی ٹھنڈی رات میں پرچھائیوں سے معمور سرائے۔ اسکے اندر بھاری سلور اور
سُرخ گلابوں سے لدی میز پر گلگوں اجنبی چہرے ـــــ بٹوہ ایسی مانک باتی۔ فلی حزور
اپنا پارسی وگلہ پہن کر آیا ہو گا۔ خاص موقعوں پر پہنتا ہے۔ وگلہ۔
وگلے والی پلیٹن۔ دادامیاں کے زمانے میں ـــــ چھاؤنی محمد باغ۔
جنرل اور مسز کھنہ بھی ہونگے۔ اور کون کون جن سے بہت ہیل میل ہے۔ نرائن بخش سنگھ
خاندان۔ انعام علی والے۔ کمار چودھری لوگ۔ لاج کے گرینڈ ماسٹر کی صدارت کرینگے
کوئی میرا دوست نہیں۔
ماگھ کا خنک چاند آنکھوں میں اترا۔ شبنم آلود سرو سبزہ سراپا میں سرایت کر گیا۔ سرو کے
درخت بھی اندر موجود ہیں۔ سَر سَر سَر سَر ـــــ
ورکش کنیا۔
وِکی جب دیوانے مفکر شاعر تھے چاردن کی چاندنی کو چندر پربھا پکارتے۔ بشنی کانتا۔
مُون لائیٹ سوناٹا۔ "زوہنی ـــــ دیو مالا میں چندرماں دیوتا کی بی بی ـــــ" اس لڑکی کو سمجھاتے
جاتے۔ ان دنوں کادمبری پڑھ رہے تھے۔ تشبیہہ استعارے میں گفتگو کادمبری ہیم کوٹ سے
وترالاندی کے تٹ پر آتی تھی۔ چاندنی ہمالیہ سے ہماری ندی کے کنارے اترتی ہیں۔ ارے بھئی
صفیہ قاسم صاحب نے اپنی نئی کوٹھی کا نام ندی کنارے رکھ لیا۔ ڈیم گڈ۔ اچھا بھئی چاندنی بات
سنو۔ راجکمار چندر پیڈ چاند کا باسی تھا۔ ہم بھی مہتاب گزیدہ ہیں ـــــ
اور صفیہ بیگم تم مہا سوتیا دیوی کی طرح اچھود جھیل کے کنارے بیٹھی ہو۔
اور طوطے ہی طوطے۔
ـــــ مہا سوتیا دیوی تو کلکتے کی ایک لفٹسٹ رائیٹر ہیں۔
ـــــ نہیں۔ وہ مہا سوتیا دیوی جو اچھود جھیل کے کنارے بیٹھی ہے۔ یہ سب کادمبری
کے کیریکٹر جو ہیں یہ کوئی عجوبہ خیالی مخلوق تھوڑا ہی ہیں۔ ہم ہی لوگ ہیں۔ اور ہمارے اندر
کے طوطے۔ تمام کہانیاں یکساں ہیں صفیہ بیگم، سارے انسان اور انکے المیے ایک سے
ہیں مصیبت کرب و بلا مذہب اور قوم اور ملک اور زمانے کی تخصیص کر کے نہیں آتی۔

——میں مہاسوتیا دیوی جو اچھور جھیل کے کنارے بیٹھی ہوں جبکہ بیسویں صدی کے خاتمے میں تیرہ برس باقی ہیں، جب سالِ نو کے پہلے مہینے کی پچیسویں شام سارے طوطے اڑ گئے۔ اب سارا عالم بناتات وجمادات چرند پرند طیور و وحوش میرے اندر ہوں تو کیا اور ساری کائنات کھوپڑی میں گھس جاتے تو کیا۔ کھوپڑی میں محض ٹھنڈی مٹی گھستی ہے یا گرم راکھ۔ بھوبھل۔

سوئیٹ پی اور سورج مکھی اور گل داؤدی چھپکے پڑے رہے۔ آدھی رات کے راگ چندر کونس کے مانند چاند کی کرنیں مہتابی پر پھیلیں۔

وہ ہزارہا مہتابیاں سنگی جالی کے جنگلے والی وسط میں مسند پر بیگم، راجہ رانی۔ موسیقاروں سے چندر کونس سنتے ہیں۔ پیچھے کدم کے پتے اور رنگین چلمنوں والے سُبک دو منزلہ منقش مکان اور طاقوں میں گلدان اور حوض میں لال کنول اور سپید بط اور راجہ کے ہاتھ میں جام وسبو اور رانی کے ہاتھ میں پھول اور ڈومنیوں کے ہاتھ میں مجیرے اور طنبورا اور آب زر اور رنگوں میں انکا قصہ مختصر اور واضح تاوقتیکہ اسے دیمک نہ کھا جاتے اور اس مہتابی پر بیلا ڈومنی مہمانوں کی فرمائش پر بیلا پھولے آدھی رات گجرا ہیں —— گجرا ہیں —— کے کے —— کے کے —— دیمک —— چھپکلی —— بجّو کے —— گلے ڈاروں ——

چاندنی بھی اکثر اس چبوترے پر آن کر بیٹھتی تھی ٹھنگ کرتی۔ پاک صاف۔ ڈال سے ٹوٹی —— اتنی بڑی دنیا میں اسکا مان کون کرنے والا کوئی نہ تھا۔

آگ۔ ہوا۔ پانی۔ عناصر نے اسکا کتبہ لکھا۔

وِکی نے اپنا کتبہ بھی سوچ لیا "اچھا جناب۔ یہ بھی ہو گیا۔ اب اسکے بعد ——؟"

لاجواب۔ وِکی جو بات کرینگے انوکھی۔

اور شہلا بیگم کا ——؟ "می لارڈ۔ اب میں اپنا بریف پیش کرتی ہوں۔"

سیّد ارشد حسین ——؟ "گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔"

اسکول کا نام سوچنے کے چکر میں آج مغرب کے وقت استغفار کی تسبیح بھی رہ گئی۔ توبہ استغفار۔ توبہ استغفار۔ استغفراللہ ربی —— انگلیوں پر گِن لوں۔

یکلخت ——

سیاہ ساری میں ملبوس، آنچل سے سر ڈھانپے سپید صورت والی ایک عورت، چینی کی مورت، چاندنی میں چمکتے چبوترے پر نمودار ہوئی۔ جھک کر ایک ووڈ روز اٹھایا۔ پلٹی۔ صفیہ سلطانہ کو نگاہ بھر کے دیکھا۔ آنکھیں چمکیں، چہرے پر جیسے سفید پاوڈر۔

"ارے ——" صفیہ کے منہ سے بیساختہ نکلا۔ "بیلا —— تم؟"

وہ فراٹے کے ساتھ چبوترے پر سے گزری اور باغ کے سنہرے دھندلکے میں غائب ہو گئی۔ تیز رفتار۔ جیسے بادِ صرصر۔ بگولہ۔ قدم رکھنے کا انداز عجیب سرسر نکل گئی۔

صفیہ ہیبت زدہ رہ گئیں۔ گھگھی بندھی۔ حلق میں کانٹے چبھے۔ لرزہ چڑھا۔ ٹھنڈے پسینے آئے۔ پنڈلیوں پر چیونٹیاں رینگیں۔ بمشکل ہمت کر کے دوبارہ پکارنا چاہا ——

"—— بیلا ——"

ان کی "اندرونی آواز" نے بہت ہی آہستہ سے جواب دیا۔ "چاندنی بیگم۔"

زرینہ، رانی دلہن اور وِکی میاں ٹونی کو پکارتے گیلری میں آچکے تھے جب دفتر میں پھر بجلی فون بجا۔ وِکی لپک کر اندر گئے اور شہلا سے بات کی۔ "ہاں۔ ہاں ابھی آئے۔ تمہاری تاریخ ہی طے کر رہے تھے بھئی۔ بس پانچ منٹ میں پہونچے۔"

دونوں بیگمات نزاکت سے پائینچے سنبھالے سیڑھیاں اتریں پیچھے پیچھے شال اور سینڈلز اٹھائے نورُن۔

نوجوان ٹونی زقند بھر کے برساتی میں کود ے ۔ کار کا دروازہ کھولا ۔ اسی پھرتی سے ان کے والدا گلی سیٹ پر ۔ مڑ کر اُچٹتی نظر ڈالی ــــ "اوہو ۔ صفیہ تو انتظار کرتے کرتے سو گئیں۔"

ٹونی نے ان کو جگانے کے لیے ہارن بجایا ۔ زرینہ نے پچھلا دروازہ کھولا ۔
"اٹھو بھئی ۔ یہ لو نئی شال ۔ تمہاری ساری کے بارڈر سے میچ کرے گی ۔ لو ۔ اور یہ منحوس چادر اتارو ۔ اللہ کی قسم کل ہی انگوری کو نہ دیدی ہو تو میرا نام بدل دینا ۔ اٹھو صفیہ ۔ ضد نہیں کرتے ۔"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔

وکی پھر مڑے ۔ "یہ شالوں کا مسئلہ اس وقت کیوں حل کیا جا رہا ہے اور دیر نہ لگاؤ بجیا ۔ چلو ٹونی ۔"

بیٹے نے انجن اسٹارٹ کیا ۔ "بیٹھئے پھوپھی جنیاں ۔ امی ۔"

"یہ جگیں تو سہی ۔ ماشاءاللہ کیا غضب کی نیند پائی ہے ۔ اٹھو بھئی ۔ ادھر سرکو تو ہم لوگ بھی بیٹھ جائیں ۔"

صفیہ اسی طرح سیٹ پر نیم دراز رہیں ۔ زرینہ نے نورُن کو بلا کر ان کے پیروں کی طرف اشارہ کیا ۔

خادمہ نے دونوں کولہاپوری آہستہ سے اتارے ۔

"پھینکو انھیں باہر ۔" بڑی بٹیا گرجیں ۔ "صبح انگوری سے کہنا کوڑے میں لیجائے ۔"

نورُن نے تعمیل حکم کی بیمنٹ کے راستے پرپٹ سے ان کے گرنے کی آواز آئی ۔ صفیہ بدستور آنکھیں موندے ساکت لیٹی رہیں ۔ گویا مادام رَی کیمیر کی تصویر جو مصور ڈیوڈ نے بنائی تھی ۔ نورُن نے ایک ہرا سینڈل ان کے دائیں پاؤں میں پہنانا چاہا ۔

اچانک دہل کر چلائی ۔

زرینہ اور رانی دلہن نے صفیہ کو جھنجھوڑا اور خوفناک چیخیں ماریں ۔

"مرنے سے کچھ دیر پہلے برزخ قائم کر دی ۔ سب نقشے سامنے آتے ۔" "سماوات میں نورانی پیکروں کے شامیانے لگے ہیں ۔" نیچے کٹھ پتلیاں چل رہی ہیں ۔ آوازیں سب میں سے نکلتی معلوم ہوتی ہیں ۔ آواز ایک ہی ہے ۔ اپنشدوں میں لکھا ہے کہ حق ــــ حقیقت ــــ واحد ہے لیکن متنوع اور کثیر الجہت ہے ۔

می لارڈ ۔ پیپل اس طور سے اُگا کہ آدھا احاطے کے اندر ہے آدھا باہر ۔ درخت کی کھوہ تین چوتھائی اندر ہے ۔ ایک چوتھائی ندی کے رُخ ۔ لہٰذا اسے احاطے کے اندر تصور کیا جائے ۔ میرے معزز دوست نے سوال کیا ہے کہ تصور اور حقیقت میں کیا فرق ہے ۔ ؟

می لارڈ انسان کا چہرہ بیک وقت دو سمت ہے ۔ ایک رُخ تا حیات دنیا میں رہتا ہے ایک تا حیات سوئے احاطہ ستارہ بیگم ۔ می لارڈ ۔

ڈاکٹروں کی رائے تھی شدید اضطراری کیفیت میں کوئی اچانک ذہنی دھکا پہنچنے کے باعث حرکت قلب بند ہوئی ۔

مرحومہ کے پرانے نیورولوجسٹ کے مطابق اندرونی "صدا" کے علاوہ ہیلوسی نیشن یعنی فریب نظر بھی ایک وجہ ہو سکتی تھی ۔

صبح کو جب جنازہ احاطہ ستارہ بیگم روانہ ہوا۔ موٹریں آہستہ آہستہ شہر کی جانب بڑھیں۔ مکان پر خواتین کا تانتا بندھا۔ مانک بائی ڈھونڈی کہ ہمیشہ کی ماہر منتظم تھیں ان کی تجویز پر مائیکروفون لگ گیا اور برساتی کے وُوڈ روز کے اوپر لاؤڈ اسپیکر۔ تاکہ گاڑیوں کے نمبر اور ڈرائیوروں کے نام اناؤنس کیے جاسکیں جیسا مسرت کی تقاریب پر ہوتا ہے۔

بوبی اپنے لڑکے کے سہارے موٹر سے اترے۔ بڑے بھائی اور بہن سے گلے مل کر خوب روئے۔

برساتی سے ملحق چبوترے پر قرآن خوانی جاری تھی۔ اندر مرحومہ کے کمرے میں چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ ان کی بہن اور بھاوج تلاوت کلام مجید کے بعد گاؤ تکیے سے لگی چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ عورتیں اپنا اپنا سیپارہ پڑھ کر چلی جاتیں۔ پچھلے برآمدے اور ڈرائنگ روم میں جا بیٹھتیں۔ چند ایک دُزدیدہ نگاہوں سے اندر کے کمروں کے فرنیچر اور سامان آرائش کا جائزہ بھی لیتی گئیں۔ رشتے دار خواتین مصروفیت سے کام کرواتی ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

ایوان نشست میں بہت ہجوم تھا۔ وہاں بھی چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں۔ بیبیاں ٹکڑیوں میں بیٹھتی جا رہی تھیں۔ کسی بات پر ہنسی آتی تو فوراً ضبط کر کے چہرے پر مناسب غمگینی طاری کر لیتیں۔

سرگوشیاں — "زندگی میں بھی پروبلم رہیں مر کے بھی۔ تین بیاہ ملتوی۔"

"شہلا کے منگیتر کیا دولہا جو ہیں؟ سر سفید۔ آتے کے ساتھ ہی جنازے کو کندھا دینا پڑا۔ اچھا شگون نہیں۔"

"بس اب چپ رہو باجی۔"

"بنگالن بہو نظر نہیں آئیں۔"

"کلکتہ میں بیٹھی ہیں۔ اسے بہو نہ کہو ابھی سے۔"

"چھ مہینے سے تو لڑکے کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔"

"یہ تم پیلی ساری پہن کر کیوں آ گئیں؟"

"سفید رنگ ساس پہننے ہی نہیں دیتیں۔ ایک ساری بالکل وائٹ ہے تو وہ جارجٹ کی۔ ونٹر ساری ایک بھی نہیں۔"

"انسان کے پاس ایسے موقعوں کے لیے مناسب لباس ہونا چاہیئے۔"

"میں نے تو زرینہ سلطانہ سے بہت کہا تھا کہ اپنے ہاں بھی زنانہ اجتماع کروالیں۔ حمیدہ بیگم شکاگو کے سنٹر سے آئی ہوئی ہیں اپنے گھر۔ اپنے لڑکے کی نسبت طے کرنے۔ ان کا وعظ رکھ لیں۔ زرینہ ٹال گئیں۔ کیا یہ لوگ آدھے شیعہ ہیں؟"

"نہ کہیں۔"

"لڑکے نے جھانکڑ والی مسجد شہید کروا دی۔"

"نہ کہیں۔"

"سنا تو یہی ہے۔"

"آج کل تو بمبے میں سائرہ بانو اور روبینا لمبی آستین کے بلاوز پہنے گھر گھر تبلیغ کرتی پھر رہی ہیں۔"

"سچ کہو۔"

"ہلو جی۔ نمستے جی۔ کیسی ہیں آپ شدھا دیدی؟"

"ہلو۔ نمسکار سو مبشوری جی۔ صفیہ باجی کے گزرنے کی خبر آپ نے کس وقت سنی؟ ہم تو باتھ روم میں تھے جب سریش کے ڈیڈی نے آواز دی۔ ہم تو سُن کر ایسے بھونچکے ہوئے کہ صابن پر پھسلتے پھسلتے بچے — ارے صفیہ باجی سے پرسوں سویرے ہی تو فون پر بات ہوئی تھی۔"

"کڑوی روٹی تو سُنا ہے شیریں کاسل سے آئے گی۔ شام کے لیے میں بھجوادوں گی مگر آج ہی گیس ختم ہو گیا۔"

"ایک ہی سلنڈر ہے؟"

"تین۔ لیکن مہمان داری بھی تو ماشاء اللہ سے ہمارے کے ہاں بہت رہتی ہے۔ امی کے گھر سے پکوا کر لے آؤں گی۔"

"ارے ان کے ہاں تو جانے کہاں کہاں سے آوے گا کھانا۔"

"شکرقندی کی کھیر بھی پکوادوں؟ موسم کی چیز ہے۔"

"ان کے ہاں تو ڈھیروں کھانا ——"

"پانچ منسٹر تو میں نے اب تلک گنے۔ سب کو بیچاری شہلا نے ریسیو کیا۔ مرد اب تک لوٹے ہی نہیں قبرستان سے۔"

"سب چلی آرہی ہیں پر شبّو باجی کو نہ دیکھا۔"

"زرینہ سلطانہ بھی تو ان کی ماں کے مرنے میں نہیں گئی تھیں۔"

"حشمت محل والیاں آگئیں۔"

"بہت جلدی آئیں۔"

"ٹھسّے۔"

دفعتاً شور مچا۔ کراچی کال لگ گئی۔ کراچی کال لگ گئی۔

"ارے ہاں پروین نامراد بہن کے تیجے ہی میں شریک ہولیں۔"

پھر بھنبھناہٹ پھیلی —— پروین کل شام تک پہونچ جائیں گی۔

"فیروزہ بھی آرہی ہیں؟ اے سوناکلی —— فیروزہ بھی آرہی ہیں؟"

"معلوم نہیں بیگم صاحب۔"

تیسرا بلیٹن نشر ہوا۔ فیروزہ لندن میں ہیں۔

کچھ بیبیاں جو ٹرنک کال لگنے کی خبر سنتے ہی گیلری میں پہونچ گئی تھیں کہ شہلا اور پروین کی المناک ڈرامائی گفتگو کا منظر بچشم خود ملاحظہ کرلیں۔ وہ چُپ چاپ لوٹ آئیں کیونکہ نورن نے شہلا کے چیمبر کا دروازہ اندر سے فوراً بند کرلیا۔ چند لڑکیاں دوسرے کمرے میں نکّی کے ٹیلی فون کے پاس موجود رہیں۔ کس واسطے کہ دنیا امید پہ قائم ہے۔ ممکن ہے کہ بنگالن سے ان کی نسبت ٹوٹ جائے۔ خیر جس کی قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہوگا۔ ایک لڑکی نے بہر حال خود کو نکّی مرزا کی تمام ہنگامی کالز ریسیو کرنے پر مامور کرلیا۔ باقی ایوان نشست میں اپنی ماؤں کے پاس واپس گئیں۔ یا ایک کھڑکی میں جا کھڑی ہوئیں۔

"ارے ارے وہ دیکھو۔ ایلا دیوی اور اسلم خاں۔"

"پتہ ہے۔ وہ مدراس سے پکچر ختم کرکے آئی ہے۔ اسلم خاں بمبئی سے پہونچا۔ دلکشا میں شوٹنگ چل رہی ہے۔ بیگم کے ہیرے۔"

"کمال ہے یہ بھی تعزیت کے لیے آگئے۔"

"میں بتلاؤں کیسے آئے؟ شہلا باجی کے فیانسے جو ہیں نا۔ شاہ صاحب۔ وہ بیگم کے ہیرے کے لیے گھوڑے سپلائی کر رہے ہیں۔ چلو چپکے سے باہر چل کر دیکھ آئیں۔ قریب سے۔"

"لڑکیو۔ ہڑدنگا پن نہ کرو۔ نچلی بیٹھو۔ خاموش۔"

تلاوت او وستا میں مشغول مانک بائی ڈرائنگ روم کے عقبی دریچے میں فروکش تھیں کبھی کبھی سر اٹھا کر زنانِ سوگوار کو دیکھ لیتیں۔ کوئی زیر لب مکالمہ کان میں پڑتا تو تکدر کے ساتھ پھر مقدس صحیفے پر جھک جاتیں۔ لیموں کے پتوں کی مہک دریچے میں رچی ہوئی تھی —— ایک قدیم پاکڑ میں چھپے کسی پرند نے سیٹی بجائی۔

اشیم وہُو وہشتاں استی — اُستاہستی — آستا ہمائے — یاہ اینشائے وہشتائے اشیم — توپاک پروردگار ہے — توپاک — شوہر کی موت یاد آرہی تھی۔ اور ساس شیریں بائی اور نند روڈابائی — موت کے بعد پہلی صبح پائے دشت۔ ہر شام — سروش نو یاترو — فرشتے کے لیے دعائیں —

سوئم کے دن رواں روآتی بڑی تکلیف میں ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زمینی قیود سے آزاد ہو کر چینوٹ کے پُل پر پہنچی ہے —

—— کل بے چاری صفیہ کا تیجا ہے۔ سویرے سے آنا ہوگا۔ جینے کے بھی کتنے انتظام —— مرنے کے بھی —— او پیارے خُدا ——

زیرلب اوراد کرتی ہوئی اٹھیں۔

بشیر پیئر حسب وعدہ علی الصبح "سینٹ مُوتی" کا نیا بورڈ حوض کی منڈیر سے ٹکا کر اسی مستعدی سے سر پر رومال باندھ، جنازے کے ساتھ ہو لیے۔ ہری دُوب پر "سینٹ صوفیہ" کی غیر مسلم استانیاں گھبرائے سرنگوں بیٹھی تھیں۔ اسکول اب کون چلائے گا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی بہتات اور بے روزگاری کے اس دور میں ان کی روزی روٹی کا دروازہ بند ہوا۔

سورج سر پہ آگیا۔ ایک نوجوان ٹیچر نے ہلکی سی الجھن کے ساتھ نظر بچا کر گھڑی دیکھی۔

"انتم سنسکار میں دیر تو لگتی ہے۔" دوسری نے دھیرے سے گویا جواب دیا۔

درختوں کے پرے بہتی رو پہلی ندی دھوپ میں جگمگا اٹھی۔

ندی کا اندرونی کلاک اس کا اپنا ہے اور اس کا کال چکر۔ دیر سویر کی اسے کیا پرواہ۔ مسز ترلا جوشی نے گھاس کا ایک ڈنٹھل توڑا۔ وہ ازبلا تھوبرن میں صفیہ کی ہم جماعت رہ چکی تھیں اور اسکول کی سب سے پرانی استانی تھیں۔ اور جب وہ کالج میں پڑھتی تھیں اور کبھی کبھار یہاں آتی تھیں، اسی لان پر وہ صفیہ کو مخاطب کر کے بسلسلہ قنبر علی بڑی خوشدلی سے نیچے سُروں میں دھیرے بھوندیا —— مورے سیّاں جی رہتے ہیں پار —— الاپتی تھیں۔ دھیرے بہو —— ہم اُترا با پار ——

اُتر گئیں بھئی۔

کسی کو ان کی موت کا گہرا دکھ نہیں۔ ایک پر کار کی ہمدردی سی ہے اور افسوس۔ سب دل میں اور زبان سے ایک ہی شبد دھرا رہے ہیں —— "بے چاری ——" جیسے کوئی امتحان میں فیل ہو جائے یا پبلک سروس کے کمپیٹیشن میں نہ آسکے۔

اگر وہ پبلک لائف میں ہوتیں تو مہلا ہونے کے ناتے لوگ پہلے ہی ان کو نوچ کر کھا چکے ہوتے۔ اب رسمی افسوس کے لیکھ لکھتے۔

وہ کوّے ہیں۔ نیولے۔ گِدھ۔ گرگٹ۔ مگرمچھ۔ شارک۔ وہ دوسروں کے متعلق اتنے بے رحم ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

—— صفیہ تم بھی تو کسی کو نہیں بخشتیں۔

—— وہ اسی لائق ہیں۔

وہ تو ایسے لوگوں کو بھی جو کسی کو کچھ نہیں کہتے، انھیں بھی کو نچے ڈالتے ہیں

خواہ مخواہ صفیہ بے چاری تو بہت زیادہ من موہنی بھی نہیں تھیں۔ ارے میں بھی انھیں "بے چاری" سوچ رہی ہوں۔ کیا بے چارہ پن تھا؟ اپنے سبھاؤ اور سنسکاروں کے انوسار اچھا خاصا جیون بتایا۔

چار یا پانچ مسلمان استانیاں قرآن خوانی کے بعد باہر آکر گھیرے میں شامل ہوگئیں۔

"اللہ جنت نصیب کرے۔ تین مہینے کی میری تنخواہ روک رکھی تھی۔"
"آپ تین مہینے بغیر اطلاع غیر حاضر بھی تو رہیں۔"
"اب حساب کتاب کون کرے گا؟ پنکی میاں یا شہلا ——؟"
"ارے کوثر باجی ابھی سے یہ قصہ نہ چھیڑیے۔"
"شمیم فاطمہ۔ جو میری ذمہ داریاں ہیں اور اخراجات ——"

ترلا جوشی لوگوں کی آمد و رفت دیکھا کیں۔ ہمیشہ ایک جملہ یہ بھی دہرایا جاتا ہے —— میرے لائق کوئی کام —— ؟ ہر چیز روٹین ہے۔ زندہ رہنا۔ مرجانا۔ انتم سنسکار۔ کتنی بھاری روٹین۔ کال کے نوٹس بورڈ پر چپکا ٹائم ٹیبل۔

بتاشے کی قیادت میں کئی ملازم دوسری منزل سے اسکول کی کرسیاں اتار کر لاتے دکھلائی دیے۔ سونا کلی ان کی نگرانی کرتی پاس سے گزریں۔ ایک استانی نے فوراً اٹھ کر کہا۔ "آپا جی۔ میرے لائق کوئی کام ——؟"
دوپہر کا باغ دفعتاً جوہری کی دوکان بن گیا۔ سونا ہی سونا۔ زمرد ہی زمرد۔ لعل ہی لعل۔ رنگ برنگے نگینے۔
پیڑوں پر بیٹھے مور اور طوطے میناکاری کے نقوش۔ فرنیچر اٹھائے نوکر

اس نفیس و نازک صناعی میں خلل ڈال رہے تھے۔
سونا کلی نے جواب دیا: "ارے بیٹا۔ کوئی ایک کام ہو تو بتاویں۔ پہلے بڑی بٹیا کہن قل کے لیے مردانہ اوپر ہو جیہے۔ اسکول کے سارے کمرے خالی کروا دو۔ ہم کرسیاں ڈیسک سب نکلوا دیہن۔ اب کہن وہم آتا ہے۔ پہلے وہاں تیجا ہوا اور کچھ دن بعد اللہ رکھے پنکی میاں اور لیلےٰ بیگم وہیں آن کر بسیں۔ کہن۔ کرسیاں نیچے رکھوا دو۔ سوئم کے لیے شامیانہ لگ جیہے —— پھر کہن اسکول کا سامان اوپر واپس نہ پہونچا نا یہیں سے نخاس چلا جیہے۔"

سونا کلی آگے گئیں۔ استانیوں نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ چنانچہ سینٹ صوفیہ بند —— دوسری منزل پر اب نیا جوڑا اپنا گھر بسائے گا۔
ترنت فیصلے۔ آدمی کے پاس سمے بہت کم ہے۔ فیصلوں میں دیر لگائیں تو کیسے کام چلے۔ سوچ میں ڈوبی ترلا جوشی سر جھکائے اپنے پاؤں ہی کو دیکھتی رہیں۔ بارش کی پھوار آگئی۔

"توبہ۔ مہاوٹیں بھی آج ہی —— یہ بھی اکثر ہوتا ہے۔ ادھر قبر کھدی اور فوراً پانی کیچڑ۔ توبہ ——"
"ایسے موقع پر بارش تو اللہ کی رحمت ہے کوثر باجی۔" شمیم فاطمہ ہمیشہ معاملات کا اچھا رخ دیکھنا چاہتی تھیں۔
وہ سب ہڑبڑا کے اٹھیں اور سر ڈھانپ کر برآمدے کی سمت بھاگیں۔ بادل آیا اور نکل گیا۔

جاڑوں کا بوند سا دن۔ سورج ڈھلا۔ تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ زرد پتے خوب اڑے۔ ڈرائیور لوگ دن بھر ادھر ادھر بیٹھے ہاتھوں میں چھپا کر

سگریٹ بیڑی پھونکتے رہے تھے۔ رام پیاری مالن باغ کی صفائی پر
کمربستہ ہوئی۔ سینٹ موٹی کا بورڈ اٹھا کر اس کے پیچھے سے چار مینار کی خالی
ڈبیاں نکالیں۔ خوش قدم بوا اندر جا رہی تھیں۔ رک گئیں۔ سب جنے ابھی
تلک آئے نہیں ——؟ انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔ گویا وہ سب کرکٹ کے
میدان سے لوٹنے والے تھے۔ خوش قدم بوا بڑھاپے کی وجہ سے خاصی
سنک گئی تھیں۔

وہ واپس آنے شروع ہوتے۔ بہت آہستہ رفتار سے گئے تھے
تیزی سے لوٹے۔ بہت سوں کو بھوک بھی ستا رہی تھی اور چائے اور سگریٹ
کی طلب۔ اب اپنے اپنے گھر جا کر نہائیں گے اور گرما گرم چائے کافی۔
"مانیں نہ مانیں سب کے دلوں میں ایک ہی خیال ہوت ہے ——
ہمیشہ" خوش قدم بوا حوض کے منڈیر پر ٹِک کر بڑبڑائیں —— "ایک ہی
خیال —— انجانا —— یہ میرا جنازہ نہیں تھا۔ میں زندہ ہوں۔ شکرانہ
اور اطمینان —— انجانا ——"
رام پیاری اکڑوں بیٹھ گئی۔ ڈبیاں کھول کر دیکھیں۔ ایک دو سگریٹ پڑے
ہوں تو مالی کے لیے لے جائے۔ وہ سوئم کی دیگوں کے چولہے تیار کرنے
میں مصروف تھا۔
رینکی اور ارشد حسین سامنے سے گزرے۔ فوراً اٹھی۔ گھونگھٹ کاڑھا۔

چھالیٹن کے سفید غرارے سرسراتی حشمت محل کی دو خانہ زاد بوڑھی
حبشنیں باہر آئیں۔ ایک شوفر فوراً گاڑی لیکر برساتی میں پہنچا۔ کھڑکیوں کے
نیلے پردے برابر کیے۔
نیگرو عورتیں ایک محراب کے نیچے سنتریوں کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ ان کی

آنکھیں دنیا کے قدیم ترین انسان کی آنکھیں تھیں۔ اور انہوں نے بیحد وحساب
خاتموں کا نظارہ کیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی۔ بیچاری نیم اپاہج صفیہ سلطان
کی کیا ہستی تھی۔ ان قدیم آنکھوں نے سارا افریقہ اجڑتے دیکھا۔ وہ جہازوں
میں بھر بھر کر مشرق و مغرب میں بھیجی گئیں۔ قدرت نے انہیں محض خوش آوازی دی
تھی۔ اور سخت جانی۔
حبشنوں کی پلٹنیں کہاں کہاں کن محلات پر تعینات رہیں۔ قلعہ معلیٰ۔
دلی۔ نوابی اور شاہی کا لکھنؤ۔ آصف جاہی حیدر آباد۔
زمرد اور الماس۔ شہر کی آخری حبشن محلدارنیاں۔ بیگم کوٹھی پر متعین ان کی
اردو بیگنی پردادیوں نے تو ۱۸۵۸ء ہی میں ہتھیار ڈال دیے تھے۔
اور یوں دیکھو تو سینکڑوں ہزاروں برس کے ہیر پھیر میں اجتماعی خاتمے کی
بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ان کے لیے صرف ایک لفظ استعمال ہوتا
ہے —— "تھے"
اور انفرادی خاتمے کی اہمیت تو تیسرے روز ہی سے زائل ہو جاتی ہے
اس کے لیے بھی بس ایک ہی لفظ —— "تھے" —— یا "تھیں"
محض غم حسین باقی اور قائم و دائم ہے۔
—— کہ ہائے ہائے رے ہائے —— کہائے میاں رے ——
بی بی صغرا روئے لاگیں مورا قاسم دولہا مارا کہ ہائے ہائے رے ہائے

حشمت محل کی بیگمات برآمد ہوئیں۔ زرینہ سلطان ان کے ساتھ تھیں۔
سیاہ فام کنیزوں نے نیچے جا کر کار کا دروازہ کھولا۔
زرینہ کو یاد آیا۔ نویں تاریخ کو صفیہ مرحومہ ان کے ساتھ حشمت محل جاتی
تھیں اور زمرد، الماس اور دوسری حبشنوں کے جوڑ دائرے کا ماتم اور نوحہ خوانی
کرتے وہ بڑی محویت کے عالم میں سنتی تھیں —— کہ ہائے ہائے رے ہائے۔

— کہ ہائے میاں رے —

"ان جیشنوں کے بین —" ایک بار صفیہ نے کہا تھا — "دشت و دریا پر گونجتے ہیں —"

ہائے میری دکھیاری بہن — زرینہ سلطان نے سفید دوپٹے میں آنسو جذب کیے۔ جیشنوں نے جھک کر تسلیم عرض کی۔ گاڑی روانہ ہوئی۔

بھیڑ چھٹ گئی۔ اب انگوری جھاڑو سنبھالے جھکی جھکی برساتی میں وارد ہوئی۔ نورن برآمدے میں چپ چاپ کھڑی تھیں۔ ڈائننگ روم میں چائے کی پیالیاں کھنکیں۔ پھر خاموشی۔

جمعدارنی نے حسب عادت دوپٹہ کمر کے گرد لپیٹا۔ جاروب کشی شروع کر دی۔ سر سر سر سر۔

وہ کولہاپوری واٹڈرنگ جیو کی پھیلتی بیل کے نیچے اوندھے پڑے تھے۔ ایک کے تلے پر یہ موٹی چھپکلی۔

"دھت۔ دھت۔ بری بری۔" انگوری نے باؤلے پن سے اس پر جھاڑو ماری۔ وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گئی۔

"ارے واہ ری پھوہتن —!" نورن ہنسیں۔

انگوری نے چپل اٹھاتے۔ غور سے دیکھا کیونکہ سجھائی کم دیتا تھا۔

"بٹیا کے ہیں گے۔" میلے دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔

نورن سیڑھی اتر کر نیچے آئیں۔ وہ بھی چند لمحوں تک ان چپلوں کو ٹکٹکی باندھے تکا کیں۔ پھر دھیرے سے بولیں "جمعدارن پھینکو نہیں۔ گھر لے جاؤ۔ دھو کر کونے میں ڈال دینا"

ایک کاغذ ہوا میں ڈولتا پھر رہا تھا۔ مہترانی نے اسے پکڑا۔

چپل پسیٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

اچانک نورن کو بڑی بٹیا کے الفاظ یاد آئے — "کل ہی منحوس چادر انگوری کو نہ دیدی ہو تو میرا نام بدل دینا —"

نورن بھی چند سکنڈ کے لیے عالم حیرت میں جا پہنچیں۔ پھر کہا "بیٹا کا عنابی دوشالہ بھی تم ہی کا ملیہے"

کم عقل انگوری چپ رہی۔ سوچا اس اطلاع پر خوشی کا اظہار کرے یا غم کا۔ بڑے راجہ صاحب کے مرنے پر جب جائیداد بٹی تو کوئی رونا پیٹنا تو یہاں ہوا نہیں تھا۔ سب خوش ہی دکھلائی دیتے تھے۔

انگوری کے سکوت کو نورن نے مایوسی تصور کیا۔ بٹیا کے کپڑوں سے بھی الماریاں بھری پڑی ہیں۔ پتہ نہیں یتیم خانے میں بھیجیں گے کیا کریں گے۔

"سچا تلّا ہے پرانے زمانے کا۔ لیٹا حریسا تو ہو گئی ہو پر اوڑھے پھرنا"

اس وفادار مہترانی اور اس کے آخورچی کنبے کو ساری عمر تین کٹوری ہاؤس سے رقم رقم کی اترنیں اور ناکارہ پاپوش ملا کیے تھے اور خوشی کی تقریبوں پر نئے جوڑے۔ اسے فوراً خیال آیا۔ ابھی تین تین بیاہ ہونے والے ہیں نئے کپڑے لتے بھی تو بہت ملیں گے۔ جھاڑو دیتے دیتے رک گئی —

سندھو کے کنارے — پار والے بیرسٹر اطہر علی مرحوم کے متنازعہ فیہ ریڈرز ان میدان میں لاؤڈ اسپیکر پر مراٹھی سی دھن کا ایک پرانا پُر جلال بھجن ہو رہا تھا — ہے گووند راکھو شرن — اب تو جیون ہارے — اب تو جیون —

نورن بھی چونکیں — "بٹیا کی خبر قنبر میاں کی زمین پر پہنچ گئی —"

"قنبر میاں کی زمین کہ بیلے بٹیا کی؟" انگوری نے ناک پر انگلی رکھ کر تصحیح کی۔

"اور لیلے بیٹا کی —— تو سمجھو ہمرے پنکی بھیا کی ——" انگوری ملکیت کے معاملات کا خیال آتے ہی دفعتاً بڑی عقلمند ہو گئی تھی۔

"اللہ کی شان۔ کس کی چیز —— کس کو پہونچی ——" نورن پھر اچنبھے میں پڑیں۔ چند لمحوں کے بعد کہا —— "کبھی رات کو گھوسی لوگ وہاں خاتونِ جنتی والا برہا گاتے ہیں۔ تب بھی آواز یہاں بڑی صاف سنائی دیتی ہے۔"

کالی ندی۔ اور جھاؤ ندی جس کے کنارے چاندنی راتوں میں سُننے والوں کو بانسری کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ اور گومتی — تو سامنے ہی بہہ رہی ہے۔ ہر ہر بہیں گومتی مائے۔

"آج وہاں مہادیو گڑھی کا میلہ ہوتیہے۔ قنبر بھیا والے مندر میں۔"
"قنبر بھیا کا مندر؟" نوُرن دوبارہ گڑبڑائیں۔

"اے نوُرن بیٹا۔ بسنت آنے والی ہے اب کے۔ ہے ہماری بہو کے لیے ایک دو دوپٹے رنگ دینا جاڑے تو سمجھو نکل گئے۔" انگوری نے بایاں ہاتھ پیچھے کمر پر اُلٹا دھرا اور صفائی میں مشغول ہو گئی۔ سَر سَر سَر سَر ——

دفعتاً بڑا بھاری سناٹا چھایا۔ نوُرن نے اپنی نیپالی شال کا بکل مارا۔ ستون سے ٹیک لگا کر چہرہ ہاتھوں میں تھامے یہ سرسراہٹ دھیان سے سنتی رہیں۔ کچھ دیر بعد سر نہوڑائے، سپڑ سپڑ سلیپر گھسیٹتی شاگرد پیشے کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں علاوہ "رانا صاحب" کے جو ایک مرکّب کیریکٹر ہیں۔
وکٹوریہ میموریل مع فرنگی آقا، رانی بادشاہ بیگم، آلِ ٹیپو، اور "ٹام صاحب" (طامس ایزلی، حقیقی) اور کہانی میں برسبیل تذکرہ شامل ہیں۔
ہریندر ناتھ چٹوپادھیا سروجنی نائیڈو کے بھائی ہیں۔
رانا کے متعلق مصنفہ کو علم نہیں کہ وہ اصلی ہے یا خیالی۔

اس ناول کے تمام کردار قطعی فرضی ہیں علاوہ "رانا صاحب" کے جو ایک مرکب کیریکٹر ہیں۔
وکٹوریہ میموریل مع فرنگی آقا، رانی بادشاہ بیگم، آلِ ٹیپو، اور "ٹام صاحب" (طامس ایزلی) حقیقی، اور کہانی میں برسبیل تذکرہ شامل ہیں۔
ہریندرناتھ چٹوپادھیا سروجنی نائیڈو کے بھائی ہیں۔ رانا کے متعلق مصنف کو علم نہیں کہ وہ اصلی ہے یا خیالی۔